زندہ اور متحرک ادب کا ترجمان

اُردو سہ ماہی

ثـالـث

کتابی سلسلہ.....۳

جلد- ۱ شمارہ -۳

اپریل ۲۰۱۴ء تا جون ۲۰۱۴ء

مدیر اعزازی اقبال حسن آزاد

مدیر ثالث آفاق صالح

تزئین کار : اعجاز رحمانی

رابطہ: : شاہ کالونی، شاہ زبیر روڈ، مونگیر۔۸۱۱۲۰۱

Mob.+91 9430667003

email.eqbalhasan35@yahoo.com

www.salismagazine.in

● پرنٹر، پبلیشر، پروپرائٹر ایڈیٹر ثالث آفاق صالح نے تاج آفسیٹ پریس سبزی باغ پٹنہ ۸۰۰۰۰۴ سے چھپوا کر شاہ کالونی شاہ زبیر روڈ مونگیر ۸۱۱۲۰۱ سے شائع کیا۔

● 'ثالث' کے مشمولات سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

قیمت۔فی شمارہ : .....۱۰۰روپے (رجسٹرڈ ڈاک سے ۱۲۵/روپے)

سالانہ : .....۴۰۰روپے (رجسٹرڈ ڈاک سے ۵۰۰/روپئے)

خصوصی تعاون : .....دس ہزار روپئے یا ۲۰۰/امریکی ڈالر

'ثالث' غیر ممالک میں

'ثالث' کی خریداری کی سہولت کے لئے ہم مختلف ممالک میں زرتعاون کی ذیل میں صراحت کر رہے ہیں۔

امریکہ	:	پچاس (۵۰) امریکی ڈالر
کناڈا	:	ساٹھ (۶۰) کناڈا ڈالر
آسٹریلیا	:	پینتس (۳۵) امریکی ڈالر
برطانیہ	:	پینتش (۳۵) برطانوی پاؤنڈ
یو۔اے۔ای	:	ایک سو (۱۰۰) یو۔اے۔ای درہم
عمان	:	دس (۱۰) عمانی ریال
سعودی عرب	:	ایک سو (۱۰۰) ریال
قطر:	:	ایک سو (۱۰۰) ریال
کویت	:	بیس (۲۰) کویتی دینار
پاکستان	:	دو ہزار (۲۰۰۰) پاکستانی روپے

جن ممالک میں Western Union کی سہولت ہے وہاں سے مدیر اعلیٰ کے پتہ پر رقم بھیجی جاسکتی ہے۔
TMCN اور دیگر تفصیلات درج ذیل ای۔میل پتہ پر بھیجی جاسکتی ہیں۔

eqbalhasan35@yahoo.com

سالانہ ممبر شپ کے لئے ہندوستان کے کسی بھی نیشنلائزڈ بینک کے کسی بھی برانچ کے ذریعے درج ذیل اکاؤنٹ میں رقم بھیجی جاسکتی ہے۔

Eqbal Hasan Azad
Union Bank of India
Munger Branch
A/c No. 389002010003800
IFSC Code-UBIN0538906

◀◀ ● ▶▶

فہرست

	اداریہ	اداره	۵
	مہمان اداریہ	پیغام آفاقی	۷
	حمد	علیم صبا نویدی	۱۶
	نعت پاک	علیم صبا نویدی	۱۷
مقالات	شاد عارفی: ایک منفرد فنکار	پروفیسر مظفر حنفی	۱۸
	اقبال اور گوئٹے: چند قربتیں	ڈاکٹر پیر نصیر احمد	۲۶
	آج کا اردو افسانہ	محمد نعیم بیگ	۳۴
	منٹو تعبیر اور نام نہاد ترقی پسندی	اکرم پرویز	۳۸
	انسانیت کی ترفیع و تمجید کا شاعر: فہیم	عبدالوہاب قاسمی	۴۵
یاد رفتگاں	اردو تنقید کی بازیافت: وارث علوی	احمد سہیل	۵۲
	حد کر دی آپ نے: شہریار	ڈاکٹر نسترن احسن فتیحی	۵۸
افسانے	یونین کاؤنسل	محمد حامد سراج	۶۲
	الہٰ دین کی چار پائی	علی اکبر ناطق	۶۷
	ابو پاری	ڈاکٹر نگہت نسیم	۸۰
	کہنی کی چوٹ	دلشاد نسیم	۸۶
	مامتا	وحید احمد قمر	۹۳
	نرتکی	شاہین کاظمی	۱۰۱
	سانپ	نورالعین ساحرہ	۱۰۷
	ناٹکا	عمر احمد بنگش	۱۱۳
	یاجوج ماجوج	ڈاکٹر افشاں ملک	۱۱۸
	کینچوا	سبین علی	۱۲۱
	طاہرہ سنو.....!	سیمیں کرن	۱۲۵
	ذائقہ	علی مرزا	۱۳۰

انشائیہ	شاعر لشکر	محمد نعیم دیپالپور	۱۳۲
علی گڑھ او علی گڑھ	میلا	انجم قدوائی	۱۴۱
	ایک خط، علی گڑھ سے	ڈاکٹر فریحہ سبین	۱۴۴
ڈائری کا ایک ورق	بدلہ	ظفر عالم	۱۴۸
غزلیں	عرفان ستار، ذوالفقار نقوی، سلیم انصاری، اقبال حسن آزاد، اصغر شمیم، پرویز ساحر، اصغر علی بلوچ، توقیر عباس، عمر فرحت، کامران غنی صبا، نثار احمد نثار		۱۴۹ تا ۱۵۹
نظمیں	ستیہ پال آنند، یوسف عزیز زاہد، جمیل الرحمٰن، خالد ندیم شانی		۱۶۰ تا ۱۷۱
ہندی کویتائیں	کیتکی بھارتیہ/ترجمہ: اقبال حسن آزاد		۱۷۱
گوشہ لطف الرحمن	کوائف	ادارہ	۱۷۲
	مختصر حالات	لطف الرحمٰن	۱۷۴
	تازگی برگِ نوا کا فکری و معنوی تناظر	ڈاکٹر منظر اعجاز	۱۷۶
	ڈاکٹر ستیہ پال آنند کی ایک نظم کی عملی تنقید	لطف الرحمٰن	۱۸۲
ناول کا ایک باب	زہرا کیلے موسم کا	لطف الرحمٰن	۱۸۸
	غزلیں بخط شاعر	لطف الرحمٰن	۱۹۸
غزلیں	غزلیں	لطف الرحمٰن	۲۰۰
ثالث پر تبصرہ	رسالۂ ثالث۔۲، تخلیقی دھڑکنوں کی خوشبو	عبدالوہاب قاسمی	۲۰۵
تبصرہ	اردو لسانیات/علی رفاد فتیحی	محمد نہال الدین	۲۰۹
مکتوبات	ستیہ پال آنند، محمد حامد سراج، شفیق احمد شفیق، ڈاکٹر ایس ایم معین الدین قریشی، یونس خان، ڈاکٹر نگہت نسیم، صبا اکرام، مظفر حنفی، عبدالصمد، نوشی قیصر، نیاز اختر، سلیم انصاری، نوشابہ خاتون، محمد شفیع الرحمان شفیع		۲۱۲ تا ۲۲۱
وفیات	گیبریل گارسیا مارکیز، خوشونت سنگھ، علی امام نقوی، صغریٰ مہدی، سید شکیل دسنوی، عبید قمر		۲۲۲

◂◂ ● ▸▸

اداریہ

آج کل یونورسیٹیوں، کالجوں اور لائبریریوں میں تواتر کے ساتھ ادبی سیمینار منعقد کئے جاتے ہیں جن میں شرکاء علمی وادبی موضوعات پر بحث مباحثہ کرتے ہیں۔ یہ ایک بہت ہی اچھا قدم ہے۔ اس کے لئے کئی سرکاری ادارے مالی معاونت بھی کرتے ہیں۔ اس طرح تنقید وتحقیق کی نئی نئی راہیں کھلتی ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ کسی علمی ادارے/شعبہ کا سربراہ کوئی ایک عنوان منتخب کرکے اس پر اپنا پروپوزل کسی سرکاری ادارے کو بھیج دیتا ہے۔ وہاں سے منظوری حاصل ہونے کے بعد وہ دانشوروں اور ریسرچ اسکالرس کو سیمینار میں شریک ہونے کی دعوت دیتا ہے۔ اوران کی آسانی کے لئے کئی ذیلی عنوانات بھی تجویز کرتا ہے۔ اس طرح کئی نئے مقالے معرض وجود میں آجاتے ہیں جن سے طلباء اور دیگر افراد مستفید ہوتے ہیں۔ اس قسم کے سیمینار کی سب سے بڑی خوبی یہ ہوتی ہے کہ ان میں عوامی مشاعروں کی طرح جاہلوں کی بھیڑ جمع نہیں ہوتی بلکہ صرف وہی افراد اس میں شامل ہوتے ہیں جنہیں زبان وادب سے لگاؤ ہوتا ہے۔ لیکن ان سیمیناروں میں چند اصلاحات کی بھی ضرورت ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ کئی مقالہ نگار وقت معینہ کا خیال نہیں رکھتے اور طویل سے طویل تر مقالے تیار کر کے لے آتے ہیں اور جب وہ اسے پڑھنا شروع کرتے ہیں تو تھوڑی ہی دیر بعد سامعین کے چہروں سے بیزاری ٹپکنے لگتی ہے۔ منتظمین کو بار بار گھنٹی بجانی پڑتی ہے اور بدقت تمام مقرر کو اس کی جگہ پر واپس بھیجا جاتا ہے۔ اس کا ایک سائیڈ ایفیکٹ یہ بھی ہوتا ہے کہ بعد میں آنے والے مقالہ نگاروں کو اپنی بات کہنے کے لئے پورا وقت نہیں مل پاتا۔ دوسری بات یہ کہ چند ریسرچ اسکالرز بجائے خود سے کچھ لکھنے کے مختلف مضامین کے کترن سے اپنا مضمون تیار کر لیتے ہیں۔ اور چونکہ سیمینار کسی ایک ہی موضوع پر ہو رہا ہوتا ہے لہذا کئی اقتباسات/اشعار بار بار دہرائے جاتے ہیں جس سے ایک مضحکہ خیز صورت حال پیدا ہو جاتی ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ علمی اداروں کے سربراہ اس کی بہتری کی جانب توجہ دیں گے۔

☆☆☆

مولانا حالی بہت قبل فرما چکے ہیں:

دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا

مگر اردو کے زیادہ تر ادیب اور شاعر ابھی بھی پرانے زمانے میں جی رہے ہیں۔ وہ کمپیوٹر کے استعمال سے واقف ہیں نہ انٹرنیٹ کے۔ ان کا طریقۂ کار ابھی بھی بیسویں صدی والا ہے۔ یعنی وہ ابھی تک قلم اور کاغذ کا ہی استعمال کر رہے ہیں۔ افسانے لکھتے ہیں، مضامین تحریر کرتے ہیں، غزلیں اور نظمیں تخلیق کرتے ہیں۔ اسے صفحۂ قرطاس پر اُتارتے ہیں۔ پھر اس کو صاف کرتے ہیں۔ اس کے بعد لفافے میں ڈال کر سپرد ڈاک کر دیتے ہیں۔ کبھی کبھی گم ہو جانے کی صورت میں یہ لفافہ سپرد خاک بھی ہو جاتا ہے۔ اور اگر خوبیٔ قسمت سے وہ چیز رسالے کے مدیر کے پاس پہنچ بھی گئی تو مدیر کو اس کی کتابت/کمپوزنگ اور پروف ریڈنگ کے صبر آزما مرحلوں سے گذرنا پڑتا ہے۔ لہذا سارے کام دیر سے انجام پاتے ہیں۔ اگر ہم اردو والے زندگی کی دوڑ میں پچھڑ رہے ہیں تو اس میں خود ہماری غفلت اور کوتاہی کا دخل ہے۔ اب جبکہ اردو ان پیج کی سہولت ہمارے پاس موجود ہے تو کیوں نہ ہم اس سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کریں۔ اور زمانے کے شانہ بشانہ چلنے کی کوشش کریں۔ (ادارہ)

◂◂ ● ▸▸

پرانے زمانے کے ایک استاد صاحب بڑی ثقیل قسم کی اردو بولا کرتے تھے اور ان کی اپنے شاگردوں کو بھی نصیحت تھی کہ جب بھی بات کرنی ہو تو تشبیہات، استعارات، محاورات اور ضرب المثل سے آراستہ پیراستہ اردو زبان استعمال کیا کرو۔ ایک بار دورانِ تدریس یہ استاد صاحب حقہ پی رہے تھے۔ انھوں نے جو زور سے حقہ گڑگڑایا تو اچانک چلم سے ایک چنگاری اُڑی اور استاد جی کی پگڑی پر جا پڑی۔

ایک شاگرد اجازت لے کر اٹھ کھڑا ہوا اور بڑے ادب سے گویا ہوا۔

''حضورِ والا، ! یہ بندہ ناچیز حقیر فقیر، پرتقصیر ایک روح فرسا حقیقت حضور کے گوش گزار کرنے کی جسارت کر رہا ہے۔ وہ یہ کہ آپ لگ بھگ نصف گھنٹہ سے حق حقہ نوشی ادا فرما رہے ہیں۔ چند ثانیہ قبل ایک شرارتی آتشی پتنگا آپ کی چلم سے بلند ہو کر چند لمحے ہوا میں ساکت رہا اور پھر آپ کی دستارِ فضیلت پر براجمان ہو گیا۔ اگر اس فتنہ کی بروقت اور فی الفور سرکوبی نہ کی گئی تو حضورِ والا کی جان کو شدید خطرات لاحق ہو سکتے ہیں۔ (نامعلوم)

● پیغام آفاقی

مہمان اداریہ

پختہ اور ناپختہ ناولوں میں فرق

آپ ناولوں میں کیا ڈھونڈتے ہیں؟ دانشوری کی روشنی یا محض نئے خیال کی سنسنی۔ کچھ ناول اور افسانے دنیا میں پیدا ہونے والی نئی سوچ اور نئی تبدیلیوں کو افسانوی سانچے میں ڈھال کر پیش کرتے ہیں۔ ان میں پڑھنے والے کو ایک تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ اپنے ماحول سے اکتائے ہوئے ناپختہ ذہنوں کو ان میں آزادی کی راہیں بھی نظر آتی ہیں۔ اور ان کے لئے ایسے ناول اور افسانے نئے فلسفوں اور دنیا کے نئے انکشافات سے آشنا ہونے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ لیکن ایسی تخلیقات کے حدود یہ ہیں کہ وہ صرف نئے آئیڈیاز کو اپنا محور بناتے ہیں۔ ایسے ناول نگار اور ان کے ناقد ایسے ناولوں کو دنیا کو نئے انداز میں دیکھنے کا نتیجہ بھی بتاتے ہیں۔

دانشوری اور خیال آفرینی دو مختلف چیزیں ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تخلیق کار کو صرف نئے آئیڈیاز کو پیش کرنے تک محدود رہنا چاہئے یا ان نئے آئیڈیاز کو دانشوری کے ترازو میں تولنا اور دیکھنا چاہئے۔ دراصل تولنے کے عمل میں ہی ناول کی دانشوری کا پہلو پنہاں ہوتا ہے۔ ناول کے اندر تولنے کا عمل ناول کے عمل میں دکھائی دیتا ہے نہ کہ لفظی موازنہ میں۔ مثال کے طور پر اگر کوئی چیز دوسرے کے مقابلے میں کمزور ہے تو اس کا اظہار عملی طور پر مضبوط کے مقابلے میں کمزور کو ہارتے ہوئے دکھا کر کیا جائے گا اور یہ ہار حقیقت پر مبنی ہوگی نہ کہ راوی کی مرضی پر۔ دانشوری کا تقاضہ یہ ہے کہ ہر نئے خیال کو دنیا اور زندگی کی مکمل ساخت کی روشنی میں جانچا جائے۔ ناول کی عظمت دانشوری میں پنہاں ہوتی ہے نا کہ محض خیال آفرینی میں۔ زندگی کی مجموعی صورتحال میں تبدیلی کے جائزے میں پنہاں ہوتی ہے نا کہ محض زندگی اور دنیا میں ہونے والے نئے نئے تجربات کی عکاسی اور پیشکش میں۔

لہذا محض آئیڈیاز کی بنیاد پر لکھے گئے ایسے ناولوں کی حیثیت صحافت سے زیادہ نہیں جو مجموعی زندگی میں سچے اور دیرپا اضافے کے عکاسی نہیں بنتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ صحافیانہ تحریروں یا ناولوں کے مقابلے میں سچے اور فنکارانہ ناول دیر سے وجود میں آتے ہیں۔ نئے خیالات اور نئے واقعات اپنے آپ میں پرکشش اور معنی خیز تو ہوتے ہیں لیکن وہ ناول کا مواد تب بنتے ہیں جب ان کو دنیا کی مجموعی حقیقیت کے

تناظر میں میں رکھ کر تول لیا جاتا ہے۔ اس کے لئے ایک تو اس آئیڈیا یا واقعے کے پورے سیاق وسباق کا سامنے آنا ضروری ہوتا ہے دوسرے خود ناول نگار کا اس واقعے سے اتنی دوری پر پہنچنا ضروری ہوتا ہے جہاں سے وہ اس آئیڈیا یا واقعے کو معروضی طور پر بھی دیکھ سکے۔ اس سے ناول نگار کو یہ موقع ملتا ہے کہ وہ اس واقعے کو خوردبینی اور دوربینی دونوں طریقے سے دیکھ سکے۔

دانشوری سے مالا مال ہر ناول دراصل زندگی کی زمین سے کہیں نا کہیں اسی طرح جڑا ہوتا ہے جیسے کسی پیڑ کی جڑیں ہوتی ہیں جو کہیں نا کہیں زمین میں پیوست ہوتی ہیں۔ دانشوری جذباتیت کو باقاعدہ اپنا حصہ بناتی ہے، تحیر کو ٹھہر کر اس وقت تک دیکھتی ہے جب تک حیرت کا عنصر ختم نہ ہو جائے، رفتار کو اپنے بڑے کینوس پر دیکھتی ہے کہ اس کی ہلچل کسی دور کی سڑک پر جاتی گاڑی کی طرح خراماں خراماں آگے بڑھتی ہوئی شے میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ کردار اپنے سفر میں ان گلیوں سے بھی گزرتے ہیں جہاں وہ دندنانے کے بجائے پورے ہوش و حواس میں آکر چلنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ چیخیں غالب کے اشعار کی طرح کتاب کی تحریر بن جاتی ہیں۔

اسی طرح اگر کسی ناول نگار کو کسی معاشرے کا تجربہ و مشاہدہ نہیں ہے اور وہ کسی معاشرے کے پس منظر کا سہارا لئے بغیر کسی اجنبی ملک، معاشرہ اور زبان سے کچھ ایسے خیالات کو اٹھا لائے جو اس کے اپنے معاشرے کی آب وہوا کے لئے اجنبی ہو تو ایسے خیالات بظاہر تو انقلابی، تازہ، روشن، خیال انگیز اور دلچسپ محسوس ہو سکتے ہیں لیکن ان کی حیثیت گلدان میں رکھے ہوئے کسی اجنبی پھول کی شاخ سے مختلف نہیں ہوگی۔ ایسی تحریر بھی دانشوری سے خالی ہوگی کیونکہ دانشوری ایک ایسی صفت کا نام ہے جس کا چراغ حقیقت کے تیل سے ہی جلتا ہے۔ حقیقی دنیا اور زندگی سے کٹی ہوئی دانشوری کا کوئی تصور کیا ہی نہیں جا سکتا کیونکہ یہ ایک عملی صفت ہے۔

لب لباب یہ کہ ادبی فہم کا تقاضا ہے کہ ناولوں میں سنسنی پیدا کرنے والے اور انتہائی تیز رفتار سے بدلتے وقت کی طرف بڑھتے دکھائی دینے والے ناولوں اور ان عظیم ناولوں میں فرق کو سامنے رکھا جائے جو نئی تبدیلیوں اور سنسنی خیز خیالات کی حقیقت کو تولنے اور جانچنے کے بعد لکھے جاتے ہیں اور جو اپنی زمین میں اس طرح مضبوطی سے گڑے ہوتے ہیں کہ پڑھتے وقت وہ زمین انہیں ایک پس منظر مہیا کرتی ہے۔ ایک ایسا پس منظر جو اس ناول کے ایک نامیاتی حصہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

دانشوری کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو ایک عام پڑھے لکھے آدمی کے لئے کچھ ناولوں کو پڑھنا ناگزیر ہے۔ اسی طرح کچھ عظیم ناولوں کا لکھا جانا معاشرے کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ ایسے ناولوں کے علاوہ کچھ ناول اضافی حیثیت رکھتے ہیں اور کچھ کی حیثیت محض تفریحی ہوتی ہے۔

معاشرے کی جزیات کی عملی اہمیت اور خصائص پر روشنی ڈالنے والے تمام شعبہ ہائے علوم جن

میں فلسفہ، مذہب، سماجیات، سائنس، معاشیات، نفسیات اور ادب شامل ہیں۔ سب سے زیادہ بڑے کینوس اور متحد وژن کی ذہنی تربیت دینے والا ذریعہ صرف ناول ہی ہے کیونکہ یہ وہ ذریعہ ہے جو زندگی کو عمل و حرکت کی شکل میں اس کے پورے کل کے ساتھ دیکھتا ہے اور اس میں بیک وقت سارے دوسرے علوم کی عملی قدر و قیمت اور اعتبار کی جانچ ہوتی رہتی ہے۔ مزید یہ کہ اس میں علوم کے علاوہ براہ راست سماج میں پیدا ہونے اور سماج کی تشکیل میں شامل ہونے والے کرداروں کی عملی شکل اور ذہنیت کی تصویر نظر آتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی واقعات کا دنیا کے مجموعی کل کے تراز و اور پس منظر میں تجزیہ بھی ناول ہی میں ہوتا ہے کیونکہ اس میں چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے واقعات کی آغاز سے انجام تک کی پوری تصویر نظر آتی ہے۔ اس طرح اس کے اندر وہ مجموعی تصویر نظر آتی ہے جس کو واقعات کے دوران یا ان کے اثرات کے پوری طرح سامنے آنے سے پہلے لکھے گئے صحافتی مضامین میں پیش نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ممکن ہے کہ کوئی محتاط تخلیقی ذہن واقعات کے دھارے کے درمیان بھی بیٹھ کر اس واقعے کی حقیقت کو اپنے فن کی گرفت میں لے لے۔ اس لئے اس امکان کو رد نہیں کیا جا سکتا لیکن اس میں کامیاب ہونا شرط ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو حقیقت پرست ناول معاصر صورتحال کے علاوہ تاریخی صورتحال کو پیش کرنے میں بھی خود تاریخ سے زیادہ وسیع کینوس رکھتے ہیں کیونکہ وہ ماضی بعید میں گزرے واقعات کو صرف دستاویزوں کی روشنی میں نہیں دیکھتے بلکہ انسانی نفسیات کی روشنی میں بھی ان واقعات کو پرکھتے ہیں جبکہ تاریخ یہ کام نہیں کرتی - اپنے معاشرے کے بارے میں اس طرح کے ناولوں کو پڑھنا دانشوری کے مقام تک پہنچنے کے لئے ناگزیر ہے۔

ناول کے اندر معاشرے کو اس کے اجزا کے حقیقی تناسب میں دیکھنا ضروری ہے۔ کسی معاشرے کی مجموعی ساخت میں چند پہلو عام طور سے ہوتے ہیں۔ مثلاً ہر معاشرے میں کوئی نہ کوئی حکومت موجود ہوتی ہے جس کے ہاتھ میں معاشرے کی باگ ڈور ہوتی ہے۔ کسی معاشرے کی شکل وصورت کو طے کرنے میں ان کا رول کم ہوتا ہے اور کسی میں زیادہ ہوتا ہے لیکن اس کا رول ہوتا ضرور ہے۔ کہیں حکومتیں نسبتاً ایماندار ہوتی ہیں اور کہیں نسبتاً زیادہ کرپٹ ہوتی ہیں۔ کہیں وہ معاشرے میں افراد کی زندگی کے فلاح کی کافی پابند ہوتی ہیں اور کہیں وہ تمام مظالم کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔ یہ حکومتیں حکمرانوں اور بیوروکریسی کے افراد کے ذریعہ چلائی جاتی ہیں اور یہ افراد کچھ فیصلے کھلے میں اور کچھ فیصلے بند دروازوں اور قلع نما دیواروں کے پیچھے لیتی ہیں۔ ان افراد کی سوچ، ان کی نیت، ان کے مفاد اور ان کے مجموعی کردار کو سمجھے بغیر کوئی قابل اعتبار ناول نہیں لکھا جا سکتا۔ جو افراد معاشرے کے سبھی طبقات کے بارے میں حقیقی تجربہ نہ ہونے کے باوجود ناول لکھتے ہیں وہ دراصل گمراہ کن خیالی باتوں کو ناول کی شکل میں پیش کرتے ہیں جو دلچسپ تو ہو سکتی ہیں لیکن قابل اعتبار نہیں۔

جو بات اوپر حکومتوں کے بارے میں کہی گئی وہی بات تاجروں اور سرمایہ داروں کے طبقے پر بھی صادق آتی ہے- حکومتوں کی طرح تاجروں کا بھی ایک بڑا طبقہ معاشرے کا حصہ ہے جس کے فیصلے عام لوگوں کی زندگی اور معاشرے کے سفر کو براہ راست متاثر کرتے ہیں۔ یہ تاجر جہاں دکانوں میں سامان بیچ رہے ہوتے ہیں وہاں تو بڑے پرامن نظر آتے ہیں لیکن ان دکانوں کے پیچھے یہ سامانوں کی ذخیرہ اندوزی سے لے کر ان کی قیمتیں طے کرنے کے لئے جو طریقے اختیار کرتے ہیں ان طریقوں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ یہ انسانوں کی بھوک اور ان کے خون تک کی تجارت کرتے ہیں اور اس کے لئے وہ کسی بھی حد تک جا سکتے ہیں۔ ان تاجروں کے پیچھے بیٹھے سرمایہ داران ساری قوتوں پر مسلط ہوتے ہیں جو قوتیں زندگی اور معاشرے کی شکلوں کو بناتی اور بگاڑتی ہیں۔ لہذا کسی بھی حقیقی ناول کی تشکیل میں اس پورے نظام کی آگاہی ہونی چاہئے۔ اگر ناول نگار ان حقیقتوں کو گہرائی سے نہیں جانتا اور پھر بھی اپنے ناول کو حقیقی ناولوں کے طور پر پیش کر رہا ہے تو دراصل وہ معاشرے کو گمراہی میں مبتلا کرنے کے عمل میں لگا ہوا ہے۔

اوپر کے ان دو طبقات کے علاوہ ایک اور طبقہ ہے جس کی حقیقت سے کم ہی لوگ آگاہ ہوتے ہیں اور وہ طبقہ میڈیا اور دانشوروں کا طبقہ ہوتا ہے۔ یہ طبقہ عموماً عوام کو جاہل سمجھتا ہے اور اپنی گرفت اور چمک دمک اور عوام کے اعتبار کا ناجائز استعمال کرتے ہوئے اکثر حکومتوں اور تاجروں کی حمایت کرتا ہے اور ان کی برائیوں کو پیش کرنے کے بجائے اسے چھپاتا ہے اور عوامی زندگی کی حقیقت کو یعنی عوام کی حالت اور ان کی سوچ کو کوڑے کباڑ کی طرح نظر انداز کرتا ہے۔

ان آسمانوں کے نیچے عوام کی وہ کثیر تعداد زندگی گزارتی ہے جسے ہم شہروں اور گاؤں میں گھومتے پھرتے اور زندگی کی بھاگ دوڑ میں لگے ہوئے ہنستے بولتے دیکھتے ہیں۔ دنیا کے ان پہلوؤں کے علاوہ ہم دنیا کو ایک اور طریقے سے بانٹ کر دیکھ سکتے ہیں۔ دنیا کا ایک حصہ وہ ہے جہاں قانون کی حکمرانی ہوتی ہے گو کہ اس دنیا میں بھی قانون بڑے پیمانے پر توڑے جاتے ہیں اور ایک حصہ وہ ہوتا ہے جہاں جرائم کی حکومت ہوتی ہے۔ یہ دونوں دنیائیں اکثر ایک دوسرے میں پیوست رہتی ہیں۔ مثلاً عام آبادی حکومت کے ذریعے نافذ کئے گئے قوانین کے دائرے میں جیتی دکھائی دیتی ہے لیکن وہیں گھروں کے اندر مردوں کی بے لگام حکومت چلتی ہے جہاں مردوں کی مرضی ہی قانون کا درجہ رکھتی ہے۔

ان چیزوں کے علاوہ دنیا کے مختلف ادارے جیسے پولس، عدالت، ہسپتال، تعلیمی درسگاہیں، عبادت گاہیں اور مذہبی ادارے جن کو عام آدمی اپنی زندگی کے تحفظ کا ذریعہ سمجھتا ہے ان کے سامنے کے چہرے کچھ اور ہوتے ہیں اور اندر کا چہرہ کچھ اور ہوتا ہے۔ مثلاً عدالت سے ہر آدمی انصاف کی توقع رکھتا ہے

لیکن عدالتوں کے برسوں تک چکر لگانے کے بعد وہاں انسان کو کچھ اور ہی دکھائی دینے لگتا ہے۔ یہی حال دوسرے اداروں کا ہے۔

لہذا ایک حقیقی ناول لکھنے کے لئے ناول نگار کا معاشرے کے ان تمام پہلوؤں کا گہرا علم ہونا ضروری ہے۔ بہت سے ناول نگار تو ایسی دنیا میں رہتے اور جیتے ہیں کہ معاشرے کے ان پہلوؤں کی گہرائی میں پہنچنا ان کے بس کی بات ہی نہیں۔

مکمل طور پر حقیقت پسند ناولوں کے علاوہ کچھ ناولوں کے پڑھنے کو ہم اختیاری/اضافی قرار دے سکتے ہیں۔ ان میں وہ ناول شامل ہوں گے جو پوری زندگی کے کل کی روشنی میں اپنے کرداروں اور واقعات کو نہیں دیکھتے لیکن زندگی کے کسی ایک اور جس پہلو پر روشنی ڈالتے ہیں وہاں وہ مقامی حقیقت کا گہرا تجزیہ کرتے ہیں۔ اس طرح کے ناول پڑھنے والے کے اپنے معاشرے کے کسی ایک پہلو سے متعلق بھی ہو سکتے ہیں اور کسی دیگر معاشرے کے بارے میں بھی ہو سکتے ہیں کیونکہ کسی بھی انسانی معاشرے کی حقیقی تصویر کسی دوسرے معاشرے کو سمجھنے میں کافی حد تک معاون ثابت ہو سکتی ہے۔ اسی طرح کچھ ناول زندگی کے بارے میں کوئی نیا نظریہ اور فلسفہ پیش کرتے ہیں۔ ایسے ناولوں سے بھی ذہن اس طرح روشن ہوتا ہے کہ خود اپنا معاشرہ زیادہ روشن ہو کر سامنے آتا ہے۔ اس کے علاوہ جن لوگوں کا سابقہ دوسرے معاشروں سے پڑتا ہے ان کی یہ ناول مدد کرتے ہیں۔ ایسے ناولوں کو زندگی کو سمجھنے کے لئے اختیاری اس لئے کہا گیا کہ ان کو پڑھنے سے زندگی کے بارے میں قاری کی جانکاری کا کینوس وسیع تر ہوتا ہے اور زندگی کے جس پہلو سے قاری کا تعلق ہوتا ہے اس پر خصوصی طور پر لکھے گئے ناول اس مخصوص قاری کو زندگی کی بصیرت سے مالا مال کرتے ہیں۔

ناولوں کی تیسری قسم تفریحی ناولوں کی ہوتی ہے۔ یہاں تفریحی ناولوں سے مراد سامان تفریح سے بھرے ہوئے ناول نہیں ہیں۔ یہاں مراد ناولوں کی بغرض تفریح مطالعے سے ہے۔ کوئی ناول چاہے دنیا کے کسی بھی حصے کی زندگی کے بارے میں لکھا گیا ہو اس کا مطالعہ اپنے آپ میں ایک نئی طرح کی زندگی جینے کا مزہ دے جاتا ہے۔ اس خانے میں دنیا کے تمام حقیقی ناولوں کو رکھا جا سکتا ہے۔ عموماً پختہ ذہن قاری بہت سستے تفریحی ناولوں سے حظ نہیں اٹھا سکتے۔ وہ جذباتی ناولوں سے بھی حظ نہیں اٹھا سکتے۔ لیکن ایک حقیقی ناول چاہے وہ دنیا کے کسی بھی حصے کے بارے میں ہو پختہ ذہنوں کے لے اپنے اندر ایک سحر رکھتا ہے۔

جہاں تک انسانی کرداروں کا تعلق ہے دنیا کے سارے کردار قاری کے اپنے معاشرے کے لئے بامعنی ہو سکتے ہیں کیونکہ دنیا کے سارے انسان فطرتاً ایک جیسے ہیں۔ لیکن چونکہ دنیا کے مختلف معاشرے ایک دوسرے سے اپنی نوعیت میں الگ ہوتے ہیں اس لئے دوسرے معاشروں کا عکس قاری کے اپنے معاشرے کو

سمجھنے میں محض اضافی حیثیت ہی رکھتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کسی دوسرے معاشرے کی چند خوبیوں اور اوصاف کی بنا پر وہ معاشرے قاری کے لئے اچھی مثال بنیں اور اس کے اندر اپنے معاشرے کو بہتر بنانے کی خواہش اور جذبہ پیدا کریں۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ کسی اور معاشرے کی خوبیاں اسی معاشرے کی مجموعی صورتحال اور حقیقت کی پیداوار ہوتی ہیں ہر چند کہ ان سے سبق لیا جا سکتا ہے اور ممکنات دیکھے جا سکتے ہیں۔

ناولوں کے دانشوری والے خاصے کا ایک اور پہلو بھی ہے۔ ہر ناول میں ان معنوں میں ایک نئی دنیا ہوتی ہے جن معنوں میں ہر انسان کو دنیا الگ شکل میں نظر آتی ہے۔ یعنی ہر ناول میں دنیا کا ایک نیا تجربہ ہوتا ہے جو بنیادی طور پر ناول نگار کا تجربہ اور مشاہدہ ہوتا ہے۔ اس طرح ناول دنیا کو ایک مختلف نقطہ نظر سے دیکھنے کا موقع فراہم کرتا ہے اور اس عمل میں قاری کو دنیا کی فطرت کو بہتر طریقے سے سمجھنے کا موقع ملتا ہے اور اس کی دانشوری میں اضافہ ہوتا ہے۔

ایک حقیقی ناول دنیا اور اس کے نظام، اس کے افراد اور اداروں کے مطالعے کو اپنا موضوع بناتا ہے اور کرداروں اور اداروں کے تجزیہ کے ذریعہ اپنے قاری کو اس میں رونما ہو رہے واقعات کا تجزیہ کرنے کے قابل بناتا ہے۔ ناولوں کو اس طرح بھی دیکھا جا سکتا ہے کہ وہ کسی زندگی کے کل کے ناول ہیں یا جز کے ناول ہیں۔ عظیم ناول اپنے ماحول کے کل کو اپنا موضوع بناتے ہیں اور فارم، فلسفہ اور حقیقت کے عرفان میں اسی کل کو پیش کرتے ہیں۔ عظیم ناولوں کا تجربہ زندگی کے جز کا تجربہ نہیں بلکہ کل کا تجربہ ہوتا ہے۔ ایک عظیم ناول اس کے آگے تک جاتا ہے۔ وہ موجود دنیا کے کل کو اس کے مکمل امکانی دائرے میں رکھ کر اس کی بہتر شکل کو دریافت کرتا ہے اور اسے قاری کے ذہن میں ایک ایسے خواب کی شکل میں قائم کر دیتا ہے کہ اس خواب کی قوت موجود دنیا کی تبدیلی کے عمل کو اپنی تعبیر کی طرف کھینچنے لگتی ہے۔

ایسے ناولوں کے برعکس کچھ ایسے ناول بھی ہوتے ہیں جن کی دنیا دراصل مکمل حقیقی دنیا کے محض ایک جز یا حصہ یا پہلو کا احاطہ کرتی ہے۔ ایسے ناول قاری کو اس کی اپنی زندگی اور دنیا سے نکال کر کسی اور دنیا کی سیر کراتے ہیں لیکن اس سے کشید کیا ہوا تجربہ اس کی اپنی دنیا کے کل کا تجربہ نہیں ہوتا۔ ایسے تجربات دلکش، پرلطف اور ریفریشنگ تو ہوتے ہیں لیکن ان کی اہمیت سیر سپاٹے جیسی ہوتی ہے جس سے قاری کے علم میں اضافہ تو ہوتا ہے لیکن اس کا درجہ دانش کا نہیں ہوتا۔ ایسے ناولوں میں ایک تخلیقی سرشاری کا بھی احساس ہوتا ہے جو عظیم ناولوں کا خاصہ ہے لیکن ایسے تجربات کی اہمیت حاشیائی ہوتی ہے۔ انسان کی دانشوری کے محور تک پہنچنے کے عمل میں ان کی اہمیت جزوی ہوتی ہے۔ ایسے ناول زندگی کی سرحدوں کو پھیلاتے ہوئے نئے آفاق کی تلاش بھی کرتے ہیں، لیکن ان کی اہمیت بہرحال حاشیائی ہوتی ہے۔

زیادہ تر مشہور و مقبول ناول حاشیائی خاصے کے ہوتے ہیں۔اس کی ایک وجہ یہ ہوتی ہے کہ یہ رومانی ناولوں کی طرح کلی حقیقت کی گرفت سے قاری کو نکال کر باہر لے جاتے ہیں۔ایک ان دیکھی دنیا کی سیر یقیناً ایک ناپختہ ذہن کے لئے اپنی حقیقی دنیا کی دریافت نو سے زیادہ آسان اور دلچسپ ہوتی ہے۔ایسے ناول نئے نئے خیالات اور موضوعات کو اپنے حصار میں لیتے ہیں۔اس ماحول میں قاری کو اپنی حقیقت کے قید و بند سے آزاد تجربات و خیالات کا لطف لینے کا موقع بھی ملتا ہے۔

لیکن دانشوری پر مبنی عظیم ناولوں کی نظر قاری کی زندگی کی ان گانٹھوں کو کھولنے پر ہوتی ہے جن سے فرار کا راستہ ان گانٹھوں کی نوعیت کو سمجھنے اور کھولنے کے علاوہ اور کوئی نہیں ہوتا۔اس لئے یہ عظیم ناول زندگی کے مرکز سے شروع ہو کر دنیا کے ہر طرح کے پھیلاؤ اور نئے خیالات اور نئے موضوعات کو اپنے اندر سمیٹتے ہیں۔ان میں مرکز بھی ہوتا ہے اور ان میں حاشئے بھی شامل ہوتے ہیں۔

دنیا میں عظیم ناول بہت کم وجود میں آتے ہیں اور ان کی مقبولیت بھی کافی وقت لیتی ہے کیونکہ ان میں گہری سنجیدگی ہوتی ہے۔اس کے برعکس ایسے ناول اور ناول نگار جلد مشہور ہو جاتے ہیں جو حاشیائی ناول لکھتے ہیں لیکن حاشیائی ناول بیشتر وقتی رجحانات، وقتی مسائل اور جذباتی نوعیت کے ہوتے ہیں۔اس ضمن کے کچھ ناول محض زندگی کو ایک نئے انداز میں دیکھنے کی وجہ سے مقبول ہوتے ہیں لیکن میں اس نئے پن کی نوعیت بھی ایک خاص طرح کی رومانیت لئے ہوتی ہے یعنی یہ ایک مخصوص خیال کی سنسنی خیزی سے اپنے اندر رنگ بھرتے ہیں۔

کئی ناول ایسے ہوتے ہیں جن میں آپ کسی ایک کردار کی زندگی کسی ایک بڑے واقعے کے حالات کا تفصیلی بیان پڑھتے ہیں۔ناول کے واقعات کے اتار چڑھاؤ کے دوران آپ کا زندگی کے مختلف حقائق سے کردار کے ذریعہ ایک نئے انداز میں نبٹنے کا طریقہ سامنے آتا ہے جس کی آپ توقع نہیں کرتے۔ ایسے ناول بھی حقیقت کا انکشاف کرتے ہیں لیکن یہ محض مثال پیش کرتے ہیں اور امکانات کو روشن کرتے ہیں۔اگر یہ مجموعی زندگی کا تجزیہ نہیں پیش کرتے تو ان کی حیثیت بھی محض ایک منفرد اور تنہا تجربے کی ہوتی ہے۔ایسے واقعات آپ کے ذہن کو سوچنے پر اکساتے ہیں اور زندگی کو نئے انداز سے دیکھنے کا حوصلہ دیتے ہیں۔ان کی اپنی ادبی اہمیت مسلم ہے۔

ناول اور ناول نگاری کی سب سے اعلیٰ قسم وہ ہے جس میں ناول نگار کا ذہن پورے معاشرے کے تناظر میں ہر چھوٹے سے چھوٹے واقعے اور کردار کی سوچ و حرکت کو دیکھتا ہے۔ایسی صورت میں کردار کے ہر فیصلے اور واقعات کے ہر موڑ کا تعلق مکمل معاشرتی پس منظر سے قائم رہتا ہے۔اور ان فیصلوں اور حرکات کی سمت و توازن کا تعین معاشرے کی ساخت اور کردار کی اپنی سوچ و پیش قدمی کے درمیان کی ہم

آہنگی یا بصورت دیگر انحراف سے قائم ہوتا ہے۔اگر کردار اپنے پس منظر کی حقیقت سے بغاوت کرتا ہے تو بھی اس کو اپنی بغاوت کو کامیاب بنانے کے لئے معاشرے کی حقیقتوں کو سامنے رکھنا پڑتا ہے۔اگر وہ ایسا نہیں کرے اور محض جذبات اور خوابوں کی رو میں بہے تو اس کا یہ عمل رومانی قرار پائے گا۔ایک حقیقت پرست ناول اور رومانی یا نیم رومانی ناول کا فرق یہیں سے واضح ہونا شروع ہو جاتا ہے۔اور ناول جسقدر حقیقت سے دور ہوتا جائے گا اسی قدر اس کی دانشوری کے خاصے میں نقص پیدا ہوتا جائے گا۔

ایسے ناول جو کسی ایک بڑے واقعے یا ایک اہم معاشرتی تبدیلی کو مرکز بنا کر لکھے جاتے ہیں ان میں اکثر جذباتی اور رومانی عناصر در آتے ہیں۔اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ایسے جو بھی واقعات ناول کے لئے منتخب کئے جاتے ہیں ان کے انتخاب کی وجہ عموماً عوام میں ان کی جذباتی یا رومان پرور تصوراتی لگاؤ ہوتی ہے۔ناول نگار عوام کو قاری کی حیثیت سے اپنی گرفت میں رکھنے کے لئے اکثر اسی جذباتی یا رومانی لگاؤ کو اپنے ناول کی ساخت کو ریڑھ کی ہڈی بنا لیتے ہیں۔نتیجتاً پورا ناول حقیقی ہونے کے بجائے جذباتی اور رومانی رنگ اختیار کر جاتا ہے۔کچھ ایسی ہی صورتحال ایسے جاسوسی ناولوں کی بھی ہوتی جن کا تانا بانا حقیقت سے نہیں بلکہ ایک مصنوعی تجسس سے بنا جاتا ہے۔ایسے ناول دلچسپ، رواں، اور زبان و بیان کی شیرینی سے تو لبریز ہو سکتے ہیں لیکن یہ قاری کو حقیقت پسند بننے میں معاون نہیں ہوتے بلکہ اکثر انکے ذہن کو سطحی سوچ کا حامل بنا دیتے ہیں۔ایسے ناولوں کو پڑھتے وقت اس بات کا دھیان رکھنا بے حد ضروری ہے کہ انہیں محض تفریح کے لئے پڑھا جائے اور ان کو حقیقی ناولوں کا درجہ نہیں دیا جائے۔اس کے برعکس ایسے ناولوں کو جو حقیقت پسند ہوتے ہیں اور ایسے ناول نگاروں کے ذریعے لکھے گئے ہوتے ہیں جنہیں دنیا کی ہر سطح کی حقیقی زندگی اور ان کی پیچیدگی کا بھرپور اور قابل بھروسہ تجربہ ہوتا ہے انکے ناولوں پر اسی طرح اعتبار کیا جا سکتا ہے جیسے سائنس کی کتابوں پر کیا جاتا ہے۔

اسی لئے اردو میں تقسیم ہند اور اس سے متعلق قتل و غارتگری اور اس کے بعد سے اب تک ملک میں ہونے والے فسادات یا فرقہ پرستی اور طبقاتی کشمکش پر لکھے جانے والے ناولوں کو بھی بہت احتیاط سے پڑھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔اس کے علاوہ وقت بوقت عوامی سطح پر مقبول ہونے والی سیاسی تحریکوں سے تعلق رکھنے والے ناولوں کو بھی احتیاط سے پڑھنا ضروری ہوتا ہے کیونکہ اگر ناول نگار کا رشتہ توازن اور مکمل حقیقت سے ٹوٹ گیا اور وہ واقعات یا تحریکوں کی جذباتی رو میں بہ گیا تو اس کے ناول میں حقیقت کے عناصر کم ہوتے چلے جائیں گے۔حقیقت صرف کسی واقعے یا شے کا نام نہیں ہے بلکہ اس واقعے یا شے کے اس وزن کا بھی نام ہے جو اس سے اسی طرح وابستہ رہتا ہے جیسے زمین کی کشش ہر ایک شے کے وزن کو طے کرتی ہے۔یعنی

جس طرح ہر چیز کا وزن بھی اس کی حقیقت کی ایک جہت ہے۔اسی طرح ہر واقعے یا شے کا وہ وزن اور اس کی اہمیت بھی اس کی حقیقت کی ایک اہم جہت ہے جو وہ واقعہ یا شے مکمل معاشرے کے تناظر میں رکھتی ہے۔ محض ناول نگار کی نظر میں اس واقعے یا شے کے بہت اہم یا غیر اہم ہو جانے سے وہ شے اہم نہیں ہو جاتی اور اگر ناول نگار اس کو ذاتی پسند و ناپسند یا جذباتی لگاؤ کی وجہ سے اہمیت دیتا ہے تو یہ ناول کی حقیقت پسندی کو مجروح کرے گا۔

اس لئے ہر ناول میں یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ خود ناول نگار کی جذباتی پختگی کس درجے کی ہے اور وہ اپنے معاشرے، فرقے، طبقے اور زمین کے تئیں کتنا غیر متعصب اور معروضی نقطہ نظر رکھتا ہے۔اس کے ساتھ ہی یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ جس زندگی کے بارے میں وہ لکھ رہا ہے اس کا عملی تجربہ اس کو کتنا ہے اور اس کی لکھی ہوئی باتوں کی چولیں ایک دوسرے میں محض تخیل میں ملتی ہیں یا وہ حقیقی ہیں۔

ناول اسٹرکچر کے لحاظ سے روپ رنگ میں اسی طرح ایک دوسرے کے مشابہ ہوتے ہیں جیسے انسان ایک دوسرے کے مشابہ ہوتے ہیں۔اصل فرق ذہن اور بصیرت سے شروع ہوتا ہے جو مختلف ناولوں میں مختلف قسم کے ہوتے ہیں۔کسی مقرر کی فصاحت اور گفتگو کی دلچسپی قطعی اس بات کا ثبوت نہیں کہ وہ عالم یا دانشور ہے۔اس فیصلے تک پہنچنے کے لئے اس مقرر کے پس منظر کو سمجھنا نہایت ضروری ہے۔اس کی گفتگو کی جذباتی سطح اور رنگ سے بھی اس بات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس کی باتوں اور سوچ مین کتنی پختگی ہے۔ ٹھیک اسی طرح ناولوں کی بصیرت کا اندازہ بھی انتہائی سنجیدگی سے کیا جانا چاہئے۔

Flat No:1,Police Station,
Rajouri Garden,New Delhi-110027
Mob:+91-9810792624

◂◂ ● ▸▸

''اے عزیز! غور کر کہ تیرا نفس بھی اژدھا ہے۔اسے مردہ مت سمجھ۔وہ وقتی بے سروسامانی کی وجہ سے منجمد نظر آتا ہے روایت ہے کہ فرعون کے (استدراجی) حکم سے دریا کا پانی رواں ہو جاتا تھا۔اگر ویسی ہی قدرت تجھے بھی حاصل ہو جائے تو تو بھی فرعون بن جائے۔یاد رکھ جو غرور اس میں تھا وہ تیری ذات میں بھی موجود ہے لیکن فرق صرف اتنا ہے کہ تیرا اژدھا ابھی کنویں میں مقیّد ہے!!''

('مثنوی مولانا رومؒ' سے ایک حکایت)

● علیم صبا نویدی

حمد باری تعالیٰ

نور باہر، نور اندر، تو ہی تو
دونوں عالم کا مقدر تو ہی تو

تیرے دم سے گل فشاں ارض و سما
مسکراہٹ کا سمندر تو ہی تو

چاند تارے کیا زمین و آسماں
سب کا مرکز اور محور تو ہی تو

نور افشاں ذات تیری چار سو
ماہ و انجم میں منور تو ہی تو

خامۂ فکرِ صبؔا تیرا غلام
اور اس کے فن کا جوہر تو ہی تو

◂◂ ● ▸▸

● علیم صبا نویدی

نعت

یہ کائنات
کئی بھیدوں میں گرفتار تھی
روز وشب
اک اک بھید
کھلتے جارہے تھے
زمین وآسمان کے بھید
سمندر کے بھید
چاندسورج کے بھید
اندھیروں کے بھید
اورآدمیت کے بھید سے آگے
انسانیت کے بھید سے
ایک نورانی پیکر
نکل کر
ساری کائنات کونورانی کرگیا

◄◄ ● ►►

206,Tripliane High Road, 2nd Floor
Flat No - 16 Rice Mandi Street, Chennai - 600005
Mob: +91 - 9840361399

● پروفیسر مظفر حنفی

شآد عارفی: ایک منفرد فنکار

اُردو غزل کی صدیوں پر محیط ، بے کراں روایت میں یہ سعادت گنتی کے تین چار شاعروں کو نصیب ہوئی ہے کہ ان کا ہر شعر اپنے لہجے کی بنا پر دور سے پہچانا جاتا ہے۔ شآد عارفی نے غلط نہیں کہا۔

اور پھر کہتے ہیں کہ کس کو ندرتِ طرزِ ادا

میرے شعروں میں مری آواز پہچانی گئی

عام طور پر شآد عارفی کو ایک عظیم طنز نگار غزل گو کی حیثیت سے یاد کیا جاتا ہے، لیکن وہ عشقیہ غزل کے بھی اتنے ہی اہم شاعر ہیں۔ انھوں نے منظریہ، طنزیہ اور رومانی نظمیں اتنی اچھی اور ایسی کثیر تعداد میں کہی ہیں کہ تا حال تنقید یہ فیصلہ نہیں کر سکی کہ شآد کی غزل اور نظم میں سے کس کا پلّہ بھاری ہے۔ نثر میں بھی شآد عارفی نے تنقیدی مضامین اور مکتوبات کی شکل میں قابلِ لحاظ ادبی سرمائے کا اضافہ کیا ہے۔

شآد عارفی رامپور میں پیدا ہوئے ، وہیں عمر بسر کی اور وہیں وفات پائی۔ ان کا سالِ پیدائش ۱۹۰۰ء ہے اور سنہ وفات ۱۹۶۴ء۔ شاعری وہ نوعمری میں ہی کرنے لگے تھے۔ ان کی تخلیقی کاوشیں کم و بیش پچاس برسوں کا احاطہ کرتی ہیں۔ اس دوران ان کی شاعری میں کئی موڑ آئے۔ ایک جگہ خود کہا ہے۔

وہ رنگیں نوائی ، یہ شعلہ بیانی
کئی موڑ آئے مری شاعری میں

بڑی بات یہ ہے کہ اُس دور میں بھی جسے شآد عارفی رنگیں نوائی سے تعبیر کرتے ہیں انھوں نے لب و رخسار والی روایتی شاعری نہیں کی بلکہ اپنے سچّے اور پُر جوش واقعاتِ عشق کو ایسے نادر لہجے میں اس ندرتِ ادا کے ساتھ پیش کیا کہ ان کی عشقیہ غزل کا ذائقہ اُردو کی عام عاشقانہ اور روایتی غزل سے منفرد ہو گیا۔ بقولِ شآد۔

دوسروں کے واقعاتِ عشق اپناتے ہیں وہ
جن سخن سازوں کی اپنی داستاں کوئی نہیں

انھوں نے دو بار محبت کی اور جواب میں انہیں دوسری طرف سے بھی محبت ملی۔ ان کی عشقیہ غزلوں میں اس دوطرفہ محبت کے جیتے جاگتے ، سچے اور تابناک مناظر دیکھے جا سکتے ہیں۔

کام کی شے ہیں کروٹن کے یہ گملے اے شاؔد
وہ نہ دیکھے مجھے ، میں اس کا نظارہ کر لوں

☆

لائے ہیں تشریف تکیوں پر دُلائی ڈال کر
حُسن اور اس درجہ بے خوف و خطر میرے لئے

☆

چھپائی ہیں جس نے میری آنکھیں میں انگلیاں اس کی جانتا ہوں
مگر غلط نام لے کے دانستہ لطف اندوز ہو رہا ہوں

☆

اس سے جب پوچھا گیا چھپ چھپ کے رونے کا سبب
دردِ دل کا کام اس نے دردِ سر سے لے لیا

☆

دل نوازی جو بھرے گھر میں نہیں بن پڑتی
رخِ محبوب پہ گیسو ہی بکھر پڑتا ہے

☆

لکھ کر میرا نام اے شاؔد
اس نے بھیجا ہے رومال

☆

بھولی سی ہم مکتب کوئی کوئی سہیلی خالہ زاد
اُن کے ہاتھوں خط بھجواتے میں ڈرتا ہوں لیکن وہ

☆

مسکرا دیں گے مرا نام کوئی لے دیکھے
وہ کسی فکر میں بیٹھے ہوں ، کسی کام میں ہوں

☆

ابھی انگڑائیاں لی جا رہی ہیں

سمجھتے ہیں ابھی دیکھا نہیں ہے

☆

اُسے نسیمِ چمن کہہ رہا ہوں میں لیکن
کہیں نسیمِ چمن مُڑ کے دیکھتی بھی ہے

☆

کیا لکھ رہے ہیں آپ مجھے دیکھ دیکھ کر
میں نے دیا جواب ، غزل کہہ رہا ہوں میں

آج ہم نئی غزل کے عہدِ شباب میں غالباً اس نئے پن، نادرہ کاری اور غیر روایتی آہنگ کو اتنا محسوس نہ کرسکیں جتنا کہ آج سے نصف صدی پیشتر کے نقادوں نے شاؔد کی غزلوں میں محسوس کیا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ یگاؔنہ اور فراؔق سے زیادہ شاؔد عارفی کو نئی غزل کے بنیاد کاروں میں شمار کیا جاتا ہے۔اس دور میں شاؔد کی عشقیہ نظمیں 'سماج'، 'ایک تصویر'، 'فسانۂ ناتمام'، 'بسنت'، 'پھول کی پتی سے'، 'وفائے وعدہ'، 'دسہرہ اشنان' وغیرہ بھی بے حد مقبول ہوئی تھیں۔شاؔد عارفی کی رنگیں نوائی کے بارے میں ڈاکٹر معصوم رضا راہؔی نے سچ کہا ہے۔

''شاؔد کی عشقیہ شاعری کا پلڑا زمین کی طرف جھکتا ہے۔ غالباً ایسی ہندوستانی فضا اور گھریلو محبت، حسرؔت کی غزل اور فراؔق کی رباعی کے علاوہ اُردو شاعری میں صرف شاؔد کی عشقیہ نظم و غزل ہی پیش کرسکی ہے۔ ان کی محبت کے یہ گیت اتنے مقدس اور گھریلو ہیں کہ حسرت موہانی کے علاوہ کوئی اور شاعر عشق کی اس سادگی اور پاکیزگی کی منزل پر نظر نہیں آتا۔''

ہمارے عظیم اور قابلِ ذکر شاعروں میں میؔر، فاؔنی اور یگاؔنہ کی تنگدستی اور پریشاں حالی کے تذکرے عام ہیں لیکن شاؔد عارفی کے حالاتِ زندگی ان سب سے زیادہ تلخ ہیں۔ کچھ ابتدائی برسوں کو چھوڑ کر انہوں نے تمام عمر انتہائی مفلسی، بے روزگاری اور پریشانی میں بسر کی۔ چالیس برس کی عمر میں شادی کی تو اہلیہ ڈیڑھ برس میں ہی انتقال کر گئیں۔ اعزّا واقارب نے انھیں فریب دیئے اور صحت بھی جواب دے گئی۔ طُرّہ یہ کہ طبعاً بے حد غیور اور خود دار تھے اس لئے کسی کی مدد قبول کرنا اپنی توہین سمجھتے تھے۔ ان سب باتوں کے زیرِ اثر ان کا مزاجِ شعر، طنز کی طرف مائل ہو گیا اور انھوں نے زمانے کی ناانصافیوں اور خام کاریوں کے خلاف جہاد کرنے کے لیے اپنے قلم کو تلوار بنا لیا۔

میں دنیا پر طنز کروں گا
دنیا میرے کیوں درپے ہو

اور

اس نے جب سو تیر چلائے
میں نے ایک غزل چپکا دی

علامہ نیاز فتح پوری نے ان کی بابت لکھا ہے۔

''شاد عارفی زمانۂ حال کے شاعروں میں ایک خاص رنگ کے نقّاد و طنز نگار ہیں جن کی غزلیں اور نظمیں جارحانہ انتقاد سے تعلق رکھتی ہیں، ان میں کہیں کہیں مزاحیہ رنگ بھی آجاتا ہے۔ اس رنگ کی شاعری میں ایک خاص لب ولہجہ کی ضرورت ہوتی ہے جس میں قطعیت بہت زیادہ ہو۔ اس کوشش میں بہت سے حضرات آرٹ سے ہٹ کر خشک واعظ بن کر رہ جاتے ہیں لیکن شاد عارفی شاعرانہ زہر خند تبسمِ زیرِ لب کو کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔''

حق تو یہ ہے کہ اردو شاعری میں خالص طنز کی روایت جو انگریزی کے زیر اثر اور مزاح کے غلبے کی وجہ سے ادب میں دوسرے درجے کی چیز بن گئی تھی، شاد عارفی کی تخلیقات میں دوبارہ زندہ ہوگئی اور اس رنگ میں شاد عارفی نے وہ خاص طرز اختیار کی جس کے موجد بھی وہی تھے اور خاتم بھی وہی ٹھہرے، ملاحظہ ہوں یہ اشعار۔

آشیاں پھول نہیں تھے کہ خزاں لے اڑتی
آپ اس بحث میں جانے کی اجازت دیں گے

☆

مگر یہاں تو جل رہا ہے آدمی سے آدمی
سُنا یہ تھا چراغ سے چراغ جلتے آئے ہیں

☆

دل میں لہو کہاں تھا کہ اک تیر آلگا
فاقے سے تھا غریب کہ مہمان آگیا

☆

اُسے جس حال میں سجدہ کیا ہے
اسے اللہ بہتر جانتا ہے

☆

کہنے والوں نے کہا ظلِ الٰہی جن کو
ہم انھیں سایۂ دیوار نہیں کہہ سکتے

☆

لاکھوں ہیں ہم سب بے چارے
اے شہزادو! تم سب کے ہو

☆

جب چلی اپنوں کی گردن پر چلی
چوم لوں منہ آپ کی تلوار کا

☆

کاروبارِ قفس اب یہاں آ گیا
وہ فلاں چل بسا، وہ فلاں آگیا

☆

ہمارے ہاں کی سیاست کا حال مت پوچھو
گھری ہوئی ہے طوائف تماش بینوں میں

☆

کہیں رہ نہ جائے مشینوں کی دنیا
کہیں آدمی آ نہ جائے کمی میں

☆

ناجائز پیسے کی اُجلی تعمیروں کے ماتھے پر
آپ نے لکھا دیکھا ہوگا یہ سب فضلِ باری ہے

☆

جہاں تک ہماری غزل جائے گی
تغزّل کے معنیٰ بدل جائے گی

بلاشبہ شاد عارفی نے تغزل کے معنی تبدیل کر دیے، غزل میں ایسی کاٹ پیدا کر دی، اس میں وہ معنویت اور مقصدیت شامل کی جس نے اُسے زمانۂ حال کی چیز بنا دیا اور اپنے معاشرے کی تمام خامیوں پر

نشتر زنی کرنا سکھا دیا۔

نقدِ ماحول کہ فن ہے میرا
ہر طرف رُوئے سخن ہے میرا

بقول حفیظ جالندھری۔

''شاد عارفی اپنے اردگرد کے سیاسی اور ادبی دور سے مکمل باخبر ہی نہیں بلکہ مجاہدانہ اور سخت گیرانہ طریق پر اُس پُر آشوبی کے نقّاد صادق ہیں۔ شاد نے اپنے دَور کے حالات سے جو احساسات اخذ کئے ان کا اظہار مثبت اور واضح طور پر مُدرتِ ادا کے ساتھ کیا ہے۔''

شاد نے طویل و مختصر سوطنزیہ نظمیں بھی کہی ہیں جن میں اپنے عہد کی برائیوں اور کمزوریوں کی نشاندہی کرتے ہوئے سماج کی دُکھتی رگوں پر نشتر چلائے گئے ہیں۔ یہ نظمیں ایسی نئی نئی اور دلچسپ ہیئتوں میں ہیں کہ شاد عارفی کی فنکاری پر ایمان لانا پڑتا ہے۔ ان کی نظم نگاری پر اظہار خیال کرتے ہوئے خلیل الرحمٰن اعظمی رقمطراز ہیں۔

''شاد عارفی نے اپنے نظموں میں بیانیہ پیرایہ اختیار کرنے کے بجائے ڈرامائی، مکالماتی اور تمثیلی انداز اختیار کیا ہے۔ انھوں نے یہ کمال کیا ہے کہ ایک ہی مصرع کے اندر دو دو اور تین تین کرداروں کے مکالمے ادا کرنے کی کوشش کی ہے..... ٹی ایس ایلیٹ نے شاعری کی تین آوازوں کا ذکر کیا ہے۔ ان تینوں آوازوں کا ایک ہی نظم میں اجتماع بہت ہی مشکل کام ہے۔ شاد نے اُردو نظم میں یہ کام بھی کر دکھایا ہے۔''

ان کی نظموں میں 'شوفر'، 'پرانا قلع'، 'ان اونچے اونچے محلوں میں'، 'رنگیلے راجا کی موت'، ''نمائش'، 'ان سے ملئے'، ''ٹکڑ گدے' اور 'ابھی جبلپور جل رہا ہے' وغیرہ اُردو نظم کے سخت سے سخت انتخاب میں جگہ پانے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔

پروفیسر احتشام حسین نے لکھا ہے۔

''مجھے ذاتی طور پر شاد عارفی کی شاعری نے متاثر کیا۔ وہ جو تھے وہی ان کی شاعری ہے، زندگی نے انھیں جو دیا وہ اُن کے کلام میں کبھی غصّہ بن کر، کبھی طنز اور زہر خند بن کر اور کبھی دکھے دل کی پُکار بن کر محفوظ ہو گیا۔''

اپنی عشقیہ اور طنزیہ غزل نیز منظریہ، عاشقانہ اور طنزیہ نظموں میں شاد عارفی نے جس مجتہدانہ شان کے ساتھ زبان کا تخلیقی استعمال کیا ہے جس طرح عام بول چال کے غریب اور ٹاٹ باہر الفاظ کو اپنے جادو نگار قلم کے لمس سے ادبی شان عطا کر دی ہے اس کی مثال اُردو شاعری میں نایاب ہے اور یہ صفت انہیں سچے معنوں میں ایک عوامی شاعر بناتی ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور نے غلط نہیں کہا۔

''جو لوگ شاعری کی زبان اور بول چال کی زبان کو ایک دوسرے سے الگ کر کے دیکھتے ہیں، انھیں شاد کے کلام کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ شاد نے بول چال کی زبان کی طاقت اور شعریت کو جس طرح اجاگر کیا اور جس طرح بقول ایذرا پاؤنڈ، حقیقی نفسیات کو زبان دی ہے اُسے جدید اُردو شاعری ہمیشہ یاد رکھے گی۔''

کچھ اپنے کھرے مزاج کی وجہ سے اور کچھ اپنی شاعری کے بالکل ہی نئے رنگ کی وجہ سے اردو تنقید نے ان کی زندگی میں اس عظیم فنکار کو وہ اہمیت نہ دی جس کے وہ بجا طور پر مستحق تھے لیکن ان کی وفات کے تین سال کے اندر ہی ایک مجموعہ مضامین 'ایک تھا شاعر' منظرِ عام پر آیا جس میں ہر اہم تخلیق کار اور ہر مکتبِ فکر سے تعلق رکھنے والے نقادوں نے شاد عارفی پر مضامین لکھ کر ان کی اہمیت اور عظمت کا اعتراف کیا۔ اس کے چند برس بعد ہی ان کی شخصیت اور فن پر ایک تحقیقی مقالہ بھی شائع ہو گیا۔ اسی طرح ان کی حیات میں انجمن ترقی اردو کے ایک مختصر سے انتخاب کے علاوہ کوئی ڈھنگ کا شعری مجموعہ تک نہیں شائع ہو سکا تھا لیکن انتقال کے بعد مرحوم کا تمام کلام 'شاد عارفی کی غزلیں'، 'سفینہ چاہیے'، 'اندھیر نگری'، 'شوخیِ تحریر'، 'دکھتی رگیں'، 'کلیاتِ شاد عارفی' میں محفوظ ہو گیا ہے۔ ان کے مکاتیب اور مضامین 'ایک تھا شاعر'، 'نثر و غزل دستہ شاد عارفی' اور 'شاد عارفی ایک مطالعہ' میں شائع کئے گئے ہیں۔

شاد عارفی کی نثر بھی ان کی شاعری کی مانند انفرادی رنگ و آہنگ اور مخصوص لہجہ رکھتی ہے۔ مختلف لوگوں کے نام ان کے خطوط اور ادبی موضوعات پر ان کے مضامین سے کچھ مختصر مختصر اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں جو برجستگی اور کاٹ میں شعروں کی طرح پُر تاثیر اور پُر کیف ہیں۔ فرماتے ہیں۔

''کوئی بھی ادب کھجور یا ناریل کا درخت نہیں ہوتا کہ اس سے شاخیں نہ چھوٹیں۔''

''جوش ملیح آبادی کی آج کل کی شاعری پر اتنا تبصرہ کافی ہوگا کہ وہ اپنے قطعات میں لغت کمپوز کر رہے ہیں۔''

''میرے نزدیک اچھے شعر کی تعریف اس میں نہیں کہ وہ صحیح ہو۔ اپنے معنی پر دلالت کرتا ہو بلکہ میں کسی بھی شعر میں سب سے پہلے تخیل کی انفرادیت اور پھر ندرتِ ادا پر نظر ڈالتا ہوں۔''

''خطائے بزرگاں گرفتن خطا است، کے معنی یہ سمجھائے جاتے ہیں کہ اپنے بزرگوں کو ان کی غلطی پر ٹوکنا غلطی ہے حالانکہ وہاں گرفتن کے معنی ہیں تقلید۔ مطلب یہ کہ بزرگوں کی غلطیوں کی پیروی نہ کرو۔''

''بلا مبالغہ ہر روز پچاس ساٹھ نادر تخیلات ذہن میں آتے ہیں لیکن مشکل سے پانچ چھ فنی گرفت میں آتے ہیں، باقی کو ترک کر دینا پڑتا ہے اور صرف اس لئے کہ ان کو ادا کرنے کے لیے موزوں الفاظ دستیاب نہیں ہوتے۔''

''جلی ہوئی رسّی کے بل اور گھڑے کی چکناہٹ میں دنیا کو کیا پسند ہے۔آپ جانتے ہیں اور مجھے کیا پسند ہے، دنیا جانتی ہے۔''

''سب سے اچھی کتاب وہ ہے جس میں بیان کی ہوئی باتیں کسی دوسری کتاب میں نہ پائی جائیں۔''

''ڈومنی ڈومنی کے ہاں بغیر معاوضہ لئے ناچتی ہے۔اس لئے میں شاعر ہوکر ایسے شاعر سے جو مدیر بھی ہو، ہزار مجبوریوں کے بعد بھی کچھ نہیں کہہ سکتا ہاں اس حکومت سے التماس کرسکتا ہوں جس کے ہاتھ جھوٹا موتی سچے موتی پر مسکراتا ہے۔''

''لوگ ادب نوازی کا ڈھونگ رچاتے ہیں مگر شاعر سے اپنے پیسے پیسے کے عوض قصیدہ چاہتے ہیں۔''

''کس قدر مہمل بات ہے کہ عیسائی، یہودی، سکھ، ہندو ہونے کی وجہ سے آپ اس کے یا وہ آپ کا دوست نہ بن سکے صرف اس لئے کہ آپ نماز پڑھتے ہیں وہ گنگا کو جاتا ہے یا واہ گرو خالصہ کا نعرہ لگاتا ہے۔''

''صرف لفظوں کو جمع کردینے سے تکملۂ شعر تو ممکن ہے مگر تاثیر دینا ممکن نہیں۔''

''غزلوں میں اشعار کی ترتیب موڈ کے تحت ہونی چاہیے۔مطلع سیاسی ہے تو پوری غزل سیاسی ہو، عاشقانہ ہے تو سب شعر عاشقانہ ہوں۔ایک قافیہ دوسرے کو کاٹتا ہوا نہ ہو، نفی اور اثبات کا اجتماع ٹھیک نہیں۔''

''میرا ایک مخصوص زاویۂ فکر ہے جو طنز و سیاست کے امتزاج سے پیدا ہوتا ہے۔ندرتِ ادا میرے نزدیک شعر کی جان ہے۔''

''ہمارے شعرا ایران و مصر پر اس طرح نظمیں لکھ رہے ہیں جیسے گھر پر سب خیریت ہے۔''

بحیثیت مجموعی شاؔد عارفی کی اہمیت اور عظمت سے کسی بھی دبستانِ ادب کو انکار نہیں ہوسکتا۔ شمس الرحمٰن فاروقی کا یہ قول صد فیصد صداقت کا حامل ہے۔

''شاؔد کی طنزیہ غزل ہی نے جدید غزل کی راہ ہموار کی۔شاؔد عارفی بہرحال ایک عہد ساز شاعر تھے، ان کے بعد آنے والے ہر شاعر، بالخصوص نئی غزل کے ہر شاعر نے ان سے اکتسابِ فیض کیا ہے۔''

◀◀ ● ▶▶

D-40,Batla House,New Delhi-110025
Mob:+91-9911067200

● ڈاکٹر پیر نصیر احمد

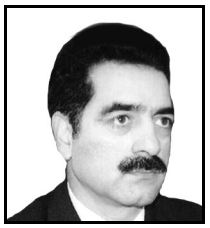

اقبال اور گوئٹے: چند قربتیں

گوئٹے: جان وولف گانگ گوئٹے نے ۱۸/ اگست ۱۷۴۹ء میں فرانک فورٹ ام مین میں آنکھ کھولی اور جرمنی کے تاریخی شہر وائمر میں ہی وفات پا گیا۔گوئٹے نے اپنی ابتدائی تعلیم و تربیت اپنے ہی والد سے حاصل کی۔کہا جاتا ہے کہ گوئٹے کے والد ایک سخت گیر قانون دان تھے جب کہ اس کی والدہ کے مزاج میں خوش دلی اور شگفتہ مزاجی بدرجہ اتم موجود تھی۔اس طرح سے اُس کے والدین میں اعتدال رہتا تھا اور اسی ماحول میں گوئٹے کی پرورش و پرداخت ہوئی ہے اسے فرانسیسی ادبیات اور جمالیات سے لگاؤ فوجی افسروں کے میل میلاپ اور تھیٹر کے تماشوں کے ذریعے پیدا ہوا۔وہ سولہ سال کی عمر میں قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے لائپ زگ گیا۔یہاں وہ زیادہ تر کھیل کود اور رنگ رلیوں میں بسر کرتا رہا۔یہیں سے اسے فنون لطیفہ اور شاعری کے ساتھ دلچسپی بڑھنے لگی۔اسی کھیل تماشے میں اُسے ایک مہ جبین کے ساتھ عشق کی انتہا ہوگئی اور اسی دور میں گوئٹے نے دو مختصر ڈرامے اور چند شوخ غنائی نظمیں رقم کیں۔اپنی زندگی میں ان ابتدائی بے اعتدالیوں کی وجہ سے وہ سخت بیمار پڑ گیا اور پھر یہیں سے اس کی زندگی میں ردِ عمل شروع ہوا جس نے اس کی آئندہ زندگی کی راہ متعین کی۔بیماری کے دوران مذہب اور علم الاخلاق کی طرف راغب ہوا۔اس نے جو اپنا دیوان لکھا ہے اس میں اگرچہ اس نے دیوانِ حافظ کا جواب تو نہیں لکھا لیکن اظہارِ عقیدت اور تتبع ضرور کیا ہے۔اسی طرح تصوف اور علم باطن کے رموز و اسرار جاننے کی تڑپ بھی اسے ہوگئی تھی۔اس لئے اس کے کلام میں تصوف کا ہلکا سا رنگ پایا جاتا ہے۔اس آمیزش کی جھلک اس کے معروف ڈرامے 'فاؤسٹ' میں نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔چنانچہ سٹراس برگ میں گوئٹے نے قانون کی ڈگری دو سال تک حاصل کی۔اس کے بعد اُسے علم طب کا شوق بڑھنے لگا۔تقریباً اسی زمانے میں کیمیا سے بھی اس کی دلچسپی پیدا ہوتی گئی، اس لئے اپنے ڈرامے 'فاؤسٹ' میں اس نے اس فن کا خوب مذاق اڑایا ہے۔یوں اس کی بے حاصلی اور زیاں کاری پر سخت طنز کیا ہے اسی اثنا میں اسے علم الحقائق سے وابستگی ہوگئی اور اس نے ہلکے پھلکے علوم و فنون کو جوڑ کر حقیقی علمی راہ اپنانی شروع کی۔اس طرح اس نے شیکسپیئر کے ڈراموں کا بغور مطالعہ کیا۔آرٹ کی عظمت

اور ہرڈر کی تنقیدی تصانیف سے وہ کافی متاثر ہوا، اس طرح اس کے تاریخی ڈرامے گوٹز (Goetz) اور المیہ افسانے ورتھر (Werther) کو قبول عام کا شرف حاصل ہوا۔ اس طرح یہ تسلیم کیا گیا کہ گوئٹے جرمنوں کی رومانی بغاوت (Romantic Revolt) کا قائد ہے۔ ۱۷۷۵ء میں گوئٹے کو وائمر آنے کی دعوت ملی اور وائمر کی جرمن ریاست کے ڈیوک کارل آگسٹ نے اسے اپنا وزیر منتخب کیا۔ ۱۷۸۶ء میں یہ نابغہ اطالیہ چلا گیا۔ جہاں وہ دو سال تک روما کی فنی و علمی تاریخ اور تعمیرات کی عظمت اور شان و شوکت کا بغور مطالعہ کرتا رہا۔ یوں اسے وجدانی طور پر یہ احساس ہوا کہ عہدِ عتیق اور قدیم فن میں جو اللہ نے پُرسکون عظمت و شان رکھی ہے اس سے دورِ جدید یکسر محروم ہے۔ اس شعور نے گوئٹے کے نظریات زندگی کو یکسر بدل ڈالا۔ چنانچہ اس کے مشہورِ زمانہ ڈرامہ 'فاؤسٹ' میں جو دور جدید کے آرٹ پر تنقید ہے وہ اسی احساس سے متاثر دکھائی دیتی ہے۔ گوئٹے نے 'فاؤسٹ' کو اپنے مرحوم دوستوں سے انتساب کیا ہے۔ 'فاؤسٹ' میں گوئٹے حیات بعد الموت اور روحوں سے عالم آخرت میں ملاقات کے عقیدے کا اظہار بھی کرتا ہے۔

گوئٹے کے نزدیک عمل ہی زندگی نہ بدلنے والی حقیقت ہے اور حقیقی عمل وہ ہے جو بے حاصل نہ ہو۔ گوئٹے مسلسل اور پیہم جدوجہد کا قائل ہے اس کے لئے سکون اور تعطل موت کے مترادف ہے اس کے نزدیک ذوق عمل میں زندگی اور ترقی کا راز مضمر ہے۔ 'فاوسٹ' اسی لئے خناس سے کہتا ہے کہ 'اگر میں کسی گریزاں ساعت سے یہ کہوں، ٹھہرے رہ، تو کتنی حسین ہے، تو وہ میری موت کی گھڑی ہونی چاہیے۔' اسی طرح گوئٹے کے فلسفہ حیات میں انانیت یعنی غرور و تکبر ام الرزائل ہیں اور تیاگ و ترکِ دنیا خواہشات اُم الفضائل۔

گوئٹے کا مذہب اور اللہ:

فضل حمید کے مطابق گوئٹے نہ مذہب کا منکر ہے اور نہ کسی مخصوص مذہب کو حق و صداقت کا واحد اجارہ دار سمجھتا ہے۔ یعنی اُس کے یہاں مذہب خدا تک رسائی حاصل کرنے کی راہ ہے۔ وہ ایمان کی ضرورت کو تو تسلیم کرتا ہے مگر اپنے ہم نوا غالبؔ کی طرح یہ پوچھتا ہے کہ کامل ایمان کیا ہے۔ مذہب اور خدا کے بارے میں جو مارگریٹا (کردار) اور (فاؤسٹ) کے سوال و جواب ہوئے ہیں، وہ گوئٹے کے عقیدے پر خاصی روشنی ڈالتے ہیں۔

گوئٹے کا معروف ڈرامہ 'فاؤسٹ' ہی ہے۔ اس ڈرامے کے ابتداء میں فاؤسٹ ایک عظیم عالم کی حیثیت میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ فاؤسٹ اپنی تمام تر توجہ علم و ادب کی تکمیل میں صرف کرتا ہے لیکن پھر بھی اس کا دل مضطرب ہی رہتا ہے۔ دراصل وہ عشق اور فطرت کے حسن و جمال سے بے خبر ہے۔ تمام عمر

وہ علم ہی کے ذریعے سے فطرت کے راز جاننے کی کوشش میں مصروف رہتا ہے لیکن اس کی یہ کوشش رائیگاں ہو جاتی ہے۔ آخر کار فاؤسٹ پر یہ حقیقت ظاہر ہوتی ہے کہ محض علم اور عقل کی بدولت انسان حقیقت تک نہیں پہنچ سکتا ہے۔ دراصل اسی نظریئے کی بنا پر گوئٹے اپنے دور کا باغی کہلاتا ہے۔ کہ وہ مجرد عقلیت پسندی کے خلاف آواز اٹھاتا ہے۔ یہی حقیقت اس نے فاؤسٹ کی شخصیت میں پیش کرنے کی ایک کامیاب کوشش کی ہے۔ فاؤسٹ کو ایک ایسی کامیاب زندگی کی تلاش رہتی ہے جو صرف خیالی تصورات کا مرقع نہ ہو اور جس میں فقط سوچ بچار کا رویہ ہی نہ ہو بلکہ احساسِ مرّوت کارفرما ہو اور ذہنی اطمینان نصیب ہو۔ اس مقصد کو پانے کے لئے وہ ابتداء میں جادو کا سہارا بھی لیتا ہے اور اسی میں کسی حد تک اپنے لیے سکون و اطمینان کا سامان پاتا ہے۔ لیکن یہ سکون و اطمینان عارضی ثابت ہوتا ہے۔ اس کے بعد وہ روحِ ارضی کو بلاتا ہے لیکن اس کی ناپختگی کے باعث رُوحِ ارضی اس سے کنارہ کشی اختیار کرتی ہے۔ لہٰذا وہ نا اُمید ہو کر مرنے پر اپنے آپ کو تیار کراتا ہے کیوں کہ محض ایک کیڑے کی زندگی بسر کرنا نہیں چاہتا بلکہ اس کے نزدیک ایک حقیر زندگی بسر کرنے سے تو مر جانا بہتر ہے لیکن ایسٹر کی ایک صبح اس کے دل میں محبت اور گداز کے خوابیدہ سوتوں کو پیدا کر دیتی ہے اور وہ اس حقیقت کو پا لینے کے لئے بے قرار ہو جاتا ہے جو اُسے ساری دنیا پر حاوی کر دے مگر اچانک اس کے دل میں یہ بات بیٹھ جاتی ہے کہ ایسا ناممکن ہے کہ وہ تمام دنیا کو مسخر کر سکے۔ لہٰذا وہ ایک اور بار مایوسی کے دلدل میں پھنس جاتا ہے۔

گوئٹے اور اقبالؔ:

گوئٹے کا اقبالؔ نے گہرا مطالعہ کیا تھا۔ پوری تحقیق اور جستجو کے بعد علامہ اقبالؔ کو گوئٹے کے متعلق یہ جانکاری حاصل ہو گئی تھی کہ اس نے اسلامیات کا بھی گہرا مطالعہ کیا تھا اور وہ اس سے کافی متاثر بھی ہو چکا تھا۔ اگرچہ قرآنی فہم و فراست سے گوئٹے محظوظ و مستفید اس حد تک نہ ہوا کہ وہ اس پر ایمان لا کر مسلمان ہو جاتا مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ اس نے ایرانی ادبیات سے بے پایاں خوشہ چینی کی ہے اور بڑی فراخ دلی سے اس حقیقت کا اعتراف بھی کیا ہے۔ ابلیس سے متعلق بھی گوئٹے کے خیالات اسلامی ہی ہیں گرچہ اس کے وہ خیالات ناقص ہی قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ اقبالؔ اس بارے میں ہمیں یوں جانکاری دیتے ہیں۔

''ابتدائے شباب ہی سے گوئٹے کی ہمہ گیریت مشرقی تخیّلات کی طرف مائل تھی سٹراس برگ میں جہاں وہ قانون کے مطالعے میں مصروف تھا۔ اس کی ملاقات جرمن لٹریچر کے مشہور اور قابلِ احترام شخصیت ہرڈر سے ہوئی جس کی صحبت کے اثرات کو گوئٹے نے خود اپنی سوانح حیات میں تسلیم کیا ہے۔ ہرڈر فارسی نہیں جانتا تھا لیکن چونکہ اخلاقی رنگ اس کی طبیعت پر غالب تھا اس لیے سعدیؔ کی تصانیف سے اسے

نہایت گہری دلچسپی تھی۔ گلستانِ سعدیؔ کے بعض حصّوں کا اس نے جرمن زبان میں ترجمہ بھی کیا ہے۔ خواجہ حافظؔ کے رنگ سے اُسے چنداں لگاؤ نہ تھا۔ اپنے معاصرین کو سعدیؔ کی طرف توجہ دلاتے ہوئے لکھتا ہے۔

''حافظ کے رنگ میں ہم بہت کچھ نغمہ سرائی کر چکے۔ اس وقت سعدیؔ کے تلمذ کی ضرورت ہے۔''

۱۸۱۳ء میں فان ہمیر نے خواجہ حافظؔ کے دیوان کا پورا ترجمہ کیا۔ اس ترجمے کی اشاعت سے جرمن ادبیات میں مشرقی تحریک کا آغاز ہوا۔ گوئٹے کی عمر اس وقت ۶۵ سال کی تھی، اور یہ وہ زمانہ تھا جب کہ جرمن قوم کا انحطاط انتہائی حد تک پہنچ چکا تھا۔ ملک کی سیاسی تحریکوں میں حصہ لینے کے لئے گوئٹے کی فطرت موزوں نہ تھی اور یورپ کی عام ہنگامہ آرائیوں سے بے زار ہو کر اس کی بے تاب اور بلند پرواز روح کے مشرقی فضا کے امن وسکون میں اپنے لئے ایک نشیمن تلاش کر لیا۔ حافظ کے ترنم نے اس کے تخیلات میں ایک ہیجان عظیم برپا کر دیا۔ جس نے آخر کار مغربی دیوان کی ایک شان دار اور مستقل صورت اختیار کی مگر فان ہمیر کا ترجمہ گوئٹے کے لئے محض ایک محرک ہی نہ تھا بلکہ عجیب وغریب تخیّلات کا ماخذ بھی تھا۔ بعض جگہ اس کی نظم 'خواجہ' کے اشعار کا آزاد ترجمہ معلوم ہوتی ہے اور بعض جگہ اس کی قوت تخیل کسی مصرع کے اثر سے ایک نئی شاہ راہ پر پڑ کر زندگی کے نہایت دقیق وگہرے مسائل پر روشنی ڈالتی ہے''۔

خواجہ حافظؔ کے علاوہ گوئٹے اپنے تخیّلات میں شیخ عطار، سعدیؔ، فردوسیؔ اور دیگر اسلامی ادباء کا بھی ممنون احسان ہے۔ اقبالؔ کو افسوس رہا ہے کہ گوئٹے نے مولانا رومؔ کو سمجھنے کی چنداں کوشش نہیں کی۔ اقبالؔ کے خیال کے مطابق گوئٹے چونکہ عاشق مزاج تھا، اس لیے مولانا روم کا روح پرور فلسفہ اس کی فہم سے بالاتر تھا اور وہ اسے گنجلک تصور کرتا تھا۔ اقبالؔ گوئٹے کے اس رویے کے متعلق یوں رقمطراز ہیں۔

''مولانا رومؔ کے حقائق ومعارف اس کے نزدیک مبہم تھے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس نے رومیؔ کے کلام پر غائر نگاہ نہیں ڈالی، کیوں کہ جو شخص سپینوزا (ہالینڈ کا فلسفی جو مسئلہ وحدت الوجود کا قائل تھا) کا مداح ہو اور جس نے برونو (اٹلی کا ایک وجودی فلسفی) کی حمایت میں قلم اٹھایا ہو، اس سے ممکن نہیں کہ رومیؔ کا معترف نہ ہو۔ غرض کہ 'مغربی دیوان' کی وساطت سے گوئٹے نے جرمن ادبیات میں عجمی روح پیدا کرنے کی کوشش کی۔ بعد کے شعراء ہلاٹن، روکرٹ اور بورڈن اسکاٹ نے مشرقی تحریک کو جس کا آغاز گوئٹے کے دیوان سے ہوا، تکمیل تک پہنچایا۔''

اقبالؔ کو گوئٹے سے کافی دلی قربت رہی ہے اور اس قربت کو اصل میں وہی شخصیت جان سکتا ہے جس کو اقبالؔ کی طرح وسیع مطالعہ ہو۔ چنانچہ گوئٹے کے متعلق پہلا شاعرانہ حوالہ اقبالؔ کی اس نظم میں ملتا ہے جو انھوں نے برصغیر کے عظیم اردو اور فارسی شاعر غالبؔ پر کہی ہے۔ غالبؔ کی طرف مخاطب ہوتے ہوئے

اقبالؔ یوں گوئٹے کا تذکرہ چھیڑتے ہیں۔

؎ آہ! تُو اُجڑی ہوئی دلّی میں آرامیدہ ہے
گلشن ویمر میں تیرا ہم نوا خوابیدہ ہے

اس کے علاوہ ''پیام مشرق'' میں ان کا یہ شعر بھی گوئٹے کے حوالے سے زبردست اہمیت کا حامل ہے:

؎ صبا بہ گلشن ویمر سلام ما برساں
کہ چشم نکتہ وراں خاک آں دیار افروخت

پیام مشرق:

اقبالؔ نے اس حقیقت کا برملا اعتراف کیا ہے کہ 'پیام مشرق' کی تصنیف کا محرک گوئٹے کا 'مغربی دیوان' ہے۔ 'پیام مشرق' کے دیباچے میں انہوں نے اس 'دیوان' کا تذکرہ قدرے تفصیل سے کیا ہے اور جرمن ادب کی مشرقی تحریک کی مختصر مگر نہایت بلیغ ودلچسپ تاریخ بیان کی ہے۔ اگرچہ گوئٹے کا 'دیوان' اقبالؔ کی تصنیف کا محرک ثابت ہوا، جیسے بیشتر نقاد اس کا یہ سب سے بڑا کارنامہ تصور کرتے ہیں لیکن اقبالؔ گوئٹے کے 'فاؤسٹ' (Faust) کو 'دیوان' سے زیادہ مشکل سمجھتے ہیں کیوں کہ اس کے حصہ دوم میں علم کیمیا سے متعلق بہت سی اصطلاحات ملتی ہیں اور کچھ تلمیحات اور اشارات بھی ہیں جن سے مغرب کے لوگ مانوس تب تک نہ تھے اور جن کو صحیح طور پر صرف مشرق کے لوگ ہی سمجھ سکتے ہیں۔ اقبالؔ کہتے ہیں کہ،

''جرمنی کے قیام کے دوران مجھے بہت سے مواقع ملے جب میں نے ان اصطلاحات کی تشریح و توضیح کی تو اس سے میرے جرمنی کے سامعین بہت متاثر ہوئے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ گوئٹے کی نگاہ وسیع تھی۔''

اقبالؔ کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ،

''اگر کسی نے گزشتہ ایک ہزار سال کی تاریخ کا مطالعہ نہیں کیا تو خود کو مہذب اور تربیت یافتہ کہلانے کا وہ مستحق نہیں۔ پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ ہر جرمن ان اصطلاحات اور اشارات سے واقف ہو جاتا، جس کو گوئٹے نے مشرقی ادب سے منتخب کیا تھا۔ ہمارے لئے یہ اصطلاحات روزمرہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ بہر حال 'فاؤسٹ' کے ان ابواب کے ہضم کرنے میں مجھے کوئی دقت نہیں ہوئی۔ جس آسانی کے ساتھ میں نے ان اصطلاحات کی وضاحت کی اور اس پر اہل جرمنی کو واقعتاً حیرت تھی۔''

'فاؤسٹ' جو کہ اس کا مشہور ومعروف ڈرامہ ہے۔ وہ اصل میں عمل ہی کو حقیقت تک پہنچنے کا ذریعہ بناتا ہے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ گوئٹے کے نزدیک کائنات میں ایک ابدی حُسن کارفرما ہے جو انسان کو مادی زندگی کی پستیوں سے روحانی زندگی کی بلندیوں کی طرف لے جاتا ہے۔ ان روحانی بلندیوں کی جھلک سچّے

عاشق کو اپنی محبوبہ میں نظر آتی ہے۔ اس 'فاؤسٹ' کے کردار کے ذریعے سے گوئٹے نے یہ بات اپنے قاری کے ذہن نشین کرانے کی کوشش کی ہے کہ انسان اگر ابلیس کے زیر اثر بہت سی نفسیاتی خواہشات میں الجھ کر نہ رہ جائے تو وہ اس مجازی عشق کے ذریعے سے عشق حقیقی تک پہنچ سکتا ہے۔ اقبالؔ کے یہاں بھی ابلیس کا تصور گوئٹے کے تصورِ ابلیس سے مشابہت رکھتا ہے۔ آدم کی پیدایش کو گوئٹے کا میفسٹو اور اقبالؔ کا ابلیس دونوں ایک ہی نظر سے دیکھتے ہیں۔ میفسٹو فاؤسٹ کو اپنے دام فریب میں اُلجھا کر اسے جادوئی شراب پلاتا ہے جس کے اثر سے فاؤسٹ جوان ہو جاتا ہے اور جادوگروں کے محمل میں ایک حسین وجمیل دوشیزہ پر عاشق ہو جاتا ہے اور اس کے بعد فاؤسٹ گرجا گھر سے واپس آتی ہوئی لڑکی گریٹسن کو اپنا دل دے بیٹھتا ہے۔ گریٹس اس پر دل وجان سے فدا ہو جاتی ہے۔ فاؤسٹ گریٹسن کی ماں کو اپنے راستے سے ہٹانے کے لئے اس کو گریٹسن ہی کے ہاتھ سے زہر کھلواتا ہے اور میفسٹو کے ساتھ مل کر اس کے بھائی کو قتل کر دیتا ہے۔ گریٹسن اپنے نوزائیدہ بچے کو تالاب میں غرق کر دیتی ہے اور اسے اس جرم میں قید کر دیا جاتا ہے۔ جیل خانے میں وہ اپنی موت کا انتظار کرتی ہے۔ گوئٹے نے اس ساری تفصیل میں میفسٹو کا کردار اور آدم کے ساتھ اس کا تعلق انتہائی فن کارانہ طریقے سے بیان کیا ہے۔ انسان کی تخلیق گوئٹے کے میفسٹو اور اقبالؔ کے ابلیس دونوں کو ناگوار ہے۔ نظم 'تسخیر فطرت' کا حصّہ بعنوان 'انکار ابلیس' اقبالؔ کے نظریہ ابلیس کے اسی پہلو کو اُجاگر کرتا ہے ؎

۱ نوری ناداں نیم سجدہ بآدم برم! او بہ نہاد است خاک من بہ نژاد آزرم
۲ می تپد از سوز من خون رگ کائنات من بہ دو صرصرم من بہ غوتندرم
۳ من زتنک مایگاں گدیہ نہ کردم سجود قاہر بے دوزخم داور بے محشرم
۴ آدم خاکی نہاد، دوں نظر و کم سواد زاد در آغوش تو پیر شود در برم

(ترجمہ:۱) ابلیس خالق کائنات سے کہتا ہے کہ میں نور کے بنے ہوئے فرشتوں کی طرح بے وقوف نہیں ہوں کہ آدم کو سجدہ کردوں کیوں کہ وہ مٹی کا بنا ہوا ہے جب کہ میں آتش پرست آذر کی اولاد سے ہوں یعنی آگ کا بنا ہوں۔

(۲) کائنات کی رگ میں جو خون ہے وہ میرے سوز کی وجہ سے گرم ہے۔ میں رفتار میں صرصر کی تندو تیز ہوا کی طرح طوفانی ہوں اور بلند آواز یا کڑک میں بجلی کی کڑک کی طرح ہوں۔

(۳) میں نے خودی اور عقل سے محروم فرشتوں سے خود کو سجدہ کرنے کی بھیک نہیں مانگی میں بھی قہر کرنے والا ہوں اگر چہ میرے پاس کسی کو پھینکنے کے لیے دوزخ نہیں ہے میں بھی انصاف کرنے والا ہوں۔ اگر چہ میں قیامت نہیں رکھتا۔

(۴) یہ مٹی کا بنا آدمی جو کم نظر اور کم روشنی والا ہے۔ پیدا تو تیری گود میں ہوا ہے لیکن بوڑھا میری گود میں ہوتا ہے۔

گوئٹے کے متذکرہ بالا ڈرامہ سے اقبالؔ زبردست متاثر ہوئے ہیں اور انھوں نے مختلف جگہوں پر اپنے کلام میں اس کی عکاسی کی ہے۔ 'پیام مشرق' کی نظم 'جلال و گوئٹے' اسی ڈرامہ کی عکاسی کرتی ہے۔ اس میں گوئٹے کے کمالِ فن کا اعتراف رومیؔ کرتے ہیں۔ کسی فن کار کے اعترافِ فن کا یہ انداز اعتراف کرنے والے کی اپنی عظمت کی دلیل ہے اور یہ انداز ہمیں اقبالؔ کے یہاں بھی اثر نظر آتا ہے۔

گوئٹے فلسفیانہ فکر کے تنگ سانچوں میں اپنے آپ کو محدود نہیں رکھتا ہے بلکہ آپ نے آفاقی شاعری کے تمام صفات اپنے آپ میں پیدا کر دیئے تھے۔ اُس کے شاعرانہ تخیلات کا سرچشمہ نہایت وسیع ہے۔ وہ کالی داس کی شکنتلا کا بھی دلدادہ ہے اور حافظ کے نغموں سے بھی محظوظ و مستفید ہوتا ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ ساز شخصیت سے بھی کافی متاثر نظر آتے ہیں اور دل سے اُن کی عظمت کے قائل ہیں۔ چنانچہ گوئٹے نے اسی جذبے سے معمور 'نغمۂ محمدؐ' کے نام سے ایک شاندار نظم کہی ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک ایسی قوت کی حیثیت سے پیش کیا ہے جس کی متابعت میں کائنات کی قوتیں آگے بڑھتی ہیں۔ اس نے جہاں ٹھوکر لگائی، وہیں شہر آباد ہوئے اور تہذیبوں نے فروغ پایا۔ اقبالؔ نے اسی کو پیش نظر رکھ کر اپنی نظم 'جوئے آب' پیام مشرق میں شامل کی ہے جو کہنے کو تو ایک آزاد ترجمہ ہے لیکن اس میں اقبالؔ کی انفرادیت صاف جھلکتی ہے اس کا ایک بند ملاحظہ ہو ؎

بنگر کہ جوئے آب چہ مستانہ می رود مانند کہکشاں بہ گریبانِ مرغزار
در خواب ناز بود بہ کہوارہ سحاب واکرد چشم شوق بہ آغوشِ کوہسار
ذی بحرِ بیکراں چہ مستانہ می رود در خودیگانہ از ہمہ بیگانہ مہ رود

ترجمہ: ذرا دیکھ کہ پانی کی نہر کس مستی میں بہہ رہی ہے۔ سبزہ زار کے گریباں میں کہکشاں کی مانند۔ وہ بادلوں میں چین سے سوئی ہوئی تھی اور اس نے پہاڑوں کے سلسلے کی آغوش میں اپنے شوق کی آنکھ کھولی ہے۔ وہ بے کنار سمندر کی طرف مستی سے چلی جارہی ہے۔ اپنے آپ میں اکیلی سب سے بیگانہ بہتی جارہی ہے۔

اقبالؔ گوئٹے کو نہایت احترام کے ساتھ یوں اپنا خراج عقیدت ادا کرتے ہیں ؎

نکتہ دانِ المنی را در ارم صحبتے افتاد باپیر عجم
شاعرے کو ہم چو آں عالی جناب نیست پیغمبر ولے دارد کتاب

خواند بر دانائے اسرارِ قدیم — قصّہ پیمانِ ابلیس و حکیم
گفت رومی اے سخن را جان نگار — تو ملک خیداسی و یزداں شکار
فکر تو در کنجِ دل خلوت گزید — ایں جہانِ کہنہ را باز آفرید
سوز و سازِ جاں بہ پیکر دیدۂ — در صدف تعمیر گوہر دیدہ
ہر کسے از رمزِ عشق آگاہ نیست — ہر کسے شایانِ ایں درگاہ نیست
داند آں کہ نیک بخت و محرم است — زیر کی زِ ابلیس وعشق از آدم است

جگن ناتھ آزاد کے مطابق اس نظم کے ساتھ ہی گوئٹے کے ڈرامے 'فاوسٹ' کا نثر میں ذکر کرتے ہوئے اقبالؔ کہتے ہیں۔

''اس ڈرامے میں شاعر نے حکیم فاوسٹ اور شیطان کے عہد و پیماں کی قدیم روایت کے پیرائے میں انسان کے امکانی نشو ونما کے تمام مدارج خوبی سے بنائے ہیں کہ اس سے بڑھ کر کمالِ فن تصور میں نہیں آ سکتا''۔

◂◂ ● ▸▸

ASSTT. REGISTRAR,
COLLEGE DEVELOPMENT COUNCIL,
UNIVERSITY OF KASHMIR,SRINAGAR,
PIN CODE- 190006,
CELL NO- +91 9906827399.

مقصدی شاعری: ایک جائزہ کا ناقدانہ تجزیہ، ادراک، جدیدیت سے مابعد جدیدیت تک، (انتقادیات) اور شعری مجموعہ 'پس لفظ آئینہ' کے بعد
'فیض صدی' اور ترقی پسند تحریک کی پلاٹینم جوبلی کے موقع پر
معروف نقاد، شاعر، افسانہ نگار، صحافی
شفیق احمد شفیق
کی تیسری تنقیدی، تجزیاتی اور تحقیقی کتاب
فیض ایک عہد ساز شخصیت
شایع ہوگئی ہے۔
رابطہ: آر۔۱۱۸۰ بلاک ۱۸، سمن آباد، گلبرگ ٹاؤن، فیڈرل 'بی' ایریا، کراچی۔ فون: ۳۶۳۴۰۰۴۴

● محمد نعیم بیگ

آج کا اردو افسانہ: جدیدیت، مابعد جدیدیت اور آفاقیت کے تناظر میں

آج کا اردو افسانہ اپنے ابتدائی ارتقائی مراحل سے گزر کر ایک نئے کائناتی رنگ میں رنگا جا رہا ہے۔ ترقی پسند تحریک سے جدیدیت اور اب مابعد جدیدیت کے دور میں داخل ہوا چاہتا ہے جہاں عہد حاضر کے نہ صرف سماجی مسائل بلکہ کائناتی افق پر سائنس اور اسکے اثرات اسکا موضوع ہے۔ تاہم برِصغیر کے باہر لکھا جانے والا اردو افسانہ اپنی ہیئت میں برصغیر کے لکھاریوں کی سوچ سے یکسر مختلف ہے۔ مقابلتاً متنوع اور روشن خیالی کا جواز لئے مابعد جدیدیت کے فکری تناظر میں نہ صرف لکھا جا رہا ہے بلکہ عالمی ادب میں اپنا مقام بھی بنا رہا ہے۔

ہمارے ہاں لکھنے والے گو سچائی اور موجودات (جدیدیت) کا منظر پیش کر رہے ہیں تاہم اس میں عالمی بورژوائی اور سامراجیت کا مقابلہ کرنے کی سکت روز بروز کم ہوتی جا رہی ہے۔ چندے کچھ ادیب ابھی بھی رجعت پسندی کے عناصر کو سینے سے لگائے نرگسیت کا شکار مذہبی آلودگی کو بھی اپنی تحریر کا حصہ بنا رہے ہیں جس سے افسانوں کی افاقیت مجروح ہو رہی ہے۔ اور دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ رجحان کہیں کہیں ہندوستان میں بھی دیکھنے کو مل رہا ہے اگرچہ وہاں بہتر افسانہ لکھا جا رہا ہے۔

ان تمام منفی رجحانات کے باوجود میں آج کے افسانے سے پوری طرح مطمئن ہوں اسکی وجہ وہ برِصغیر کے وہ بے تحاشا نئے بالخصوص نوجوان ادیب اور لکھاری اپنی جواں سال فکری سوچ کو اپنے قلم کا ہتھیار بنا رہے ہیں۔ امن و شانتی، عالمی معاشی جبر، کنزیومر مارکٹنگ اور سامراجیت کو ہم اسی ہتھیار سے شکست دے سکتے ہیں ورنہ خطے میں گزشتہ کئی ایک دہائیوں سے تشدد کا اپنایا ہوا راستہ ہمیں صرف تباہی کی طرف لے جا رہا ہے جس سے عالمی سماج بھی متنفر ہو رہا ہے۔ ہمارے ہاں جید لکھاری اپنے موضوعات میں نیا رنگ لا رہے ہیں تاہم جس رجائیت سے نوجوان لکھ رہے ہیں وہ ان ہی کا خاصہ ہے۔

پھر ایک اور بات بیسویں صدی میں بڑے افسانہ نگاروں میں خواتین کا حصہ بہت کم تھا لیکن آج میں دیکھ رہا ہوں کہ جنڈر ڈسکریمینیشن سے نفرت کرتی ہوئی ہماری نئی پود میں خواتین لکھاری اپنا مجموعی کردار

نہایت بہادری سے سرانجام دے رہی ہیں اور اس طرح اردو ادب میں انکی اعانت مقابلتاً زیادہ ہے اور یہی وہ رجحانات ہیں جن کو کہانی کار بھی اپنے قلم سے ادب کا حصہ بنا رہا ہے۔

اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ جدید افسانہ کیا ہے اور کہاں ہے؟ جدید افسانے پر بات کرنے سے پہلے جدیدیت کا احاطہ کرنا ضروری ہے۔ 'ماڈرن' لاطینی زبان کا لفظ 'موڈ' سے ماخوذ ہے جس کا مطلب لمحہِ موجود یا ابھی۔ تاہم ادب موجود اور غیر موجود کے فرق تک محدود نہیں بلکہ قدیم، وسطی اور جدید یعنی سہ زمانی زاویوں سے اسکی شناخت کا احاطہ بھی کر سکتے ہیں۔ ڈاکٹر جانسن اور ڈاکٹر سید عبداللہ مرحوم نے جدیدیت کی تعریف کچھ اس طرح کی ہے کہ جدیدیت کے عام معنی میں نیا، تازہ، جدید العہد، زمانی لحاظ سے پرانے کے مقابلہ میں نیا، کلاسیکی اور روائتی کے مقابلہ میں جدید اور مروج کے مقابلے میں انوکھا۔ بالخصوص مذہبی عقائد کے سلسلے میں وہ رجحان جو روائت کو جدید فکر سے ہم آہنگ کرتا ہے۔ تاریخی تناظر میں اسے آپ اساطیری اور ماورائی تصورات کے چنگل سے نجات کہہ سکتے ہیں۔ جدیدیت پر برٹرینڈ رسل نے کہا۔

''جدیدیت میں انفرادیت کا فروغ اور لادینیت کے پھیلاؤ کو اہمیت دی گئی ہے۔'' ہائیڈگر کے تجزیئے کے مطابق جدیدیت کا نمود جدید عملی زندگی میں سائنس اور ٹیکنالوجی کا اطلاق ہے تاہم جدیدیت کی بنیاد مارٹن لوتھر نے رکھی تو اس کا اظہار اسکے پاپائیت سے انکار پر مقیم تھا۔ اسکا کہنا تھا۔

''صداقت اور فلاح کے لئے کسی پوپ یا پادری کی شفاعت کی ضرورت نہیں۔ انسانی فلاح کے لئے مذہب سے نہیں بلکہ فلسفیوں اور سائنسدانوں سے رجوع کرنا ضروری ہے۔''

جدیدیت کے عناصر ترکیبی میں سائنسی علمیات اور انسان دوستی (کم از کم یورپ کی حد تک اس پر عمل ہوتا رہا ہے) عقلیت اور خودمختاری کو اولیت حاصل ہے۔ یہ عناصر ان تمام فکری اداروں اور فکری ساختیوں کی تشریح کرتے ہیں جن کے بغیر جدید انسان کی زندگی کا خاکہ مرتب نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اور پھر جو عوامل اس خاکے میں رنگ بھرتے ہیں وہ جمہوریت، اثباتیت، قانوں کی حکمرانی اور جمالیات کے معروض اور اخلاقی افادی اصول ہیں۔

جدیدیت جوہری طور پر سائنسی نظم و نسق کی پابند ہے۔ سوچنے والی ذات کو مرکز مان کر آگے بڑھتی ہے جو عقل اور معقولیت کی بنیادیں فراہم کرتی ہے اور اسکے ساتھ ہی انتشار کو رد کرنا اسکا اولین فرض کہلایا جاتا ہے۔ ترتیب اور ہم آہنگی اسکے اہم پہلو ہیں۔ اس طرح جدیدیت میں عقل کے بغیر نظم و ضبط کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا اس لئے وہ تمام عناصر جو بدنظمی اور انتشار پھیلائیں اس کے احاطے سے باہر ہیں۔

بیسویں صدی میں جدیدیت کے معماروں میں ورجینیا وولف، جیمز جوائس، ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ، ایذرا پونڈ، سٹونز اور کافکا اس کے اہم ترین معماروں میں سے تھے۔ تاہم جدیدیت کے داخلی تضادات دوسری

جنگِ عظیم میں کُھل کر سامنے آ گئے اور انسانیت کے دعویٰ دار بھیڑیوں کی طرح ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑے۔ یہی وجہ تھی کہ ایٹم بم کے استعمال سے انسان صفحہِ ہستی سے مِٹ جانے کے خطرے سے دوچار ہو کر وجودیت کا ظہور ہوا۔ پھر وجودیت نے بہت سے عناصر سے فیض اخذ کیا۔ نطشے کی منفیت، شوپن ہار کی قنوطیت اور جرمن رومانیت کی حساسیت کافکا کی اینٹی بورژوا فکر اور ایلیٹ کے ویسٹ اینڈ کے منفی افکار نے موضوعیت پر مبنی تصورِ مسیحیت نے اسے پروان چڑھایا۔ وجودی فلسفہ نے ثابت کیا کہ انسانی روح ناقابلِ تسخیر ہے۔

بہرحال ہم اس بحث میں مزید آگے جائے بغیر اپنی گفتگو کو اسی تناظر میں دیکھتے ہیں جن نکات پر ہم نے جدیدیت کی عناصر کی تشریح کی۔ جب ہم جدیدیت کی راہ پر چلتے ہوئے اپنے اردو افسانے کی تاریخ دیکھتے ہیں تو یہ اندازہ کرنے میں کوئی قباحت نہیں کی ہمارے ہاں کا اردو ادب جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ افسانہ اپنے روائتی مدار سے نکل کر جدیدیت کی طرف اور اسکے آگے مابعد جدیدیت کے ارتقائی تقاضوں پر اترنے کی کوشش میں ہے۔ افسانہ شروع ہی سے انگلش ادب کی روائتی ہیئت کو اپنائے اپنے وجود میں آیا تھا اسی لئے وہ آج بھی اسی تناظر میں اپنے سفر کو جاری رکھے ہوئے ہے۔ اس میں جدیدیت کا معرکہ خیز کارنامہ یہ ہے کہ اس نے بائبل کی جگہ فلسفہ اور سائنس کو تقدیس دی۔ عقائد پر عقلیت، اثباتیت اور تجربیت کو فوقیت دی اور مذہب کی جگہ سیکولر علم کو طاقت کا سرچشمہ قرار دیا۔

مغرب میں تو اس فلسفہ کے تحت صنعتی انقلاب آیا جس کے اثرات ہمارے ہاں بھی دیکھے گئے تو ہیں لیکن ابھی استقراری عمل کی رہنمائی کو قبول کرنے میں ہمارے ہاں مذہبی طاقتیں برسرِ پیکار ہیں۔ چونکہ راستے میں ترقی پسند قوتیں حائل ہیں اس لئے ان رجعت پسندوں کے عمل میں تشدد کی دو دھاری تلوار اب ننگی ہو کر سامنے آ گئی ہے۔ یہی حال کچھ ادب کا بھی ہے جہاں جدید ادب اپنی بھرپور توانائی کے تیسری دنیا کے خاک و خون میں لتھڑے انسانوں کا درماں ہے، وہیں سامراجیت اپنے جنگل کے قانون کو ہاتھ میں لئے ہمیشہ سے طاقت ور رہا۔ جدید افسانے کا مستقبل روشن ضرور ہے لیکن ہمارے ہاں اسکی رفتار اس وقت تک سست رہے گی جب تک سماج کے اندر تعلیم کے فقدان کو ایک توازن میں نہیں لایا جاتا اور فکری فہم کی راہیں تلاش نہیں کی جاتیں۔

اسی طرح مابعد جدیدت کو فلسفیانہ بنیادیں لیوتار نے فراہم کیں اس کے فلسفہ مابعد جدیدیت کے خدوخال اسکی کتاب 'دی پوسٹ ماڈرن کنڈیشنز' میں واضع ہو کر سامنے آئے۔ لیوتار کے اپنے قول کے مطابق اس کتاب کا مرکزی نقطہ مابعد جدیدیت یا انتہائی ترقی یافتہ معاشروں میں علم کی صورت حال ہے۔ اس نے بیسویں صدی کے اواخر میں واقع ہونے والی تبدیلیوں کے پسِ منظر میں عام طور پر پوسٹ انڈسٹریل سماج کو سامنے رکھ کر خیالات کا اتباع کیا ہے۔ لیوتار بحث کا آغاز مہابیانیہ کی موت سے کرتا ہے وہ کہتا ہے

''میں مابعد جدیدیت کو مہابیانیوں کے بارے بے اعتمادی کا نام دیتا ہوں''۔ مہابیانیہ سے مراد وہ مفروضہ سچائی ہے جسے کوئی بھی ثقافتی یا تہذیبی اکائی ناقابلِ تردید آفاقی حقیقت سمجھ کر برتر عقیدے کا درجہ دے دیتی ہے اور جب اس برتر عقیدے کو خطرے میں دیکھتی ہے تو جنگ و جدل پر اُتر آتی ہے۔ اس قسم کی مفروضہ سچائیاں بالعموم تہذیبوں کو معروضی جواز فراہم کرتی ہیں۔ سادہ زبان میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ مابعد جدیدیت مہابیانیہ پر بے یقینی اور بے اعتمادی کا نام ہے۔ اور حقیقت احوال بھی یہی ہے کہ ان مہا نظریات نے انسانیت کو مصائب کے سوا کچھ نہیں دیا۔ مابعد جدیدیت کے بنیادی دعوؤں کا خلاصہ یہ ہے کہ کوئی مہابیانیہ مقدس یا حتمی نہیں۔ مثالیت پسندی اور یوٹوبیائی فکر از کار رفتہ ہو چکی ہے۔ اجتماعیت اور مرکزیت کسی بھی طرح کی ہو فریب کاری کا سلسلہ ہے۔ سچائی متن کے اندر ہوتی ہے اور متن سے باہر کچھ بھی نہیں۔ کوئی حتمی صداقت نہیں اور نہ روحِ عصر۔ صرف کہانیاں ہیں جو سچائی کی جگہ بروئے کار آتی ہیں۔ اسی طرح حالات کے تقاضوں کے مطابق فیصلہ کرنا ہی دانش مندی ہے۔ گویا تمام فیصلے پراگمیٹک ہوں تو کام چلتا ہے۔''

ہاں البتہ جب ہم آفاقیت پر بات کرتے ہیں تو ایک پہلو ذہن میں رکھنا ضروری ہے کوئی بھی تحریر جسے ادیب اپنے قلم کی نوک سے اگلتا ہے وہ بے سروپا نہیں ہوتی۔ اسکا نظریاتی رجحان اسکے باطن کو نمایاں کر دیتا ہے اور پھر اسکے معنی اور مطالب میں ادب برائے زندگی کی اگر ہلکی سی رمق بھی ہوگی تو قاری کو نظر آ جائے گی۔ اس کے ساتھ ہی میں یہ بھی عرض کر دوں کہ آفاقیت ایک دلچسپ اصطلاح رہی ہے گو اسکی افادیت سے انکار نہیں لیکن کہانی کار کسی نہ کسی طور پر اس خطے کے جغرافیائی اور ثقافتی عہد سے ضرور جڑا ہوتا ہے جہاں کی وہ کہانی یا ادب تخلیق کر رہا ہوتا ہے اور اس کے خیالات نہ صرف علمیت کی بنیاد پر بلکہ فہم و ادراک کا احاطہ کرتے ہوئے تخلیق کو جنم دیتا ہے۔

یہ اسکے نظریات اور نقطۂ نظر کا ایک اکسیری نسخہ ہوتا ہے اسے اگر زمان و مکاں سے نکال دیا جائے اور اسکا اطلاق پوری عالمی معاشرے پر منطبق ہو جائے تو تخلیق افاقیت کا روپ دھار لیتی ہے۔ کوئی بھی ایسا ادب جو اپنے جوہر میں فطری اور کائناتی رنگ لئے ہوئے ہو اور زمان و مکاں سے آزاد ہو افاقیت کا حامل ادب کہلاتا ہے۔

ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے
اک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے

◂◂ ● ▸▸

8-Nayab Homes, Near NETSOL,
Airport Road Lahore Cantt. Pakistan

● اکرم پرویز

منٹو تعبیر اور نام نہاد ترقی پسندی

کیا منٹو کی تخلیقی روح کی دریافت ترقی پسند تحریک سے متعلقہ نام نہاد ترقی پسندی کی محتاج ہے؟ نام نہاد ترقی پسندی کی فکریات کے فریم ورک میں منٹو کے اجتہادی اسالیب کی تحدید ممکن ہے؟ یوں بھی جو تحریک اپنے اغراض و مقاصد کی تکمیل کے لیے تشکیل ہوئی ہو اسے کسی فن کار کے تخلیقی کرب سے کیا اُنس؟ جس تحریک کا منشور ہر نوع کے ادبی اقدار اور جمالیاتی معیار کی رد پر تعمیر کیا گیا ہو، اسے ادبی معاملات سے کیا غرض؟ منٹو کا تخلیقی سفر ایک مضطرب روح کا سفر ہے جسے برصغیر کی ثقافتی اور اخلاقی تفہیم میں امتیازی نشان کی حیثیت حاصل ہے۔.....منٹو اوڈیسی.....کو پارٹی لائن اور منشوراتی سیاق میں دریافت کرنا چہ معنی دارد؟

> The doctrine taugt that it was the writer's duty 'to provide a truthful, historico-concrete portrayal of reality in its revolutionary development', taking into account 'the problem of ideological transformation and the education of the workers in the spirit of socialism'. Literature must be tendentious, 'party-minded', optimistic and heroic; it should be infused with a 'revolutionary romanticism', portraying Soviet heroes and prefiguring the future.[1]

منٹو کے متعلق بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ بہ یک وقت اسے دو متضاد نظریات کا حامی قرار دیا گیا۔ اسے ترقی پسند سے ملقب اور رجعت پسندی سے مقرب قرار دینے کے پس پردہ سیاسی عوامل اور غیر ادبی رویے کارفرما تھے مگر ان سب کے مابین.....منٹو تعبیر.....کا حق ادا نہ ہو سکا۔ منٹو آج بھی اردو ناقدین کی گرفت سے باہر.....تنہا اپنی وجودی الجھنوں سے برسرِ پیکار ہے یا شاید اس نے خدا سے مباحثہ کا آغاز کر دیا ہے کہ دیکھتے ہیں فن افسانہ نگاری میں کون یکتا ہے؟.....یوں بھی اسے نام نہاد ترقی پسندوں کی کیا ضرورت کہ اُن کی ادبی بددیانتی جگ ظاہر ہے اور اس میں کسی نوع کا کوئی مبالغہ نہیں۔ اس حوالے سے دو باتوں کا

ذکر کیا جا سکتا ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ 'نیا ورق' کے شمارہ نمبر 40 میں احمد علی کا گوشہ شائع ہوا ہے۔ احمد علی وہی ہیں جنھوں نے 'انگارے' مرتب کی تھی اور یہ ترقی پسندوں کا ابتدائی عملی کارنامہ تھا۔ انہی احمد علی نے 'ہماری گلی' نام سے اردو کا ایک شاہکار افسانہ بھی تشکیل دیا ہے۔ لیکن بعد میں انھوں نے اردو پر انگریزی کو ترجیح دی اور یہی ان کا اوڑھنا بچھونا بنی۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ ترقی پسندوں کی ادبی بددیانتی اور ادب کی سیاسی تبلیغ سے نالاں تھے۔ یہ نام نہاد ترقی پسندوں کی انتہا پسندی ہی تو ہے کہ انھوں نے احمد علی جیسے خلاق ذہن کو بھی نہ بخشا۔ احمد علی نے خود لکھا ہے کہ۔

> ''1937 کا واقعہ ہے۔ ترقی پسند تحریک پر سجاد ظہیر اور محمود الظفر حاوی ہو گئے تھے۔ ان میں ڈاکٹر عبدالعلیم بھی شامل تھے۔ ان لوگوں نے ترقی پسند تحریک کو روس کی کمیونسٹ پارٹی کے مینی فیسٹو پر چلانا شروع کر دیا تھا۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی کے طور پر انہوں نے اعلان کیا کہ ترقی پسند تحریریں ہمیشہ مزدور اور کسان کی زندگیوں کے بارے میں ہوتی ہیں لہذا مزدور اور کسان کے مسائل اور موضوع سے ہٹ کر جو کچھ بھی لکھا جائے گا اسے ترقی پسندی قرار نہیں دیا جائے گا۔ میں نے اس اعلان پر شدت سے احتجاج کیا۔ میرا موقف یہ تھا کہ زندگی کے ہر پہلو میں ترقی پسندی موجود ہے۔ خیر یہ تنازعہ سال بھر چلتا رہا۔ ہمارے درمیان تصفیہ کرانے کے لئے لندن سے ملک راج آنند کو بھیجا گیا لیکن تصفیہ نہ ہو سکا اور میں تحریک سے بالکل الگ ہو گیا اور تبھی سے میں نے اردو چھوڑ کر انگریزی زبان میں لکھنا شروع کر دیا۔''[2]

Terry Eagleton کی کتاب سے مقتبس حصہ اور احمد علی کے بیانات کے مابین اشتراک کا پہلو، ملحوظ خاطر رہے۔ یوں احمد علی کے انکشاف سے ہندوستان میں ترقی پسندوں کی نام نہاد ترقی پسندی کا سیاسی اور خود غرضانہ کردار پوری طرح سے روشن ہو جاتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ترقی پسندوں کے ریاکارانہ رویئے کی ایک مثال آپ کو 'مقتل' میں ملے گی۔ یہ کتاب محض افسانوں پر ہی مشتمل نہیں ہے بلکہ اس میں اردو ادب کی نام نہاد ترقی پسندوں کے ریاکارانہ اور مکروہ رویئے کا..... جھٹکا..... بھی بڑے سلیقے سے کیا گیا ہے۔ اس حوالے سے سردار جعفری اور اشک کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ مین را کا..... دھڑن تختہ..... نہ صرف ان ادیبوں کی مریضانہ ذہنیت کو اجاگر کرتا ہے بلکہ پوری اردو بستی کے دوہرے چرتر کو بھی منکشف کرتا ہے۔ آپ اس پورے واقعے کی تفصیل 'مقتل' میں مین را جرنل کے تحت پڑھ سکتے ہیں۔ اس حوالے سے سردار جعفری والے واقعے کو مختصراً بیان کیا جاتا ہے۔ 'ہوا یوں کہ مین را کرکٹ میچ دیکھنے

کے لئے ممبئی گئے۔ ممبئی میں ہی سردار جعفری مقیم تھے اور اپنا رسالہ 'گفتگو' نکال رہے تھے۔ مین را سے حسن کمال نے کہا کہ 'گفتگو' کے لئے، افسانے کے نئے موڑ پر ایک مباحثہ ریکارڈ کیا جائے گا۔ جس میں بیدی (اتفاق سے بیدی کی جگہ مہندر ناتھ اس مباحثہ کے لئے تشریف لائے)، انور عظیم کے ساتھ آپ بھی شامل ہیں'۔ اسی مباحثے کے دوران میں مین را نے کہا کہ۔

> ''میں کرشن چندر کو کمرشیل رائٹر سمجھتا ہوں بلکہ نان رائٹر..... اور ثابت کر سکتا ہوں۔ یوں میری جڑیں کہاں ہیں، یہ جاننا مشکل ہے۔ ابھی میں اتنا ہی کہہ پایا تھا (میں فرش پر نظریں گاڑے بول رہا تھا اور سب توجہ سے سن رہے تھے۔ میں یہ محسوس کر رہا تھا) کہ مہندر ناتھ اُٹھ کھڑے ہوئے اور انھوں نے کہا: ...Bastard I will slap you۔ سب چکرا گئے۔ سب سے زیادہ پریشانی سردار جعفری کو ہوئی کہ ہم ان کے ہاں بیٹھے ہوئے تھے۔''[3]

مہندر ناتھ کو سردار جعفری نے الگ کمرے میں لے جا کر سمجھایا اور انھوں نے مین را سے معافی مانگ لی۔ اس واقعے نے مین را جیسے حساس شخص کو ہلا کر رکھ دیا۔

> ''میں غیر متوقع طور پر خاموش رہا۔ مجھے اتنا افسوس نہیں تھا جتنا تعجب۔ میں کرشن چندر کے بارے میں کچھ کہہ رہا تھا۔ ایک افسانہ نگار کے بارے میں، کسی کے بھائی کے بارے میں نہیں۔ اور سنا ہے مہندر ناتھ بھی افسانہ نگار ہیں، اس لئے مجھے اور بھی تعجب ہوا۔''[4]

ممبئی کے سفر کے دوران میں ہی، مین را نے اپنا افسانہ 'پورٹریٹ ان بلیک اینڈ بلڈ' تشکیل دیا اور اشاعت کی غرض سے سردار جعفری کو سونپا۔ انھوں نے اسے شائع کرنے کی یقین دہانی کی مگر 'گفتگو' میں اس کی اشاعت نہ ہو سکی۔ سردار جعفری نے اس کی وجہ بتائی کہ افسانہ مبہم ہے اور نہ صرف ان کے بلکہ کئی لوگوں کی فہم سے بھی بالا تر ہے لہذا وہ اسے شائع کرنے سے قاصر ہیں۔ مین را بھی فنکار تھے اور اپنے commited رویئے کے باعث سردار جعفری پر پل پڑے۔ ان کا افسانہ 'تحریک' (گوپال متل) میں شائع ہوا اور اردو دنیا اور نام نہاد ترقی پسندی کا مکروہ چہرا مشترکہ طور پر سامنے آیا۔ یہ محض تمہید ہے۔ مکمل کہانی کی تفہیم کے لئے 'مقتل' کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ یہ محض سردار جعفری کے Hybrid مزاج کو ہی نہیں اجاگر کرتا بلکہ ان جیسے دوسرے تمام ترقی پسندوں کی نام نہاد ترقی پسندی کا بھی اظہاریہ ہے۔ 'مقتل' میں مذکور اس واقعہ میں اردو لابی، سیاست اور مفاد پرستی کی ایک جدید کہانی مستتر ہے جو وابستگی اور مکھوٹا دھاری وابستگی کا تیاپانچہ

کرتی ہے۔ یوں اس جدید کہانی سے نام نہاد ترقی پسند تجارتی اور سیاسی ذہنیت کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔اسی سیاق میں منٹو کے تئیں سردار جعفری کا رویہ بھی ملاحظہ ہو، جسے خود مین رانے بھی کوٹ کیا ہے اور نام نہاد ترقی پسندوں کے ادبی Commitment کو بے نقاب کیا ہے۔

سردار جعفری نے منٹو کو ایک خط میں لکھا تھا۔

''میں تمھاری افسانہ نگاری پر ایک طویل مضمون لکھنے کا ارادہ کر رہا ہوں۔تم کو اب تک دقیانوسی قسم کے لوگوں نے صرف گالیاں ہی دی ہیں ان سے کسی اور چیز کی توقع بیکار تھی۔''5

اس خط کو نقل کرنے کے بعد مین رانے 'ترقی پسند ادب' کے کئی اقتباسات بھی نقل کئے ہیں۔ایک اقتباس یہاں بھی نقل کیا جاتا ہے تاکہ سردار جعفری کا دوہرا چرتر اجاگر ہو سکے۔

''وہ مزدوروں کی ذہنی سطح کی پستی کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے اور فن کی بلندی کو ثابت کرنے کی طرح طرح سے کوششیں کرتا ہے لیکن حقیقتاً وہ خود اس ذہنی سطح پر پہنچ گیا ہے جس کی پستی گندے نالوں اور چہ بچوں تک کو شرما دیتی ہے۔''6

یہ وہی سردار جعفری ہیں جو ترقی پسندوں کے Icon ہیں۔امسال ان کی صدی منائی جا رہی ہے۔انھیں خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے 'آج کل' کے اداریہ میں یہ ارشاد ہوا ہے کہ۔

''سردار جعفری ایک بڑے ادیب تو ہیں ہی لیکن اس سے زیادہ وہ ایک بڑے دانشور بھی ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ادیب تو کوئی بھی ہو سکتا ہے یا تھوڑی سی کوشش سے بن سکتا ہے لیکن دانشوری کسی کسی کے ہی حصے میں آتی ہے کہ دانشوری چیزے دیگر است۔''7

اس اقتباس کو مندرجہ بالا سطروں کے سیاق میں پڑھا جائے تو سردار جعفری کی دانشوری کے تمام کوائف کھل جاتے ہیں۔ رہا منٹو کے افسانوں کا ترقی پسند کردار تو اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ منٹو ترقی پسند تھا مگر اس کی ترقی پسندی مکھوٹا دھاری نہیں تھی اور نہ ہی عزیز احمد، سردار جعفری اور اشک کی طرح مصلحت سے پُر تھی۔ منٹو کے تعلق سے ترقی پسندوں کے تھنک ٹینک کا بھی رویہ جگ ظاہر ہے۔جس میں اشک اور عزیز احمد خصوصیت سے قابل ذکر ہیں نیز فیض ('ٹھنڈا گوشت' کے مقدمے کے حوالے سے فیض کا بیان) کا بھی ادبی Commitment مشتبہ ہے۔لیکن نام نہاد ترقی پسندی کے حوالے سے عزیز احمد اور اشک کا رویہ زیادہ متعصب ہے۔

منٹو نے 'ترقی پسند' کے عنوان سے ایک افسانہ تشکیل دیا ہے۔اس افسانے میں جوگندر سنگھ (بیدی) اور ہریندر ناتھ ترپاٹھی (دیویندر ستیارتھی) کے احوال و معمولات کو طنزیہ پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔اس افسانے میں نام نہاد ترقی پسندی کا مخول اُڑاتے ہوئے منٹو نے لکھا ہے کہ۔

ایک دفعہ جوگندر سنگھ ایک بہت بڑے افسانہ نگار کو چائے پلا کر فارغ ہوا اور اندر رسوئی میں آ کر بیٹھا تو امرت کور [جوگندر سنگھ کی بیوی] نے پوچھا۔

''یہ موئی ترقی پسندی کیا ہے؟''

جوگندر سنگھ نے پگڑی سمیت اپنے سر کو ایک خفیف سی جنبش دی اور کہا۔

''ترقی پسندی؟ اس کا مطلب تم فوراً ہی نہ سمجھ سکو گی۔ترقی پسند اس کو کہتے ہیں جو ترقی پسند کرے۔ یہ لفظ فارسی کا ہے۔انگریزی میں ترقی پسند کو ریڈیکل کہتے ہیں......وہ افسانہ نگار یعنی کہانیاں لکھنے والے جو افسانہ نگاری میں ترقی چاہتے ہیں، ان کو ترقی پسند افسانہ نگار کہتے ہیں۔''8

یہاں محض نام نہاد ترقی پسندی کو ہی نشانہ نہیں بنایا گیا ہے بلکہ اس اقتباس کے تناظر میں احمد علی اور مین را والے واقعے سے سجاد ظہیر، سردار جعفری اور ان کے متبعین کی ترقی پسندی کے معانی و مطالب بھی واضح ہو جاتے ہیں۔اس افسانے کی بھی ایک کہانی ہے۔اس کہانی کی تفہیم کی رو سے مناسب ہے کہ 'مقتل' اور عبدالسمیع کا مضمون 'منٹو اور ستیارتھی' (مشمولہ دنیازاد شمارہ 38 اور ایوان اردو فروری 2013) کا مطالعہ کیا جائے تاکہ اس کے مختلف ابعاد اپنے پورے سیاق و سباق میں پوری طرح سے روشن ہو سکیں۔ترقی پسندی کے جس رویئے کو اس اقتباس میں منٹو اُجاگر کرتا ہے اسے ہی سلیم احمد نے سطحیت سے تعبیر کیا ہے۔ یہاں منٹو کے طنزیہ رویئے کا تعلق بیدی اور ستیارتھی کے کردار کو مسخ کرنے سے نہیں ہے بلکہ اس کا فکری موقف نام نہاد ترقی پسندی کی شرح سے مخصوص ہے۔منٹو ایک Genuine فنکار تھا (مگر آج ہر کوئی Genuine فنکار ہے؟) لہذا یہ ممکن ہی نہیں کہ ترقی پسند تحریک سے منسلک نام نہاد ترقی پسندوں کے سیاسی اور ذاتی مفادات اس کی نظروں سے پوشیدہ ہوں۔ یوں اس نے ترقی پسندی کے منفی پہلو اور اس کی سطحیت کو اجاگر کرنے کی غرض سے 'ترقی پسند' تشکیل دیا۔ممکن ہے کہ متن کو طنز سے چوکھا کرنے کے لئے اس نے اپنے ہمعصروں کو اس کا کردار بھی بنایا ہو۔ چونکہ بیدی ترقی پسندوں کے نزدیک افسانے کے سرخیل ہیں غالباً اسی باعث منٹو نے بیدی کو اس متن میں بطور کردار پیش کیا ہے تاکہ نام نہاد ترقی پسندی کا دھڑن تختہ کیا جا سکے اور ترقی پسندوں کی انا کو بھی مجروح کیا جا سکے۔ بیدی کی ذاتی واردات کو نشانہ بنانے کے تعلق سے متن میں

کہیں بھی کسی نوع کا اشارہ نہیں ہے اور نہ ہی منٹو کے رویئے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بیدی اور ستیارتھی کے کردار کو مسخ کیا جا رہا ہے۔ یہ تمام کھڑاگ اشک اور ان جیسے دوسرے نام نہاد ترقی پسندوں کا پھیلایا ہوا ہے۔ اس کے علی الرغم 'نئے دیوتا' کا متعصب کردار متن میں پوری طرح سے تحلیل ہے۔ یوں بھی 'نئے دیوتا' کی قرأت ستیارتھی اور بیدی کی ملی بھگت کو ظاہر کر دیتی ہے۔ جو افسانے سے بڑھ کر منٹو پر ذاتی حملے کی نوعیت رکھتا ہے۔ اس حوالے سے مین را نے لکھا ہے۔

''میں ان [ستیارتھی] کی بات مان لیتا ہوں کہ نئے دیوتا، ترقی پسندی کا ردعمل نہیں تھی۔ منٹو ہی کی طرح انھوں نے اپنے قریب سے خام مواد چنا تھا اور کہانی لکھی تھی۔ اب اس کا کیا کیا جائے کہ نئے دیوتا اور اوپندر ناتھ اشک کے ہنگامہ خیز مضمون منٹو میرا دشمن کی طرح ایک منصوبہ بند تحریر نظر آتی ہے۔''9

ترقی پسند تحریک کا کردار.....زیوس .....کے نیچر سے مشابہ ہے لیکن شاید ان نام نہاد ترقی پسندوں کو معلوم نہیں کہ..... ایتھنا.....زیوس کے سر سے ہی برآمد ہوئی تھی جیسے منٹو نے ان نام نہاد ترقی پسندوں کا سر پھاڑ کر جنم لیا ہے۔ اصل میں اردو افسانے میں منٹو کی حیثیت ایک علامت کی سی ہے اور نام نہاد ترقی پسندوں کی تفہیم یوں بھی مبہم چیزوں کے تئیں مشکوک ہے مثلاً میراجی، لہذا منٹو ان کی گرفت سے باہر کی چیز ہے۔ یوں اگر متن آڈیولوجیکل تشکیل ہے تو بھی منٹو کے فن کی تعبیر کسی نام نہاد ترقی پسندی کا حوالہ نہیں مانگتی۔ منٹو کی تفہیم کے اصول اس کے اپنے متون میں مستتر ہیں اور اگر علمیات و فکریات کی اساس پر منٹو کے فن سے معاملہ کیا جائے تو کیا ضروری ہے کہ عمرانیات اور مارکسی فکریات کے ہی ٹولز کا سہارا لیا جائے؟ مناسب تو یہ ہے کہ نفسیات، اسطور اور نئی تاریخیت کے حوالے سے منٹو کو پڑھا جائے کہ اِس سے اُس کے فن کے مختلف کوائف بھی اجاگر ہوں گے اور معاصر عہد میں اس کی معنویت بھی روشن ہوگی۔

آج ترقی پسند، منٹو کو ترقی پسند تحریک کا Icon ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ اردو کے قاری کو اس پر کوئی اعتراض نہیں مگر ترقی پسندوں کو منٹو سے اتنی ہی محبت اور ذہنی رفاقت ہے تو وہ پہلے سردار جعفری، عزیز احمد اور اشک کے رویوں کو پوری صداقت کے ساتھ منصۂ شہود پر لائیں اور ان کی نام نہاد ترقی پسندی کا دھڑن تختہ کریں اگر وہ یہ کام انجام دے سکتے ہیں تو پھر انھیں منٹو کے فن پر کلام کرنے کا حق ہے کہ ادب کی اخلاقیات اسی نوع کے رویئے کی متقاضی ہے۔ آج تک ترقی پسندی کا دوہرا چرتر منٹو کے فن کا تو کچھ نہ بگاڑ سکا اور نہ ہی بگاڑ سکے گا الٹا انھیں ہی لے ڈوبے گا جو کل زیوس تھے اور آج..... پرومیتھیس..... بنے بیٹھے ہیں لیکن ملحوظ خاطر رہے کہ پرومیتھیس کے اوپر مسلط ہونے والا.....گدھ.....آج

کے قاری کا سمبل ہے۔ منٹو نے جو پیشین گوئی کی تھی آج اس کی صداقت سے انکار ممکن ہے؟

''اگر میری موت کے بعد میری تحریروں پر ریڈیو اور لائبریری کے دروازے کھول دیئے گئے اور میرے افسانوں کو وہی رتبہ دیا گیا جو اقبال مرحوم کے شعروں کو دیا جا رہا ہے۔ تو میری روح سخت بے چین ہوگی میں اس بے چینی کے پیش نظر اس سلوک سے بے حد مطمئن ہوں جواب تک مجھ سے روا رکھا گیا ہے۔ خدا مجھے اس دیمک سے محفوظ رکھے جو قبر میں میری سوکھی ہڈیاں چاٹے گی۔''10

آمین! ثم آمین!!

حواشی:

1-Eagleton,Terry: Marxism and Literary Criticism, Routledge Classics, Indian Edition 2012, P:36

2۔ مسعود، طاہر: انٹرویو: احمد علی مشمولہ نیا ورق، ممبئی: شمارہ نمبر 40، ص:49

3۔ مین را، بلراج: مقتل، نئی دہلی: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، 2007، ص:322

4۔ مین را، بلراج: مقتل، ص:322

5۔ بحوالہ مین را، بلراج: مقتل، ص:327

6۔ بحوالہ مین را، بلراج: مقتل، ص:327

7۔ رحمانی، ابرار: اداریہ مشمولہ آج کل، نئی دہلی: نومبر 2013، ص:2

8۔ منٹو، سعادت حسن: کلیات منٹو (جلد اول) تحقیق، تدوین، ترتیب: شمس الحق عثمانی، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، 2006، ص:470

9۔ مین را، بلراج: مقتل، ص:388

10۔ عثمانی، شمس الحق (مرتب): منٹو بقلم خود (ایک اسمبلاژ) مشمولہ فکر و تحقیق، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، 2012، ص:377

◂◂ ● ▸▸

,Room No.142 , Satluj Hostel,JNU
New Delhi-110067
+91 9868323179

● عبد الوهاب قاسمی

انسانیت کی ترفیع وتمجید کا شاعر: فہیم جوگاپوری

آج برقیاتی ابلاغ نے جہاں آگہی کے باب روشن کئے ہیں، وہیں ذہنی وروحانی فضا کے ساتھ تخیل کے چمن کو بھی اداس کردیا ہے۔ چنانچہ ایسے منطقے، تحیرات، عجائبات اور طلسمات جن پر حقائق بھی دیدۂ حیراں ہو.....تخیل کی گرفت سے باہر ہوتا جارہا ہے، جبکہ اہل بصیرت سے یہ امر پوشیدہ نہیں کہ قیمت تخیل کی زیادہ.....اور آگہی کی کم ہے۔

ان حالات میں اگر کوئی تخیل کے چراغ سے حرف وسخن میں معنوی کائنات روشن کرتا ہے اور تحیرات کی بجلیاں پیدا کرتا ہے، تو وہ قابل قدر بھی ہے اور لائق ستائش بھی۔ فہیم جوگاپوری ان شاعروں میں ہیں جنھوں نے اپنے تخیلی وفور سے اپنی شاعری کو جلا بخشی ہے، اپنے خیالات، مشاہدات، تجربات اور جذبات کے اظہار میں جدت وندرت سے کام لیا ہے، انکی تخلیقی شخصیت میں انکے وجود کی مرتعش لہروں کا حسین امتزاج ہے، انکے داخلی و باطنی اضطراب میں ہم آہنگی ملتی ہے اور مسرت کے ساتھ حیرت واستعجاب کی کیفیت کے چراغ بھی منور ہیں۔

فہیم جوگاپوری کی غزلیہ شاعری زندہ احساس اور بیدار ضمیر کی شاعری ہے، عہد حاضر کے المیہ کے خلاف بغاوت کی شاعری ہے، آج کے تناؤ، تصادم اور کشمکش کے حسین اظہار کی شاعری ہے، انکے اشعار سے انکی تخلیقی بلند پروازی اور اظہاری لطافت کا پتہ چلتا ہے، عصری واردات وحادثات اور انسانی استبداد واستحصال کا انہیں بخوبی عرفان ہے، انکے ہاں لفظوں کی نشست و برخاست سے، اسکے توازن اور تناسب سے وہ صورت معانی ابھرتی ہے جو دلوں میں نئے جذبے، نئی سرشاری اور نئے ولولوں کو جنم دیتی ہے اور سینہ کی دھڑکنوں کو جگاتی ہے۔ بعض ایسی ترکیبیں بھی انکے ہاں ملتی ہیں جو انکے فنکارانہ جوہر کا ثبوت پیش کرتی ہیں، جن میں معنوی ابعاد روشن ہیں۔ انکے بہت سے اشعار سامنے کے معلوم ہوتے ہیں .....مگر بنظر غائر دیکھنے سے نئی تصویر و نئی تعبیر سامنے آتی ہے اور قاری انبساط کی لہروں میں ڈوب جاتا ہے۔ انکی شاعری میں نہ زیادہ بارش ہے اور نہ زیادہ دھوپ، بلکہ سمندر کی طرح انکے ذہن کی لہریں مضطرب وبیکل ہیں، حزنیہ لے اور طربیہ آہنگ بھی ہے، چاند کی دلکشی اور نانسری کی مدھر آواز بھی ہے، پریم کی خوشبو اور درد کے پھول بھی

ہیں، خواب کے رنگین ساحل اور اداس راتوں کی شکستگی بھی ہے، صبح نو کی بشارت اور حسین مستقبل کی نوید بھی ہے، دنیا کی بے ضمیری اور مفلس کے کراہتے لمحوں کا دردانگیز اظہار بھی ہے، رجائیت کی کرن اور عزم محکم کا سورج بھی ہے اور انسانی وجود کے آہنگ سے آشنائی بھی .....جن سے فہیم جوگاپوری کے تخلیقی کینوس کی وسعت کا عرفان ہوتا ہے۔ ایسے چند اشعار جو ہمیں متوجہ کرتے ہیں ملاحظہ ہوں ؎

یہ تو اچھا ہوا بادل نے ہمیں روک لیا — ورنہ نکلے تھے سمندر جو جلانے ہم بھی

اگر ہو ظرف سے خالی تو کیا رکھا ہے دریا میں — سمندر کو بھی میں نے ڈوبتے دیکھا ہے قطرہ میں

خنجر پہ تجھ کو ناز تو سر پر مجھے غرور — میں سر اٹھا رہا ہوں تو خنجر اٹھا کے دیکھ

بہت رقم ہوئے ذکر تبسم جاناں — کسی غریب کے آنسو کا اب حساب لکھو!

کسی کی آنکھ میں لوبان جل رہا ہوگا — یہی سبب ہے جو میرے سفر میں ہے خوشبو

سمندر کو جلانا، قطرہ میں سمندر کا ڈوب جانا، خنجر کے سامنے سر اٹھانے کی جرأت، تبسم جاناں کے مدہوشوں کو غریب کے آنسوؤں کی ترقیم کا پیغام دینا اور مشکلات سفر میں کسی کی آنکھ میں جلتے لوبان کی خوشبو کا احساس طلسماتی کیفیت کے ساتھ قاری کو اپنی جانب متوجہ کرنے میں کامیاب ہے۔

فہیم جوگاپوری کے ہاں ہمیں ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جن میں طرفگی ہے، نیا پن ہے، نئے آہنگ اور نئے لہجے ہیں، تخیل کی نئی زمین اور نئے آسمان ہیں ؎

ہجر کے درد بھی آنسو بھی، ہے تنہائی بھی — ترے جاتے ہی مرے چاہنے والے آئے

تا کہ زحمت نہ بنے اسکو اسیری اپنی — خود سے ہم پاؤں میں زنجیر کو ڈالے آئے

دعائیں مانگ رہے ہیں کئی خیال ابھی — خدا کے گھر سے فرشتوں کو مت نکال ابھی

پہلے شعر میں باتیں وہی ہیں جو مشترک ہیں .....ہجر کی آہیں، ہجر کے آنسو اور ہجر کی داستان المناک.....مگر فہیم جوگاپوری نے درد، آنسو اور تنہائی کو محبّ کا پیکر عطا کر کے ہجر کے درد والم کو نئے اظہار کی رعنائی بخشی ہے۔ دوسرے شعر میں بھی عجب لطافت ہے.....عموماً زنجیر قیدی واسیری کا اشاریہ ہوتی ہے، مگر فہیم کی جدت طبع نے زنجیر کو ہی قیدی کا عنوان بنادیا ہے۔ یہ شعر دیکھئے ؎

ٹہل جو کر دے وہ روبوٹ چاہتی ہے فہیم
یہ گڑیا مٹی کے گڈے سے کب بہلتی ہے

پہلی نظر اس شعر پر ڈالئے تو 'روبوٹ، گڑیا اور گڈے کی تثلیث' عام فہم اور روزمرہ کے کھلونے کی حیثیت سے سامنے آتی ہے.....مگر ذرا ٹھہر کر اس شعر کو پڑھئے اور 'ٹہل جو کر دے' پر نگاہ کو مرکوز کیجئے تو یہ شعر

عصر حاضر کے انسانوں کی تساہلی اور مشینی مزاج کو آئینہ عطا کرتا ہے۔

فہیم جوگاپوری کے ہاں حیات انسانی کے نشیب و فراز کا عمیق مشاہدہ ملتا ہے، انہوں نے اس کے سربستہ رازوں کا انکشاف کیا ہے اور علاماتی پیکر کے ذریعے اسکی کامیاب ترسیل کی ہے، جس میں سادگی، سلاست، روانی اور پرکاری کے ساتھ ساتھ تہہ داری کے زاویئے روشن ہیں۔ انکی شاعری کا اغلب حصہ انسان اور انسانیت کا محور ہے۔ کہیں انسانی عظمت و رفعت کی ثناخوانی ہے تو کہیں انسان کی انسانیت کے بحران، المیے اور وقوعے پر شاعر ماتم کناں ہے انسان کے سربستہ رازوں تک کی رسائی کے لئے یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

سطح پر تو بلبلے سے بھی ہے کمتر آدمی — ڈوبے تو ہے سمندر کا سمندر آدمی
جلوہ گر ہر اک ذرے میں ہے ڈھل کر آدمی — شعلہ، شبنم، پھول، خوشبو، خاک، پتھر آدمی
زندگی تو رقص کرتی روح سے تعبیر ہے — رونہ یہ مٹی کا ہے بے جان پیکر آدمی

ان اشعار میں انسانی حقائق کی تہیں اپنی پرتیں کھول رہی ہیں،..... بلبلے کی تشبیہ کے بعد سمندر کا استعارہ حیات انسانی سے کس قدر مماثل ہے اور کیا خوب ہے!! ایک ہی شعر میں انسانی کردار کے دو متضاد پہلوؤں کو سمیٹ کر نثریت کو شعریت کا لباس عطا کر دیا ہے۔..... آدمی کے کردار پر نظر ڈالیں تو وہ کبھی شعلہ ہے، کبھی شبنم، کبھی پھول ہے، کبھی کانٹا، کبھی خوشبو ہے، کبھی مہک، کبھی خاک ہے، کبھی پتھر، صبح تا شام انسان کے ان پہلوؤں کا چراغ روشن ہے،..... ظلم و بربریت، بغض، کینہ، حسد، نفرت، عداوت، خوف، ہراس، دہشت، سراسیمگی، ناکامی، بدنامی، رسوائی..... اسی طرح عدل، انصاف، مساوات، حقوق کی رعایت، انسانیت نوازی، خوش خلقی، خوش مزاجی، اعلیٰ کردار اور راہ حق کا جویا ہونا بھی انسانی خمیر کا ناگزیر حصہ ہے، اول الذکر صفات کے متحمل انسانوں کے لئے نہ کوئی نوید ہے اور نہ ہی کوئی خوشخبری، وہ انسانیت کے لئے کلنک ہیں، مگر ثانی الذکر اوصاف کے حامل کے لئے فہیم جوگاپوری یہ بشارت ضرور سناتے ہیں۔

بہر حق راہ طلب میں یہ بھی ہوتا ہے فہیم — تا قیامت زندہ ہو جاتا ہے مر کر آدمی

فہیم جوگاپوری کے ہاں تلمیح کا چراغ بھی روشن ہے، تاریخ کے ایسے ابواب جن سے ارتقائے انسانی کا رشتہ استوار ہے، فہیم کی نگاہوں میں روشن ہیں اور انہوں نے قدیم تلمیحات کو نئے منظرنامے سے مربوط کر دیا ہے۔

ہے قرض دار میرے لہو کا ہر ایک پھول — رونق ملی ہے مجھ سے چمن کی بہار کو
پرانی قبر سے لپٹا ہوا ہے پاگلوں کی طرح — یہ کون شخص ہے مٹتی ہوئی لکیر کے ساتھ
ہم فقیروں نے کبھی بیچا نہیں اپنا ضمیر — درہم و دینار سے دستار کا سودا نہ کر

جس نے چھپا کے بھوک کو پتھر میں رکھ لیا — دنیا کو اس فقیر نے ٹھوکر میں رکھ لیا

تاریخ کے صفحات ایسے واقعات سے لبریز ہیں اور ایسے ایسے فقیروں کے تذکرے سے معمور ہیں جنکی نگاہوں میں یہ دنیا، دلکش و رنگین جہاں محض دھوکہ، سراب اور پامال تھا۔ اسکے پجاری، دیوانے اور ہوس کے بندے اپنی تمام تر جستجو، سعی اور تگ و دو کے باوجود اسکے حصول میں نامراد ثابت ہوئے۔ جن کی خواہش ادھوری، خوابوں کی تعبیر نشنہ اور ارمانوں کی دنیا لب گور تک پہونچ کر بھی سوگوار اور اداس رہی مگر اسی دنیا نے فقیروں کی تحقیر کے باوجود ان کی ایسی توقیر کی کہ خود کو ان کے قدموں پر نچھاور کر دیا، وہ اسکو پامال کرتے رہے، یہ ان پر نہال ہوتی رہی، یہ ایک اہم راز ہے، جس تک دنیا کے حریصوں کو پہنچانے کیلئے فہیم نے اپنے تخیل کو تیر کی زبان دی ہے۔ کتنے شاعروں نے اس فکر کی ترسیل کی ہے، مگر فہیم کی ترسیل کا انداز نرالا، جدا، نیا، اپنا اور خالص..... اپنا ہے، یہاں انہوں نے لفظوں کی نشست و برخاست سے جو فضا تشکیل کی ہے وہ شگفتہ بھی ہے اور معنی آفریں بھی..... ورنہ ظرف مظروف نہ بنتا۔

انسانی جمود، تعطل، بے حسی اور بے ضمیری، عیاری اور مفاد پرستی کی اس فضا میں جو جبس ہے اور جو اُمس ہے وہ یقیناً ایک زندہ دل، حساس اور شگفتہ مزاج فنکاروں کے لئے باعث حزن و ملال ہے، یہی ملال اور یہی حزن شعری آہنگ میں ڈھل کر تاثیریت کی لے بڑھاتی ہے، فہیم نے آج کے اس منظرنامے کا اپنے تخلیقی نظام سے رشتگی قائم کر کے عصری عرفان کا احساس دلایا ہے، انکی نظروں میں کائنات کے تضادات ہیں، انسانوں کے ہجوم مسائل ہیں، دنیا کی لاسمتی ہے، ذہن انسانی کا المیہ ہے، جدید انسان کا کرب و الم ہے، سسکیاں ہیں، آہیں ہیں، ماتھے پہ شکن، آنکھوں میں اداسی ہے، لہو کے دھارے ہیں، مفلسی کی آگ ہے، رشتوں کی پامالی ہے، اقدار کا خون ہے، اپنوں کی داستان اجنبیت ہے..... وہی اجنبیت جو لفظ 'شہر' میں مضمر ہے، جہاں بھیڑ میں تنہائی کا عالم ہے اور انسانی رشتوں کی حدت و حرارت کا فقدان ہے، جس پر شاعر کا دل مثل موج لرزاں ہے۔

خود کو سمجھاتے ہوئے شہر سے یوں لوٹے ہیں — جیسے پردیس کوئی گھر سے کمانے نکلے
یہ سوچ کر اس راہ میں ہم ہو گئے تنہا — اس بھیڑ میں اپنا کوئی چہرہ ہی نہیں تھا
ہمارے قتل پہ چپ تھی یہ سوچ کر دنیا — لہو ہمارا نہیں ہے تو ہم بچائیں کیا
ہر زمانے میں خوشامد نے صدارت کی ہے — کامراں ہوتا رہا ہے یہ ہنر صدیوں سے
ماتھے پہ شکن آنکھوں میں جنگل کی اداسی — دیکھو تو ذرا عہد یہ میرا تو نہیں ہے
کل جو گلے ملتے تھے مجھ سے کل جو مجھے پہچانتے تھے — آج مسافر جان کے کیسے رستے وہ انجان ہوئے

کانوں کا یہ قصور ہے کہ بے حسی فہیم
کیوں زخمیوں کی چیخ نہ سن پا رہا ہوں میں

چاہے سیلاب بلا گھیر لے آ کر مجھکو
میرے بھائی کا نہیں خون ابلنے والا

آخری شعر کی سچائی سے بہت حد تک اتفاق ناگزیر ہے۔

فہیم کے ہاں طنزیہ لہجے کا تیکھا پن بھی ہے ،جس کا نشانہ سیاسی سماجی نظام ہے ،معاشرتی مکروہات ومفسدات ہیں ،مگر انکے اس لہجے میں تہذیبی ،شائستگی اور سلیقگی کا پہلو روشن ہے ، کیونکہ انکا مقصد تذلیل وتضحیک نہیں بلکہ انسانیت کی ترفیع وتمجید ہے،مقصدیت اور ایقاظی عنصر کو نمایاں کرنا ہے،جس کی کسک قاری اپنے باطن میں محسوس کرتا ہے، جو اسکے احساس کو بیدار اور ضمیر کو جھنجھوڑتا ہے۔

نہ حیثیت ملی دریا کو جب برابر کی
برائیاں وہ گنانے لگا سمندر کی

مزاروں پر چلو مل جا ئیگا وہ
خدا کی راہ کا یہ شارٹ کٹ ہے

چرا لی ہے کسی نے نیند میری
فہیم ان کی بھی تھانے میں رپٹ ہے

وہ میری ٹوٹی چٹائی پہ ہنس رہا ہے فہیم
جو تاجدار ہوا بیٹھ کے فقیر کے ساتھ

آپ کے سر پہ جو تاج حشم رکھا ہے
ہم فقیروں نے اسے زیر قدم رکھا ہے

لے اڑی شوخ ہوا تن سے قبائے نازک
ورنہ خوشبو نے کسی پھول کو عریاں نہ کیا

ہواؤں کی ٹھوکروں سے انتشار خوشبو ضرور ہوتا ہے،مگر پتیاں خوشبوؤں سے معطر رہتی ہیں ،یہی ہوائیں جب شوخی پر اتر آتی ہیں تو قبائے نازک کو تار تار کر دیتی ہیں ، جہاں جسم عریاں اور بے نور رہ جاتا ہے ،ایسی ہواؤں پر فریفتگی کے بجائے احتراز ہی انسانی فطرت کا اشاریہ ہے ،شاعر کا مطمح نظر مغربی ہوا ہے ،مغربی طوفان ہے ،مغربی عریانیت کی کورانہ تقلید اور انسان کا اپنی فطرت سے بغاوت وانحراف ہے، یہ سارے مفہوم 'قبائے نازک' سے عیاں ہیں۔

انسانی حیات سے جڑے درد والم اور بہجت وسرور کی کیفیت کو بھی فہیم نے اپنی تخلیقی کائنات کا حصہ بنایا ہے، جس میں نئی روئیدگی ، ازخود رفتگی اور ربودگی ملتی ہے، ان دونوں کیفیتوں کے اظہار سے ہمیں فہیم کے ان جذبات واحساسات تک رسائی نصیب ہوتی ہے، جو ان پر طاری ہوئے ہیں ،جن کی شدت کو انھوں نے محسوس کیا ہے، جن میں جوش وخروش ہے، گرمی اور حدت ہے، تاثیری اور تقلیبی قوت ہے، یہاں ان کے فنی شعور کی بالیدگی اور حس کی تیزی کا احساس ہوتا ہے۔ ان کے ہاں نہ صرف درد ہی درد ہے کہ خوشیوں اور شادکامیوں کا گذر نہیں ، بلکہ دونوں کی آمیزش سے ان کی غزلیں مملو ہیں۔

فہیم جوگا پوری کا تخلیقی وجود احساس کی جمالیاتی کرنوں سے منور ہے ، انکے خیال کے آنگن میں

جمال فطرت کے شجر کی نمود ہے ، بہاروں کی رعنائیاں ،ہنستی اور مسکراتی کلیاں ، چمکتے جگنو، سورج ،کرن، چاند، ستارے ، نغمہ بلبل، آسمان ، بادل ، دریا، سمندر، چمن ، بادصبا ،شاخ گل ، پہاڑ اور آبشار کے حسن و جمال نے انہیں متاثر کیا ہے ،ان کے شعری پیکر تراشی میں فطرت سے جڑے الفاظ کے استعمال میں سلیقگی کے ساتھ نئے نقوش اور نئے روپ ملتے ہیں ۔لغوی معنوں سے ہٹ کر نئے جہان معنی سے ہمیں روشناس کراتے ہیں ، دلکش اسالیب اور حسین لہجے کے ساتھ ان کے اشعار دل میں اترتے محسوس ہوتے ہیں۔

فہیم جوگا پوری اس امر سے بخوبی واقف ہیں کہ نا دیدہ خیال کی خوشبو سے الفاظ کے پیکر کو معطر کرنا ہے جو قاری کے مشام جان کو نئی توانائی ، نئی تازگی اور بے تاب روح کو قرار عطا کرے ، اسلئے وہ لفظوں کے استعمال میں جذبے کی داخلیت کے ساتھ ساتھ لفظوں کی داخلیت کا خیال کھتے ہیں ، انکے ہاں لسانیاتی سطح پر ژولیدگی اور بورژوائیت نہیں ملتی ، بے رنگی ، خشکی اور بدمزگی کے بجائے شادابی اور شگفتگی ملتی ہے، تصدیق کے لئے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

لب پہ صحرا دے گیا آنکھوں میں پانی دے گیا
وہ ستمگر تھا ستم ہی کی کہانی دے گیا

اداس رات کے آنگن میں درد کی دیوی
بڑے ہی چاؤ سے زلفیں سنوارے شام کے بعد

کیا کبھی شمع فروزاں سے کسی نے پوچھا
کیسے اک صبح کا دیدار کیا ہے اسنے

صبح دم اتنی کشش گل میں کہاں سے آئی
رائیگاں جاتے نہیں رات کے آنسو لکھنا

شادمانی کے حسیں موسم کے بعد
درد کا ساون بھی آنا چاہئے

جم کے رہتا ہے شب و روز جہاں ابر نشاط
غم کا ساون بھی وہاں خوب برستا ہوگا

ابر نشاط کے بعد غم کی برسات اور شادمانی کے حسین لمحوں میں درد کی آہٹ کا سن لینا فہیم کی قوت مشاہدہ کی حسین دلیل ہے ، کیونکہ اس صداقت سے کسے انکار ہوسکتا ہے کہ 'جہاں بجتی ہے شہنائی وہاں ماتم بھی ہوتا ہے۔' ان اشعار میں بانکپن ہے ، معصومیت ہے ، حسن کے جلوے ہیں ، درد بھی ہے ، نشاط وسرور بھی ہے ، لفظوں کی ادائیں اور نزاکتیں بھی ہیں ، جو قاری کی حسیاتی اور جمالیاتی تسکین عطا کرتی ہیں۔

انکے دو شعری مجموعے 'نوید سحر' اور 'ادھوری بات' ان کی تخلیقی تابندگی ، رخشندگی اور تخئیلی تابناکی کے گواہ ہیں ،جن کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان کے ہاں ایسی بہت سی غزلیں ہیں جن میں شعری تڑپ اور شعری تجلیاں موجود ہیں ، نئے نئے تجربات اور فکری تنوعات ہیں ۔ان کی شاعری نئی تعبیر و تفہیم کے ساتھ سماج سے مکالمہ کرتی ہے اسلئے ہر دور اور ہر عہد میں اسکی معنویت باقی رہے گی ، کھلی فضا اور کھلے ماحول کی اس شاعری میں کسی مخصوص گروہ اور مخصوص دبستان کی ترجمانی نہیں بلکہ اس المیے کا بیان ہے جو ہماری معاشرت سے متصادم ہیں۔

سیوان کے شعری منظرنامے پر فہیم جوگاپوری کا ادبی قد اپنے ہم عصروں میں یقیناً بہت نمایاں اور ممتاز رہے، ہندوستان کے مقتدر ادبی رسالوں میں مسلسل اشاعت سے انکی ادبی شخصیت کا تعارف محتاج بیاں نہیں، یہ ان کے ارتکاز و انہماک، صبر وضبط، فنی اسرار ورموز کے عرفان، شہرت سے گریز پائی، ادبی خلوص اور مسلسل ریاضت ومحنت کا ثمرہ ہے، وقت کے مایہ ناز شاعر وادیب اور محقق ونقاد ڈاکٹر ظفر کمالی کا یہ اعتراف بجا ہے کہ۔

''فہیم جوگاپوری سے ذاتی واقفیت کی بنیاد پر میں کہہ سکتا ہوں کہ شہرت کے معاملے میں وہ اُتاولے پن کا شکار نہیں، وہ صبر وضبط سے کام لیتے ہوئے فنی رموز ونکات پر توجہ صرف کرتے ہیں، اُنھیں جذبات واحساسات کو فن کے سانچے میں ڈھالنے کا ہنر آتا ہے۔ وہ معلوم سے نامعلوم منزلوں کا سفر طے کرنے کا سلیقہ رکھتے ہیں۔'' (نوید سحر صفحہ ۱۷)

اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ فہیم کی یہ شاعری انھیں ہمیشہ زندہ رکھے گی کہ انھوں نے خون جگر جلا کے اپنی شعری کائنات کو دائمی رعنائی عطا کی ہے۔

◀◀ ● ▶▶

Al-Falah Islamic Model School,
Islamia Nagar,Siwn(Bihar)
+91-7631677978

جب ہرنی کے پیچھے جنگلی کتے یا بھیڑیے لگ جاتے ہیں اور یہ ہر طرف سے ان میں گھر جاتی ہے تو یہ ان کی طرف منہ کر کے ایک چیخ مارتی ہے۔ یہ چیخ اس قدر پرسوز ہوتی ہے کہ کتوں کے بڑھتے ہوئے قدم رک جاتے ہیں اور وہ ایک لمحے کے لئے بھول جاتے ہیں کہ ان کا مقصد کیا ہے۔ پس اسی لمحے کا فائدہ اٹھا کر ہرنی بھاگ جاتی ہے۔ شاعر حضرات ہرنی کی اس چیخ کو 'غزل' کہتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ غزل میں بھی ہرنی کا وہ سوز وگداز اور رحم کی اپیل ہوتی ہے جو کہ پتھر دل شخص کے دل کو بھی موم کر دیتی ہے۔ جب ہرنی کا بچہ شکاری چھین لیتے ہیں یا کوئی درندہ اس کو کھا لیتا ہے تو ہرنی کے دل پر سیاہ رنگ کا ایک داغ پڑ جاتا ہے۔ اس داغ کو شاعر لوگ 'نقش سویدا' کہتے ہیں۔ اور جب یہ ہرنی کبھی شکار ہو جاتی ہے اور شکاری اس کا دل نکال کر دیکھتے ہیں تو یہ دل پر پڑے داغوں کو گن کر اس کے دکھوں کی ساری تاریخ جان لیتے ہیں۔

(اقتباس از جاوید چوہدری کالم 'جنگل کی زندگی سے پرے')

● یاد رفتگاں
● احمد سہیل

اردو تنقید کی نئی بازیافت: وارث علوی

مارچ ۲۰۱۳ء کی ایک دوپہر میری وارث علوی سے ان کے گھر احمد آباد میں ملاقات ہوئی۔ میرے ساتھ مصور جینت پرمار بھی تھے۔ وہ ایک بڑے گھر میں رہتے تھے جس کے کئی دروازے اور کھڑکیاں تھیں۔ ان کے داماد ہمیں دروازے پر مل گئے۔ ہم بڑی سی بیٹھک سے ہوتے ہوئے وارث علوی کی خواب گاہ تک پہنچے۔ وہ پلنگ پر لیٹے ہوئے تھے۔ خاصے بیمار بھی لگ رہے تھے۔ ہماری آمد پر اُٹھ کر بیٹھ گئے اور ہلکے سے مسکرا کر سلام کا جواب دیا۔ قریب ہی ان کی اہلیہ کھڑی تھیں۔ انھوں نے سلام دعا کے بعد ہمیں کرسیاں پیش کیں۔ وارث علوی صاحب نے سفید کرتہ اور روایتی تہبند پہن رکھا تھا۔ سر جھکائے آہستہ آہستہ پرانی باتیں اور امریکہ کا احوال پوچھتے رہے ان کی عمر کے اس آخری حصے میں بھی یادداشت بہت اچھی تھی اور تو اس وقت حیرت میں رہ گیا جب انھوں نے اسی (۸۰) کی دہائی میں میرے فرانسیسی ادیب اور ڈرامہ نگار ژان ژینے سے ہوئے مصاحبے کا ذکر کیا۔

پھر چائے کے ساتھ بسکٹ آئے۔ چائے نوشی کے دوران سے آہستہ آہستہ باتوں اور یادوں کا تبادلہ ہوتا رہا۔ ان کی بیگم نے ان کی صحت کی صورتحال اور ان کے حالات زندگی کے متعلق تفصیل سے بتایا اور ان کی چھوٹی صاحب زادی شاہدہ بھی ہماری گفتگو میں شامل ہو گئیں۔ ان کے دونوں نواسوں سے بھی ملاقات رہی۔

وارث علوی کے خاندان کا تعلق احمد آباد گجرات کے ایک صوفی بزرگ شاہ وجیہ الدین علوی گجراتی سے ہے۔ وارث علوی کے دادا جان کا نام امیر الدین علوی اور دادی صاحبہ کا نام قمر النساء تھا جبکہ ان کے والد کا اسم گرامی سید حبیبی علوی اور والدہ ماجدہ کا نام حفیظ النساء (عرف داشنی بی بی) تھا۔ وارث علوی کا پورا اصل نام وارث حسین علوی تھا۔ ان کا ذہن اور مزاج سیکولر تھا۔ وہ معروضی انداز میں باتیں کرتے رہے۔ وہ وسیع القلب اور وسیع النظر تھے۔ انہیں کڑوی بات کو بھی زبان شیریں سے ادا کرنے کا ملکہ آتا تھا۔ وہ وسیع المطالعہ تھے اور اردو در آنے والے تنقیدی اور فکری مسائل ور موضوعات پر شگفتہ انداز میں لکھا۔

وارث علوی کی شریک حیات نے بتایا کہ انہوں نے دسویں جماعت کا امتحان احمد آباد کے انجمن اسلامیہ ہائی اسکول سے پاس کیا۔ پھر جامعہ ممبئی سے علاقاتی تمغے کے ساتھ بی اے کی ڈگری اور گجرات یونیورسیٹی سے ایم اے اردو اور بعد میں علی گڑھ یونیورسیٹی سے انگریزی ادبیات میں ایم اے سند حاصل کی۔ ۱۹۵۵ء میں احمد آباد کے معروف کالج سینٹ دیوبرس میں انگریزی کے لیکچرار مقرر ہوئے پھر اسی کالج سے تینتیس (۳۳) سال درس وتدریس سے متعلق رہنے کے بعد ۱۹۸۸ء میں بحیثیت صدر شعبۂ انگریزی کی ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔

ان کا کنبہ بڑا تھا۔ ان کی بیوی کا نام فاطمہ ہے۔ ان کی دوسری بیٹی شہبازہ کی شادی محمد عثمان صاحب سے ہوئی۔ ان کی بیٹیوں کا نام انجم اور عائشہ ہے۔ چھوٹی بیٹی شاہدہ کی شادی امتیاز صاحب سے ہوئی ان کے دو بیٹے اور ابرار ہیں۔ شاعر محمد علوی ان کے کزن ہیں۔ ان کی موت سے چند ماہ قبل ان کے بڑے بھائی ادیب ومترجم مظہر الحق علوی کا انتقال ہوا۔

وارث علوی مرحوم آخری وقت تک مشترکہ خاندان کے ساتھ احمد آباد میں اپنے آبائی مکان سیدواڑہ آسٹوڈیا میں اپنی چھوٹی بیٹی شاہدہ کے اہل خانہ کے ساتھ رہتے رہے۔

وارث علوی مرحوم ۱۹۶۴ء سے ۱۹۵۰ تک انجمن ترقی پسند مصنفین احمد آباد کے متعمد رہے۔ پھر ساہتیہ اکادمی گجرات کے پہلے صدر منتخب ہوئے اور ساہتیہ اکادمی گجرات کے جریدے 'صابرنامہ' کے مدیر رہے۔

۹ر جنوری ۲۰۱۳ء بروز جمعرات احمد آباد گجرات ہندوستان میں طویل بیمار کے بعد جہان فانی کو خیر باد کہا اور احمد آباد میں ہی پیوند زمین ہوئے۔ ان کو ایک آزاد خیال ادیب اور نقاد کہا جاتا ہے وہ حریت قلم کے قائل تھے۔ وہ اس فکر ونظر کو مسترد کرتے تھے جو ادیب پر حکم صادر کرتی ہے اور غلام بنالیتی ہے اور ان کی تخلیق اور فکری عمل پر حدود عائد کر کے پابند کر دیتی ہیں۔ انھوں نے اردو نقد کو نئے ذائقے سے روشناس کروایا اور انہیں مغربی اور مشرقی فکر ونقد کے پیمانوں اور نظریات کو متوازن انداز میں لکھنے کا فن آتا تھا جس میں ادبی چاشنی کے علاوہ عمرانیاتی احوال کو دلفریب انداز میں لکھنے کا فن آتا تھا۔ وارث علوی اردو کے ان ناقدین میں شامل ہیں جنہوں نے قاری کو جھنجھوڑا اور فکر ونظر کی نئی بساط پھیلائی۔ انہیں شروع میں 'جدیدیت' کا ناقد جانا جاتا تھا۔ مگر وہ سکہ بند قسم کے نقاد نہیں تھے۔ وہ انفرادی اور جداگانہ سوچ وفکر کے تحت اردو تنقید میں رنگا رنگ پھول کھلاتے رہے۔ احمد آباد کی انجمن ترقی پسند مصنفین کے معتمد رہے۔ سجاد ظہیر نے اپنی کتاب 'روشنائی' میں انہیں قابل قدر نگار اور اخلاص سے دیکھا مگر جب انجمن یسیاریت پسندوں کی سیاسی ایجنڈے سے منسلک ہوگی تو انھوں نے انجمن ترقی پسند مصنفین سے علیحدگی اختیار کر لی۔ ان کا خیال تھا،

''جب ادب میں انقلاب اور سیاست کا ذکر چھڑ جاتا ہے تو وہ لوگوں سے پوچھتے پھرتے ہیں۔ یہ تو سب ٹھیک ہے، لیکن تغزل کہاں گیا، بھئی۔ وہ ادب سے عصری آگہی اور عصری سیاست کی ترجمانی کا مطالبہ کرتے ہیں۔ جب ایسا ہونے لگتا ہے تو کہتے ہیں ٹھیک ہے جناب لیکن ادب صحافت نہیں ہے..... آرٹ پروپیگنڈہ نہیں بنتا.....'' (خندہ ہائے بے جا ص ۱۴)

انھوں نے ترقی پسند نظریہ حیات اور فن کو مکمل طور پر مسترد کر دیا کیوں کہ اس میں حریت قلم اور فرد کی شخصی آزادی کو سلب کر لیا جاتا ہے۔ سچے الفاظ کو آئیڈیالوجی کے لفظ پر قربانی کی بھیٹ چڑھا دیا جاتا ہے لہذا وہ ترقی پسندی حصار سے نکل کر بقول ان کے 'نئی ھواؤں میں سانس لینے لگے.....' ان کا خیال تھا کہ نظریات اور فلسفیانہ تصورات اور مباحث تخلیقی اظہار میں لکھنے والوں سے آزادی چھین لیتی ہے لہذا وہ اس کو رد کر دیتے ہیں۔ وہ یہاں مخالف قطب پر کھڑے ہیں انھوں نے روایتی اور فرسودہ ادبی وفکری عقائد کی باقیات سے اپنے آپ ہی کو نہیں بلکہ اس اندھیرے کنویں سے اردو کے قاری کو باہر نکالنے کی کوشش کی۔ وارث علوی نے بہت سے تنقیدی نظریات کا مطالعہ کیا اور اس سے اپنی بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے اسے اپنے ذہن سے صاف کر دیا اور اردو میں 'آئیڈیالوجی' پر سوالات بھی اٹھائے۔ ادب کے تنقیدی نظریے پر نئے سرے سے مکالمہ ومحاکمے میں یہ احساس دلوایا کہ نظریہ سازی کے اصولوں پر کٹھن وقت بھی آتا ہے اور ان کے بقول ریلوے اسٹیشن پر بدلتے ہوئے اسٹیشن کی طرح تصورات بھی تبدیل ہو جاتے ہیں وہ ٹھہرتے ہیں اور نئی توانائیوں کے ساتھ آگے بڑھتے ہیں۔ وارث علوی ادب میں وابستگی (Commitment) کی بات بھی کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ وابستگی کا عنصر فنکاروں کے رویے کی وضاحت کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ سوال کرتے ہیں کہ اگر فن کو کمٹ منٹ کی ضرورت پڑی بھی تو یہ کمٹمنٹ سوائے فن کے اور کسی کے ساتھ بھی ہوسکتا ہے۔ کیوں کہ ان کے پاس دلیل نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی ہے اور یہ کسی بات کو گرفت میں نہیں لے پاتے اور نہ ہی بحث اور مکالمے کرنے کی استعداد ہوتی ہے اور یہ کسی بات کو گرفت میں نہیں لے پاتے اور نہ ہی وہ اپنی نظریاتی یا تنقیدی آراء کو صحیح طور پر بیاں کر پاتے ہیں، جس سے قاری مطمئن ہو جائے۔ وارث علوی ژان پال سارتر کو دانش ور ہی نہیں سمجھے بلکہ انھیں عقلیت یا استدلال کا فلسفی بھی تصور کرتے ہیں جب کہ ٹی ایس ایلیٹ کے متعلق ان کا خیال ہے کہ ایلیٹ کا تخیل ادراک اور ان کا رویہ ہمدردانہ ہوتا ہے۔ وہ ایک طرف سارتر کو سمجھ دار ادیب اور فلسفی تسلیم کرتے ہیں مگر وہ سارتر میں 'وسیع تر بشری' ہمدردی کی کمی محسوس کرتے ہیں کیوں کہ وہ انسانی وجود کے 'اصل' پر مرکوز ہے یہی ان کی سوچ کا خلاصہ ہے..... وارث علوی حقیقت پسندی کو انتہا پسندی کی رسائی کے تحت مطالعہ وتجزیہ کرتے ہوئے اس بات کا

احساس دلواتے ہیں کہ کہانی میں جو کچھ لکھا جاتا ہے وہ کہانی کار کی اصل آگہی ہوتی ہے جس میں معاشرتی حقائق پوشیدہ ہوتے ہیں۔اس سے کہانی کار کو 'مفر' نہیں ہوتا۔ یوں وہ تحریری حوالے سے منفرد خلقی اظہار کے متمنی رہے اور میراجی کے تخلیقی ادبی انتقادات کے رجحانی تحریک کا حصہ بنے اور اردو میں ذہنی اور فکری آلودگی کو پاک کر کے اسے طہارت بخشی اور اردو نقد میں مروج کئی سال پرانے خیالات، نظریات اور آئیڈیالوجی کے التباس اور کھوکھلے پن کو اپنے قلم سے کھرچا۔ اصل میں وارث علوی نے ترقی پسند تحریک کے ایک ایسے ہراول دستے (A Vant-Garde) کے سرخیل بن گئے جس نے وسیع النظری اور اظہار کے دلچسپ پیرائے میں کئی نئے رنگ بکھیرے اور ترقی پسندی کی 'مخصوص قدامت' کو نئی تاویلات کے ساتھ لبرل انداز میں برتا۔ انھوں نے اردو تنقید کی نئی فضا تشکیل دیتے ہوئے اردو کے کلاسیکی ادب و نقد کو نئی حقیقت پسندی سے روشناس کروایا اور اردو کے آفاق میں نئے مزاج، اظہار اور رویے کی بنا ڈالی اسے وہ 'جدیدت کی انقلابی کروٹ' کہتے ہیں جو حقیقت پسندی سے علامت پسندی تک جاتا ہے۔ وارث علوی اردو کی ''نثر لطیف'' پر اپنی تشکیک کا اظہار کرتے ہیں کیوں کہ یہ روایتی رومانیت سے جڑی ہوتی ہے حالانکہ ان کا خیال تھا کہ یہ لوگ شاعرانہ نثر لکھتے ہیں اس سبب ان کی تنقیدی نثر اچھی نہیں ہوتی۔ یہ سچ ہے کہ شاعرانہ زبان اور اظہار تنقیدی تحریروں کے لئے زہر ہوتا ہے۔ اس کا احساس ارجنٹائن کے ادیب لوئی خورخے بودس کو بھی تھا۔ انھوں نے ایک مصاحبے میں کہا تھا کہ وہ البرٹ کامیو کی تنقید کو اس لئے پسند نہیں کتے ہیں کہ وہ تنقید میں شاعرانہ اور عاشقانہ نثر لکھتے ہیں۔

وارث علوی کے خیال میں علامتی مزاج کی کہانی میں حقیقت پسندانہ بیانیہ موجود ہوتا ہے لیکن نیا کہانی کار اس میں ناکام رہا ہے کیوں کہ ان کے خیال میں پرانے خیالات ایک 'چال' ہوتے ہیں۔ وہ فن اور ادب کو فن کی صورت کے تناظر میں ہی دیکھتے ہیں۔ فن کی کئی تاویلات ہوسکتی ہیں۔ مختلف رسائیوں کے تحت اس کو پرکھا اور تجزیہ کیا جائے۔ لیکن وہ اس کو فن کے نقطۂ نظر سے ہی دیکھتے ہیں جو اصل میں اقدار کی اصلاحی اور اخلاقی وراثت میں نئے سرے سے مخصوص نقطۂ نظر کو پیش کر رہا ہوتا ہے۔ وہ اس کو جدید ادب کا حصہ تصور نہیں کرتے۔ جو حقیقت پسندی کا منکر ہوتا ہے وہ سوشلسٹ ادب کا مخالف ہوتا ہے۔ وارث علوی اپنے مضمون 'کمٹ منٹ' میں لکھتے ہیں۔

''ادب کا موضوع تحریری موضوعات نہیں بلکہ تجربات اور حقائق ہوتے ہیں۔ سوشلزم ادب میں ایک NORM (معمول!) اور قدر کے طور پر کام آسکتا ہے لیکن موضوع اور مواد کے طور پر کام نہیں آسکتا۔''

وارث علوی ادبی اقتدار پر کسی قسم کا سمجھوتہ، مصلحت، سودے بازی اور بھید بھاؤ کے قائل نہیں وہ

ادب میں جعلی حربوں کو تسلیم نہیں کرتے اور ان سے فاصلہ کئے ہوتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ،

'' لکھنے والے کا اپنا اسلوب اور اظہار ہونا چاہیے لیکن ان کے خیالات میں تبدیلیوں کی طرف پختہ ذہن نقاد کا رویہ وہ نہیں ہوتا جو نو خیز مجتہد کا ہوتا ہے۔'' (فکشن کی تنقید کا المیہ ص ۵۶)

''ان کا انداز تحریر دلکش ہے اور قاری کو دلچسپی سے متن پڑھنے اور سمجھنے پر اکساتا ہے۔ وہ اردو کے ادباء اور نقادوں پر طنزیہ لہجہ بھی اختیار کرتے ہیں اور ان کی کمزوریوں کی نشان دہی بھی کرتے ہیں۔ انہوں نے جوش ملیح آبادی سے لے کر ندا فاضلی تک لکھا ہے۔ ان کی تنقیدی زبان اور لہجے پر گہری گرفت ہے جو ان نصابی یا تدریسی نقادوں سے مختلف ہے جو قاری کو کمر بجماعت میں بیٹھا ہوا طالب علم تصور کرتے ہیں۔ وارث علوی خطرناک چیز ہیں وہ، ہمارے عہد کے سربرآوردہ نقاد ہیں۔ معاصر تنقید میں انھیں بلند مقام حاصل ہے۔ اردو تنقید میں وارث علوی کا یہ کارنامہ ہے کہ ان کی تجزیاتی نگاہ فکر و نظر کی تازگی اور تنقیدی بصیرت نے اردو تنقید کی سوچ کو نئی رفعت بخشی اور ہم عصر دانشورانہ فضاء کو شدت سے متاثر کیا ہے۔''

('جب بھی دیکھا ہے تمھیں' از شفاعت قاری)

وارث علوی نے اردو کے دو ادبی تنقیدی فرقوں کے خلاف نعرۂ قلندر بلند کیا اور اردو تنقید میں نئے آنے والے خطرناک رجحانات کی نشاندی کی۔ ان کی آخری کتاب 'غزل کا محبوب اور دوسرے مضامین' میں یہ احساس دلوایا ہے کہ اردو کے آفاق پر غزل کا غلبہ حاوی ہے۔ افسانہ، تنقید، ناول، انشائیہ، ڈرامہ، نظم پر غزل کی لسان اور لفظیات کا غالب اثر ہے۔ انھوں نے جس بات کو محسوس کیا وہ صدق دل سے لکھ دیا۔ وارث علوی دلیر، منھ پھٹ اور سچے نقاد ہیں۔ اس کی مثال اس واقعے سے دی جاسکتی ہے کہ انہوں نے افسانہ نگار رام لعل کی زندگی میں لکھا کہ ''رام لعل کو دنیا کی کوئی طاقت خراب افسانے لکھنے سے نہیں روک سکتی۔'' وہ اپنی رائے اور تبصروں میں اظہار کی جراءت رکھتے تھے اور کسی رورعایت سے کام نہیں لیتے لہذا ان سے بڑے بڑے نقاد مکالمہ کرتے ہوئے گھبراتے ہیں۔

وارث علوی افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں کے علاوہ اردو کے نقادوں کو بھی آڑے ہاتھوں لیتے ہیں اور ان کو آئینہ دکھاتے ہیں۔ ایک مصاحبے میں کہتے ہیں۔

''احتشام حسین، کلیم الدین احمد، آل احمد سرور، ممتاز حسین، حسن عسکری سب کی حیثیت ثانوی تھی۔ آرٹ مکمل طور پر ذہنوں کو فتح کرتا ہے، مسحور کرتا ہے، اپنا گرویدہ بناتا ہے۔ ممتاز حسین مکمل طور پر بور کرتے تھے۔ احتشام حسین پچاس فی صد بور تھے۔ آل احمد سرور ہاں نہیں کا جھولا جھلاتے تھے۔ جو بالآخر تھکا دیتا ہے۔ کلیم الدین کے یہاں نقد کا سورج سوا نیزے پر تھا۔ اردو شاعروں کی قربانیاں ان کے والد کے

کام آئیں اور شاعری کی پل صراط پار کر گئے۔ حسن عسکری دھاندلی باز تھے۔ غالب کو میر سے نیچا دکھایا۔ فراق کو دیوتا کی طرح پوجا اور آخر میں مشرف بہ اسلام ہو گئے۔''

(غزل کا محبوب اور دوسرے مضامین ص ۲۱۱۔۲۱۰)

وارث علوی نے بائیس ۲۲ کتابیں لکھیں جس میں فکشن کی تنقید پر ان کی زیادہ تحریریں ہیں۔ ان کی تنقیدی تحریروں نے اردو تنقید کو نئی راہ دکھائی اور اس موجود ''نورا کشتی'' اور ستائش باہمی کے تبصرے نما تنقید کی دلدل سے نکال کر اردو کو دلچسپ اور معروضی لہجہ عطا کیا۔ جو بلا شبہہ اردو تنقید کی نئی بازیافت ہے ان کی کتابوں کی فہرست یوں بنتی ہے۔

۱۔ تیسرے درجے کا مسافر ۱۹۸۱
۲۔ اے پیارے لوگو! ۱۹۸۱
۳۔ حالی مقدمہ اور ہم ۱۹۸۳
۴۔ خندہ ہائے بے جا ۱۹۸۷
۵۔ راجندر سنگھ بیدی مونوگراف ۱۹۸۹
۶۔ پیشہ تو سپہ گری کا بھلا ۱۹۹۰
۷۔ جدید افسانے کے مسائل ۱۹۹۰
۸۔ کچھ بچالایا ہوں ۱۹۹۰
۹۔ فکشن کی تنقید کا المیہ ۱۹۹۲
۱۰۔ سعادت حسین منٹو مونوگراف ۱۹۹۵
۱۱۔ سعادت حسن منٹو (ایک مطالعہ) ۱۹۹۷
۱۲۔ اوراق پارینہ ۱۹۹۸
۱۳۔ بورژواژی، بورژواژی ۱۹۹۹
۱۴۔ منتخب مضامین ۲۰۰۰
۱۵۔ ادب کے غیر اہم آدمی ۲۰۰۱
۱۶۔ لکھنے گئے رقعہ لکھے گئے دفتر ۲۰۰۱
۱۷۔ ناخن کا قرض ۲۰۰۳
۱۸۔ سرزنش خار ۲۰۰۵
۱۹۔ کلیات اجندر سنگھ بیدی جلد اول و دوئم ۲۰۰۵
۲۰۔ راجندر سنگھ بیدی ایک مطالعہ ۲۰۰۶
۲۱۔ بت خانہ چین ۲۰۱۰
۲۲۔ غزل کا محبوب اور دوسرے مضامین ۲۰۱۳
۲۳۔ اقبال کے بعد اردو نظمیہ شاعری (غیر مطبوعہ)

225 Trail Hollow Lane,
Palestine, TX. 75801 U.S.A.
+19039487184

یاد رفتگاں

● ڈاکٹر نسترن احسن فتیحی

حد کر دی آپ نے: شہریار

کیسی تاریکی ہے ہر سو دل بہت گھبرائے ہے
خواب دیکھوں کس طرح میں آنکھ کھل کھل جائے ہے
سو رہا ہے شہر سناٹوں کی چادر اوڑھ کر
میری یہ آواز در در جائے ہے پچھتائے ہے
(شہریار)

۲۳ر فروری ۲۰۱۲ء کی ایک یخ بستہ شام کو ایک خبر نے دلوں میں تاریکی بھر دی اور پورا شہر اُداسی اور سناٹے کی چادر میں لپٹ گیا۔ شہریار جو نہ جانے کتنے دلوں کے شہزادے تھے، وہ اپنی تنہائی، اُداسی اور بے خوابی سب کچھ اپنے چاہنے والوں کے نام چھوڑ کر بڑی پرسکون نیند سو گئے۔ کسی کے وہم و گمان میں نہ تھا کہ سچ مچ انھیں جانے کی اتنی جلدی ہے۔ اور وہ ہم سب سے اپنا ناطہ توڑ کر ابدی آرام گاہ میں چلے گئے.....انھی کے لفظوں میں۔

زمیں کا وہ حصہ
جہاں ہے ازل سے ابد ہی کا پہرا
طلسمی چراغوں میں لپٹی ہوئی عود و عنبر کی خوشبو
جہاں خیمہ زن ہے
زمانوں کی صدیوں کی لمحوں کی
غمخواریاں جس نے کی ہیں
جہاں ساری تہذیبیں شرمائی سی
سر برہنہ کھڑی ہیں

جہاں ہم سے خلوت گزیدہ گنہگار بندوں کی
اک انجمن ہے۔
زمیں کا وہ حصہ حقیقت ہے ارض وسما کی
خودی کی خُدا کی!
(شہریار)

ادب کی دنیا کا یہ شاہزادہ ارض وسما کی ازلی حقیقت سے جاملا تھا۔

شہریار صاحب ایک ایسی دل ربا شخصیت کے مالک تھے جس میں کسی طرح کا تصنع نہیں تھا۔ وہ اپنے دوستوں میں ہوں، کسی محفل یا مشاعرے میں یا طالب علموں یا مداحوں کے ہجوم میں.....ان کا روّیہ بہت دوستانہ اور مشفقانہ ہوتا تھا۔ شہرت اور مقبولیت نے ان کے مزاج کی سادگی اور خلوص کو ذرا سا بھی زک نہ پہنچایا تھا۔ اُن سے ملنے پر ہر بار ان کی شخصیت کا رکھ رکھاؤ، وقار اور سادگی، نرم چہرہ، نرم آواز ایک ایسا سحر جگاتے کہ لگتا ذہن اور احساس کی سطح پر میں جس شاعر سے مرعوب تھی.....اُس کی شخصیت کا احترام بھی اُس سے ملنے پر کئی گنا بڑھ گیا ہے۔

جاوداں شخصیتیں ایسی ہی ہوتی ہیں.....اپنی ذات کی سطح سے بہت اُوپر اُٹھ جاتی ہیں۔ اور ان کی شخصیت کا یہ کمال ان سے بہت ساری قربانیاں لے لیتا ہے۔ اپنوں کی، اپنے رشتے ناتوں کی، وقت کی، نیند کی، اور آرام کی.....لیکن ان ساری قربانیوں کے بعد فن جن اونچائیوں اور گہرائیوں کو چھوتا ہے۔ وہ ایک لازوال نقش سب کے دلوں پر چھوڑ جاتا ہے۔ شہریار صاحب کا فن بھی ان کمالات کو پہنچ کر سب کے دلوں میں بس چکا تھا اور ان کی سادہ لوحی نے سب کو اپنا گرویدہ بنا رکھا تھا۔ مگر ان کی شخصیت کی خوبی یہ تھی کہ جب آپ ان سے ملیں تو وہ آپ کو ہی اتنا اچھا محسوس کراتے کہ جیسے آپ ہی کچھ خاص ہیں اور وہ خود کچھ بھی نہیں اور میں یہ سوچے بغیر نہ رہ پاتی کہ سچ مچ بڑی شخصیتیں ایسی ہی ہوتی ہیں جو خود سے اپنے کام اور نام کی مدح سرائی نہ کرتی ہیں نہ کراتی ہیں۔ بلکہ اس آفتاب کی طرح اس کی چمک ہوتی ہے جس کے سامنے آکر ذرّات بھی چمکنے لگتے ہیں۔ اور میں ان کے سامنے ایک ذرّے کی بھی حیثیت نہ رکھتی تھی۔ لیکن ان کی اس خوبی سے بخوبی واقف ہوگئی تھی کہ ہر ملاقات میں ان کی شخصیت بہت دھیمے سے سامنے والے کی سوئی ہوئی صلاحیتوں کو ایسے جگاتے کہ انسان کچھ کرنے کا جوش لے کر ان کے پاس سے لوٹتا۔

شہریار صاحب سے ذہن اور احساس کی سطح پر وابستگی بہت پرانی تھی۔ تب سے جب ادب نوازی کا شعور بیدار ہو رہا تھا۔ ان کی شاعری ایک ایسا آئینہ تھی جس میں زندگی کی چھوٹی چھوٹی محرومی، اُداسی

اور تنہائی، خوشی، اُمید، اور خواب.....انفرادی اور اجتماعی مسائل اور ایک بہتر زندگی کی آرزو..... یہ سب کچھ ایسے سامنے آتے کہ لگتا اپنی ہی سوچ اور اپنا ہی عکس ہیں.....اپنے ہی دل کی آواز لفظوں کے پیکر میں ڈھل کر ہمارے سامنے ہے.....آج کے انسان کی زندگی کا کرب اور تفکر دل کی گہرائیوں میں اتر جاتے۔ اور یوں زندگی کو دیکھنے، سمجھنے اور برتنے کا شعور منجھنے لگا۔

بوجھو تو پاگل سپنا
سمجھو تو سنسار !
(شہریار)

ہر اچھا ادیب اور شاعر اپنے قاری کے ذہن اور احساس پر اپنا ایک امٹ نقش چھوڑتا ہے۔ پہلے قاری کو اس کے فن سے محبت ہوتی ہے۔ پھر اس سے ملنے کا اشتیاق دل میں پلتا ہے۔ اور میرا یہ اشتیاق علیگڑھ آنے کے بعد پورا ہوگیا۔ میرے جیسے نئے لکھنے والوں کے لئے اس ملاقات کی بڑی اہمیت تھی۔ جیسے کوئی خواب پورا ہوا ہو.....اور پہلی ملاقات میں مجھے اندازہ ہوگیا کہ ان میں ہر کس وناکس سے ذاتی سطح پر بڑے سہج انداز میں تعلقات قائم کر لینا اور ان میں یہ یقین پیدا کر دینا کہ وہ ان کے بہت قریب ہیں، ان ہی کی شخصیت کا کمال تھا۔ وہ کسی اجنبیت کا احساس باقی نہ رہنے دیتے۔ ہر ملاقات میں ان کے لئے احترام اور بڑھ جاتا، اور اپنے لئے یقین۔

آخری ملاقات میں کہا گیا ان کا یہ جملہ آج بھی مجھے ایسے جھنجھوڑتا ہے جیسے وہ مجھے سامنے آکر شرمندہ کر رہے ہیں۔ انھوں نے ہمیشہ کی طرح نہ یہ پوچھا کہ میں نے کچھ لکھا یا نہیں نہ یہ کہا کہ جلدی کچھ لکھو۔ صرف اتنا کہا.....'حد کر دی آپ نے.....' اور میں نے شرمندہ ہو کر سر جھکا لیا۔ میرے پاس اس شکایت کا کوئی جواب نہ تھا۔ جب ہمارے سامنے ایسے ایسے آئیڈیل موجود ہوں جو اپنے عمل سے اور اپنی شفقتوں سے آپ کے لئے مشعل راہ بن جائیں تو اپنی ناکارکردگیوں پر شرمندگی ہونا لازمی ہے، اپنی کوتاہیوں اور بے عمل رویئے کے پس منظر میں آج مجھے ان کی یہ نظم 'گیانیوں کا اُپہار' یاد آتی ہے۔

دھیان کی پُر پیچ گلیوں اور گزرگاہوں پہ
گرتے اور سنبھلتے
سانس روکے، دل سنبھالے
گیان کے پھیلے ہوئے صحرا کی جانب
چند سائے جا رہے ہیں

اپنے پیروں کے نشان ہر سمت چھوڑے جا رہے ہیں
تا کہ کل ان کے سوا، گر، گیان کے صحرا کی جانب کوئی آئے
تو اسے مشکل نہ کوئی پیش آئے
(شہریار)

ہمارے سامنے قدموں کے نشان بھی تھے اور ان کی حوصلہ افزائی بھی.....انھوں نے ہمیشہ یہ درس دیا کہ اگر کچھ کرنے کا جذبہ ہے اور صلاحیت ہے تو ایوریج (Average) یا ایبوایوریج (Above Average) ہی بن کر مت رہو۔ بلکہ Excellent بننے کی کوشش کرو۔ مگر ہم جیسے معمولی لوگ اپنے ارادے کو پایہ تکمیل تک کہاں پہنچا پاتے ہیں۔ میں نے ان کی اس پیار بھری ناراضگی کے جواب میں یہ ضرور سوچا تھا کہ اب ان کے سامنے اپنا کوئی کام مکمل کر کے ہی جاؤنگی۔ مگر اچانک ان کی شدید علالت کی خبر نے پوری اردو دُنیا کو اور ان کے مداحوں کو فکر مند کر دیا۔ سب دُعا کرتے رہے ان کی صحت یابی کی.....اور میں دُعا کرتی رہی کہ میں جلد از جلد اپنا کام مکمل کروں اور ان کے صحت یاب ہونے پر ان سے داد حاصل کروں.....
مگر نہ جانے کیوں، نہ جانے کیسے وہ عظیم انسان اچانک ہم سے ہمیشہ کے لئے ناراض ہو گیا۔ ابھی اتنی جلدی کیا تھی انھیں جانے کی۔ کم از کم مجھے ایک موقع تو دیتے کہ میں ان کی ناراضگی دور کر پاتی۔ مگر اب میں ان کے اس طرح اچانک چلے جانے پر کیسے کہوں کہ.....'حد کر دی آپ نے!'

◀◀ ● ▶▶

"Lisan"
Road No. 5 Iqra Colny, New Sar Syed Nagar
Aligarh (U.P)
+91 9411803610

روم (اٹلی) میں میرا چالان ہوا۔ مصروفیت کے باعث فیس ٹائم پر ادا نہ کر سکا کورٹ جانا پڑا۔ جج کے سامنے پیش ہوا تو اُس نے وجہ پوچھی۔ میں نے کہا، پروفیسر ہوں۔ مصروف ایسا رہا کہ وقت نہ ملا۔ اس سے پہلے کہ میں بات کرتا جج نے کہا۔

"A teacher is in the ourt.A teacher is in the court."

اور سب لوگ کھڑے ہو گئے اور مجھ سے معافی مانگ کر چالان کینسل کر دیا۔ اُس روز میں اُس قوم کی ترقی کا راز جان گیا۔ (اشفاق احمد)

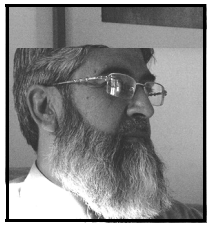

● محمد حامد سراج

یونین کونسل

وہ شاہ پور صدر کے اسٹیشن پر اترا تو ویرانی سامنے جھگی لگائے بیٹھی تھی۔ لوہے کے جنگلے کے ساتھ جنگلی کیکر تھے جو سامنے تا حد نظر پھیلے تھے۔ وہ اس شہر میں پہلی بار اترا تھا اور ہر چیز، ہر منظر کو حیرانی سے دیکھ رہا تھا۔ اسٹیشن کے جنگلے کے ساتھ ایک نحیف گائے بندھی تھی جس کی پسلیوں کا شمار ممکن تھا۔ وہ عمارت سے نکلا تو اس نے ایک اور قدیم عمارت دیکھی اور اپنے باپ سے پوچھا۔

''بابا! یہ اتنی پرانی عمارت کس کی ہے؟''

''بیٹا! یہ انگریزوں کے زمانے کی ہے اور اسے حکومت گندم کے سٹور کے طور پر استعمال کر رہی ہے۔''

اس نے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی پر وقت دیکھا جو اسے پرسال اس کے نانا نے پانچویں جماعت میں اول آنے پر انعام میں دی تھی۔ وہ اس گھڑی کو کلائی پر باندھے اترا تا پھرتا تھا۔ اس نے اپنے کرتے کی کف اڑس لی تھی کہ سب کی نظر اس کی گھڑی پر پڑیں اور وہ بار بار وقت دیکھتا اور خوش ہوتا کہ اس کی کلائی پر گھڑی بندھی ہے۔ عمر کے اس حصے میں اسے وقت کی اذیت سے زیادہ اپنی گھڑی سے محبت تھی۔ اس نے انگریز کی عمارت کی بوسیدہ اینٹوں کو غور سے دیکھا، ساتھ ہی کلائی پر بندھی سلور گھڑی کو دیکھا۔ وہ گھڑی سکول پہن کے بھی نہیں جا سکتا تھا کیوں کہ ایک دن ایک لڑکا کلاس میں گھڑی پہن کر آیا تو ماسٹر صاحب نے اسے مرغا بنا کر اس کی نرم پشت پر چھڑیاں برسائی تھیں۔ جنگلی کیکروں کے درمیان بچھی پگڈنڈی پر دھول میں لپٹے پاؤں کے ساتھ وہ ایک پختہ سڑک کے کنارے پہنچے۔ سڑک کے پار بھی کچا راستہ آرام کر رہا تھا۔ وہ اس پر چلتے ہوئے دائیں بائیں کے منظر اپنے اندر ترتیب دیتا ہوا چلتا رہا۔ ایک چوک پر اس کے بابا نے اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ ہم نے وہ سامنے اس گھر میں جانا ہے۔ داہنی جانب بازار کا شور تھا جو اسے کھینچ رہا تھا۔ لیکن بابا سے جڑا وجود کاٹ کے بازار جانا ممکن نہیں تھا۔ وہ فرماں برداری کی چادر میں لپٹا چپ چاپ چلتا رہا۔ اس نے ایک بار پھر کلائی پر بندھی گھڑی کو دیکھا اور اسے انگریزوں کے زمانے کا خیال آیا کہ ریلوے اسٹیشن کی عمارات بھی کتنی بلند مظبوط، کشادہ اور ہوادار ہیں۔ جانے اس عمارت کو تعمیر ہوئے کتنے

برس گزر چکے ہوں گے۔ بچپن کی گھڑی پر کسی وقت اور سن کا اندراج نہیں تھا۔

وہ گھر میں داخل ہوئے تو گھر اس کے گاؤں کی طرح کشادہ نہیں تھا۔ لیکن وہاں ایک خوشبو تھی .....رشتوں کی۔ سورج ڈھلنے پر ایک بزرگ نے اسے کہا۔

''بیٹا! جاؤ، مسجد کے غسل خانے میں جا کر نہالو۔ گرمی بہت ہے۔''

اس نے دروازے پر لگا ٹاٹ کا پردہ ہٹا کر سامنے دیکھا تو مسجد کا مینار نظر پڑا۔ اُلٹی سمت پھرا سے بازار نے کھینچا۔ اس نے سوچا نہا کر کسی کے ساتھ بازار ضرور جاؤں گا۔ مٹھائی کی سوغات میں 'پتیسہ' اسے بہت پسند تھا۔ یہ بھی اچھا ہے، کہوں گا کہ پتیسہ لینا ہے۔ کوئی روکے گا بھی نہیں۔ شاہ پور صدر کی ایک سوغات اور تھی جسے 'ککڑ' کہتے تھے۔ جب بھی اس کی دادی ماں کی بزرگ بھتیجی گاؤں آیا کرتی تھیں وہ 'ککڑ' ضرور لایا کرتی تھیں۔ ککڑ کی شکل سموسے جیسی ہوتی تھی اور اس میں پنجیری کے ساتھ خشک میوہ جات ہوتے تھے۔ دریائے سندھ کے کنڈے کے ساتھ بسنے والے شہروں میاں والی، کندیاں، چشمہ بیراج، علووالی، پپلاں، کلورکوٹ، دریاں خان، اور بھکر کے باسی مرغ کو 'ککڑ' پکارتے تھے۔ ان علاقوں کے اصیل مرغ اور ککڑوں کی لڑائیوں کے دنگل مشہور تھے۔ جنوبی پنجاب اور شمالی پنجاب کے مختلف شہروں سے لوگ اپنے اپنے مرغ لئے ان لڑائیوں میں شریک ہوتے۔ شرطیں باندھی جاتیں۔ بڑے پیمانے پر جوا کھیلا جاتا۔ اور کبھی کبھار مرغوں سمیت پولیس ان کو دھر لے جاتی اور حوالات میں بند کر دیتی۔ لیکن دادی اماں کے شہر شاہ پور صدر کے ککڑ میٹھے اور لذیذ ہوتے تھے۔ وہ مسجد کے غسل کے دروازے پر کھڑا سوچ رہا تھا کہ کہیں دادی اماں یہ نہ کہہ دیں کہ پتیسہ کیا لینا تم 'ککڑ' کھالو، یہ بھی ممکن ہے بچہ ہونے کی وجہ سے بازار نہ جانے دیا جائے۔ غسل خانے کے بوسیدہ تختوں سے جڑے دروازے کو سہار کر وہ اندر داخل ہوا تو اس کا پاؤں پھسلا لیکن وہ سنبھل گیا۔ غسل خانے کی چھت آسمان تھا۔ اندر سیمنٹ کی ایک 'پڑچھتی' بنی ہوئی تھی کہ نہانے کے دوران صابن یا کوئی اور چیز رکھنا ہو تو وہاں رکھی جا سکے۔ اس نے کلائی پر سے گھڑی اُتاری اور خوب نہایا۔ نہانے کے دوران بھی بازار کا خواب دیکھتا رہا۔ نہا کر لوٹ آیا۔ رات کے کھانے پر اسے یاد آیا کہ وہ اپنی کیمی گھڑی تو غسل خانے میں بھول آیا۔ اس نے رونا اور شور مچانا شروع کر دیا۔ گھر کے سب افراد پریشان ہو گئے۔ اس کی دادی ماں کے بھتیجے جو مسجد کے پیش امام بھی تھے، فوری مسجد کی سمت گئے لیکن گھڑی غسلخانے میں نہیں تھی۔ اس کی دادی نے اسے تسلی دی کہ پریشان نہ ہو، گھڑی مل جائے گی۔ اس کی تو ساری زندگی کی خوشی جا رہی تھی۔ تھوڑی دیر میں مسجد سے اعلان ہوا۔

''حضرات! ایک ضروری اعلان سنئے۔ ایک مہمان کی گھڑی عصر کے وقت مسجد کے غسل خانے

میں رہ گئی۔ جن صاحب کو ملی ہے وہ امام صاحب کے گھر پہنچا دیں۔''

اعلان کو تین بار دہرایا گیا۔ وہ بستر پر لیٹا سوچتا رہا کہ صبح صبح کوئی اللہ کا نیک بندہ آئے گا اور امام صاحب سے کہے گا۔ امام صاحب! یہ رہی آپ کی گھڑی۔ ساری رات وہ خواب میں بھی انگریز کی عمارتوں، جنگلی کیکروں کے درمیان کانٹوں سے الجھتا زخمی ہاتھ پیر لئے اپنی گھڑی تلاش کرتا رہا۔ صبح آنکھ کھلنے پر اس نے آس پاس نظر ڈالی۔ سب ناشتہ کر رہے تھے۔ وہ منہ ہاتھ دھو کے ناشتہ کرنے لگا۔ خاموشی اس بات کی گواہ تھی کہ گھڑی نہیں ملی۔ دن نکلنے پر وہ بازار گیا۔ بازار کے وسط میں قدیم بوہڑ کا درخت تھا۔ دیو ہیکل درخت.....جس کی شاخیں زمیں کو چھو رہی تھیں اور تنے کا پیٹ اس کی عمر اور بزرگی کی کہانی سنا رہا تھا۔ اس نے اپنی کلائی کو حسرت سے دیکھا۔ آس پاس دکانوں میں لوگ خریداری کر رہے تھے۔ ایک ہوٹل والا جستی پتیلی میں پتی پھینٹ کر چائے بنا رہا تھا۔ فٹ پاتھ پر دو پیسے لے کر حال بتانے والا نجومی بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے بچھے لفافوں میں سے طوطا جو لفافہ اٹھاتا اسے کھول کر پرچی پر لکھی تحریر وہ فر فر سناتا اور اپنے دو پیسے کھرے کر لیتا۔ اس نے ایک لمحے کو سوچا کہ قسمت آزما لے، لیکن پھر کچھ سوچ کر آگے چل پڑا۔ مٹھائی کی دکان سے اس نے ''پتیسے کی ٹکیا'' لی اور اس کے ذائقے میں مست چلتا گیا۔ بازار کے آخری سرے پر جیل کی دیوار تھی۔ وہ تھوڑی دور تک گیا اور پلٹ آیا۔ وہ پھر بازار سے گزر رہا تھا۔ اس کی جیب میں دو 'آنے' تھے۔ صدر ایوب کا عہد تھا اور ابھی 'ٹیڈی پیسہ (ایک پیسہ)، ٹکہ، آنہ، دو آنے، چونی اور اٹھنی' رائج تھی۔ سولہ آنے کا ایک روپیہ بنتا تھا۔ وہ کئی ہزار سال میں بھی 'دس روپے' نہیں جوڑ سکتا تھا۔ اس معصوم کو معلوم ہی نہیں تھا کہ مارشل لاء کے دور میں جو متاع کھو جائے وہ کبھی واپس نہیں ملا کرتی۔ یہ تو ایک معمولی سی کیمی گھڑی تھی۔ کیوں کہ جب اس کو یہ بات معلوم پڑی نصف صدی گزر چکی تھی۔ وہ شاہ پور صدر کے بازار میں کھڑا تھا کہ ایک دم وہ بوڑھے برگد میں ڈھل گیا۔ نسلیں اس کے سائے سے گزرنے لگیں۔ وہ چپ چاپ بدھا کی طرح درخت کے ساتھ اس کا حصہ ہو گیا۔ وہ ہر آنے والی نسل سے سوال کرتا کہ اس شہر میں نصف صدی پہلے میرا 'وقت' گم ہو گیا۔ میری ایک کیمی گھڑی تھی۔ اس میں انگریز کی عمارتیں تھیں، ریل کی پٹڑیاں بچھی تھیں، چھک چھک کرتا کالا اسٹیم والا انجن تھا۔ دو پیسے میں طوطو بولتا تھا۔ کیا آپ کا یہ فرض نہیں بنتا کہ مجھے ایک کیمی گھڑی لے دیں۔ اس کے رشتہ دار اسے مسکرا کر دیکھتے اور گزر جاتے۔ نسلیں گزرتی رہیں۔ وہ ہر شخص سے سوال کرتا۔

''انگریز واپس آ گیا ہے کیا.....؟''

''بابا! اب تو دنیا پر ایک ہی سپر پاور حکومت کرتی ہے۔''

''انگریز سے تو ہم نے وطن آزاد کرالیا تھا۔ پوری نسل کی قربانی کے عوض.....!''

''بابا!.....دنیا کی کیمسٹری بدل چکی ہے۔تم جس وطن کی بات کرتے ہو،اب اس کے تین وطن ہیں۔''

''کس نے کاٹ کے ٹکڑے کیا ہمارے وطن کو.....؟''

''بابا!.....ایک وطن اس کرۂ ارض پر صرف حضرت آدم کے پاس تھا۔اس کے بعد سے انسان زمین کے ٹکڑے کاٹ کے اپنے اپنے وطن بناتا چلا آرہا ہے اور وطن بنانے کی خاطر لاکھوں انسانوں کو کاٹ کے پھینک دینا کھیل سمجھتا ہے۔''

''مجھے وطن نہ لوٹاؤ لیکن مجھے کوئی نسل تو اپنی کیمی گھڑی واپس کردے۔''

وقت کا یومِ پیدائش انسان کو معلوم ہے اور نہ اس کی وفات کی تاریخ کی خبر اشرف المخلوقات کو دی گئی ہے۔وقت بہہ رہا ہے۔یہ اپنے بہاؤ میں نسلیں اور وطن ساتھ بہالے جاتا ہے۔تہذیبوں کا نام ونشان مٹا ڈالتا ہے۔وقت کی چکی سب کچھ پیس ڈالتی ہے۔وقت بہہ رہا تھا اور وہ وقت سے بے خبر برگد کے نیچے عمریں بھوگ رہا تھا۔ایک تپتی دوپہر میں اچانک اسے اپنے اندر ایک آواز سنائی دی اور حواس کی دنیا میں لوٹ آیا۔اس نے اردگرد غور سے دیکھا۔شاہ پور صدر بازار میں بہت سی دکانیں کھل چکی تھیں۔وہ گھر کو پلٹا تو اردگرد پختہ اور اونچی عمارتیں دیکھ کر حیران رہ گیا۔مسجد شہید کر کے وہاں ایک نئی شاندار مرصع مسجد بنادی گئی تھی لیکن نمازیوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔سب چہرے نئے تھے۔اڈے پر گیا تو وہاں بہت سی نئی دکانیں کھل گئی تھیں۔'بھیرہ' جانے والی سڑک پر ایک نئے ماڈل کی کار بھاگتی جارہی تھی۔جیل کی مشرقی سمت پولیس چوکی کے پاس اس نے سامنے نظر ڈالی۔'دھریمہ' سے ہوتی ہوئی سرگودھا جانے والی سڑک بہت کشادہ ہو چکی تھی۔بڑے بڑے شاندار شاپنگ سنٹر کھلے ہوئے تھے۔گاڑیوں میں پٹرول اور ڈیزل کے ساتھ CNG کے عظیم الشان اسٹیشن بنے کھڑے تھے۔کسی نے اسے بتایا کہ کروڑوں میں CNG اسٹیشن بنانے والے اب ارب پتی بن چکے ہیں۔لیکن ملک دیوالیہ ہو چکا ہے۔وہ الٹے قدم چلتا ہوا شاہ پور صدر کے ریلوے اسٹیشن پر پہنچا۔اسے اپنی گم شدہ نسل کی تلاش تھی۔وہ شکستہ بنچ پر بیٹھ کر ٹرین کا انتظار کھینچنے لگا۔ایک بلی اس کے پاؤں میں سے گزر گئی۔ایک کتا جنگلی کیکروں کے درمیان ستا رہا تھا۔ایک چرواہا وہاں سے گزرا تو اس نے پوچھا۔

''بابا جی!.....کس کا انتظار ہے.....؟''

''ٹرین کا.....!''

''بابا جی!اس اسٹیشن پر اب کوئی ٹرین نہیں رکتی۔یہ کئی سال سے ویران ہے۔ایک زمانہ تھا۔شاہ

پور صدر ضلع تھا۔اب تحصیل بھی نہیں رہا۔یونین کونسل کا ایک دفتر ہے بس.....رہے نام اللہ کا.....!''

بوڑھے نے ایک لمبی سانس اپنے پھیپھڑوں میں کھینچی اور خود کلامی کی چادر لپیٹ کر بے سمت چل پڑا۔

◀◀ ● ▶▶

Khanqah-e-Siraiya P.O. Chashma Barrage
Distt. Mianwali 42030 (Pakistan)
+92 3336833852

افسانے اور شاعری کے قاری

مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ گزشتہ برس میرے گھر پر ایک ادبی نشست جو محترم المقام جناب صفدر ہمدانی کے اعزاز میں منعقد کی گئی تھی۔ہم سب نے مل کر افسانے بھی سنے اور سنائے اور شاعری کا بھی اہتمام رہا.....خاصے کی بات یہاں لکھ رہی ہوں جو انہوں نے اپنی تقریر میں کہی جو مجھے آج عزیز دوست نسترن فتیحی کے افسانے پڑھنے میں وقفہ لینے والی بات سے یاد آ گئی۔محترم المقام جناب صفدر ہمدانی کہتے ہیں۔

''جس طرح افسانہ لکھنا ایک ڈھنگ اور تہذیب ہے اسی طرح افسانہ پڑھنا بھی ایک ڈھنگ اور تہذیب ہے کہ سطحی سوچ کا قاری افسانے کے کرداروں کی نفسیات، افسانے کے پلاٹ، افسانے کی بنت، افسانے کے پیغام تک نہیں پہنچ سکتا۔میں اپنی نظم نگاری اور افسانہ نگاری کے تجربے کے زور پر یہ بات یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ شاعری اور افسانے کے قاری الگ الگ ہوتے ہیں۔شعر کا ردعمل فوری ہوتا ہے جبکہ افسانے کو دیسی گھی کی طرح ہضم کرنا پڑتا ہے۔ہیت، تکنیک اور تخلیق کے اعتبار سے بھی شاعری اور افسانے کا قلمی برتاؤ الگ الگ ہے۔شعر کہنے والا کسی بھی صورتحال کو دیکھ کر یا محسوس کر کے فوری طور پر دس بیس شعر کہہ سکتا ہے یا طویل نظم لکھ سکتا ہے لیکن بڑے سے بڑے واقعے کا عینی شاہد ہونے کے باوجود افسانہ نگار موقع پر کھڑے کھڑے افسانہ تخلیق نہیں کر سکتا۔اسے اس سارے منظر، پس منظر اور کرداروں کو پہلے اپنی ذات میں سمونا اور پھر قلم کے ذریعے انہیں منکشف کرنا ہوتا ہے۔اسی لئے جیسے افسانہ لکھنا انتہائی صبر آزما سفر ہے اسی طرح افسانے کی تلاوت بھی قاری کے لئے نعمت صبر کا تقاضا کرتی ہے۔''

ڈاکٹر نگہت نسیم (سڈنی)

● علی اکبر ناطق

الہٰ دین کی چارپائی

بابے الہٰ دین کی چارپائی صبح آٹھ بجے ہی گھر سے باہر سڑک کے کنارے دو جڑواں درختوں کی چھاؤں میں بچھ جاتی۔ چارپائی کے ساتھ آٹھ سات موڑھے بھی لگ جاتے۔ ان کے درمیان ایک بڑے حقے کی نے ہر وقت گھومتی جس کی وجہ سے کڑوے تمباکو کا دھواں تمباکو پینے والوں کو اپنی طرف کھینچتا رہتا۔ چنانچہ بابے الہٰ دین کے پاس روزانہ کے بیٹھنے والوں کے علاوہ آتے جاتے راہ گیر بھی رک جاتے، گھڑی پہر حقہ گڑگڑاتے، لسی یا پانی کا گلاس پیتے، پھر صافا جھاڑ کر کاندھے پر رکھتے اور آگے چل دیتے۔ یہ دونوں درخت بیری اور کیکر اگرچہ جنس میں الگ الگ تھے مگر ان کے تنے اور شاخیں ایک دوسرے میں اس قدر پھنسی ہوئی تھیں کہ دونوں درخت گھنی چھاؤں کا ایک ہی پیڑ دکھائی دیتے جو بابے الہ دین کے گھر کے سامنے سے بہنے والی اس کھال کے کنارے پر تھے جو راجباہ سے اس لئے نکال کر گاوں میں داخل کی گئی تھی تا کہ گاؤں کی سڑک کے کنارے کھڑے درختوں کو سارا سال پانی دیتی رہے۔ چناچہ جڑواں درختوں کی جڑوں میں ہر وقت بہتے ہوئے پانی کی وجہ سے ان کی شاخیں لچکیلی اور شاخوں کے پتے سیاہی مائل سبز اور گھنے ہو گئے تھے جن کے سائے ان کی شاخوں اور پتوں سے بھی زیادہ ٹھنڈے اور گہرے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ یہ دونوں درخت ہرے اور لال گلابی پرندوں سے بھرے رہتے۔ بعض اوقات کسی پرندے کی بیٹ بابے الہٰ دین یا کسی دوسرے کی پگڑی اور کپڑوں پر گر جاتی تو وہ ہاہا کر کے اسے اڑا دیتے۔ کھال کے آگے ساٹھ فٹ چوڑی سڑک گزر رہی تھی۔ سڑک اگرچہ کچی تھی لیکن اس قدر ہموار اور صاف تھی کہ وہ بیس لائن کی طرح لگتی۔ جس پر جون جولائی کے دنوں میں گرمی کے سبب زمین سے تیز اور چمکیلے حرارے اس طرح دائروں میں اُٹھتے جیسے دھوپ کے بھوت اُڑ اُڑ کر آسمان کو چڑھ رہے ہوں۔ ایسی گرمی اور بخارات میں اگر کوئی ننگے سر چلتا تو چیں بول جاتی۔ البتہ سردیوں میں سفید دھوپ یوں ہلکی ہلکی حرارت پہنچاتی جیسے کوئی تھکے ہوئے کو داب رہا ہو۔ سڑک کے سامنے دوسرے کنارے پر ایک ٹھیلے والا گرمی میں برف اور سکرین ملے گولے بیچتا تھا جبکہ سردی میں پکوڑے اور جلیبی تلنے لگتا۔ اس کے چار قدم آگے اسی ہاتھ ادھڑ عمر ببر موچی کا چھپر تھا۔ چھپر بھی کیا تھا، کوٹھے کی دیوار

کے سامنے دو لکڑی کے موٹے ڈنڈے زمین میں گاڑ کر اُن پر کپاس کی چھڑیاں رکھ دی گئیں تھیں اور دیواروں کی جگہ ٹاٹ کی بوریاں لٹکا دیں جن پر وقفے وقفے سے پانی کا چھڑکاؤ کر دیا جاتا تا کہ ہوا ٹھنڈی ہو کر اندر آئے۔ ببر موچی موٹے چمڑے سے دیسی طرز کے جوتے بناتا۔ ان جوتوں کے خریدار اس گاؤں کے بوڑھے اور ادھیڑ عمر سب لوگ تھے۔ یوں تو ببر موچی کے پاس بھی سارا دن دو چار لوگ بیٹھے رہتے جن میں کچھ جوتوں کے سائز دینے والے اور کچھ یونہی ببر سے گپ شپ کرنے والے۔ لیکن زیادہ تر مجمع بابے الہٰ دین ہی کی چارپائی کے گرد جمتا بلکہ ببر موچی بھی جب کام کرتے کرتے تھک جاتا تو سڑک کی دوسری طرف الہٰ دین کے پاس آ بیٹھتا، پندرہ بیس منٹ کے لیے حقہ پیتا اور پھر اٹھ کر اپنے کام میں جُت جاتا۔ اکثر دفعہ نئے جوتے پر کام کرنے سے پہلے الہٰ دین سے مشورہ کرنا اور اسے چمڑا دکھانا ضروری خیال کرتا۔ اس کے علاوہ جوتا بنوانے والے بھی ببر موچی سے جوتا لے کر پہلے الہٰ دین کو دکھاتے۔ اور بابا الہٰ دین اس جوتے کی اتنی تعریف کرتا کہ خریدنے والا اور بیچنے والا دونوں خوش ہو جاتے۔ ببر موچی تو ایک طرف گاؤں کی بعض عورتیں بھی پھیری والوں سے کپڑے وغیرہ خرید کر سیدھی الہٰ دین کی چارپائی کا رخ کرتیں اور کہتیں۔

''وے الہٰ دینا! یہ کپڑا تو دیکھ کیسا ہے؟ پورے آٹھ روپے گز کے حساب سے لیا ہے۔'' ادھر بابا اس کی تعریف میں اس قدر زمین و آسمان کے قلابے ملاتا کہ سننے والوں پر مبالغہ سا ہونے لگتا، کہتا۔

''دھیے، تم نے تو کپڑے والے کو لوٹ لیا ہے۔ اتنے سستے داموں اتنا اچھا کپڑا خرید لیا، اس طرح کا کپڑا تو میں نے زندگی میں پہلی بار دیکھا ہے۔ یوں وہ بھی خوشی سے پھولے نہ سماتے ہوئے بغلیں بجاتی چلی جاتیں۔ ایک دفعہ بابے کی بیوی اماں فاطمہ نے اسے کہا۔

''یہ تم کیا ہر اچھی بری چیز کی تعریفیں کرتے رہتے ہو؟ حتیٰ کہ بری سے بری شے کو بھی سونے چاندی سے ملا دیتے ہو۔'' جواباً الہٰ دین نے کہا۔

''او بھلی لوگے، اس کی تعریف کرنے میں میرا کیا جاتا ہے، اب جو چیز جس نے خرید لی ہے وہ اسے واپس کرنے سے تو رہا۔ اگر وہ بری بھی ہے تو میرے برا کہنے سے سوائے اس کا دل دکھنے کیا اور تو کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اس سے تو ہی بتا مجھے کیا ملے گا؟ البتہ میری تعریف سے وہ مطمئن اور خوش ہو جائے گی۔ اس سے خدا بھی خوش ہوگا۔''

الہٰ دین کی چارپائی کے نیچے بہتی ہوئی صاف پانی کی کھال اور اوپر درختوں کا سایہ گرمی کی حدت کو اتنا کم کر دیتے کہ بابے الہٰ دین کے لئے پوری گرمیوں کا موسم معتدل بنا رہتا۔ الہٰ دین اگرچہ چارپائی سے اٹھ نہیں سکتا تھا کہ دس سال پہلے ٹانگوں پر ہونے والے گٹھیا کے حملے نے اسے چارپائی سے لگا

دیا تھا۔لیکن اس کے چاروں بیٹے اس سے اتنا ڈرتے کہ ہلکی سی آواز پر سہم جاتے اور بات سننے کو دوڑے چلے آتے۔ یوں تو ایک بیٹے کے علاوہ سب بالغ تھے مگر وہ سب الہٰ دین کے حکم کے نیچے ہی تھے۔ جو کچھ کماتے، الہٰ دین کی ہتھیلی پر لا رکھتے اور وقفے وقفے سے چارپائی پر نظر رکھتے۔ ذرا سی دھوپ پڑنے پر اسے اٹھا کر سائے میں کر دیتے۔ دن میں ایک دفعہ ضرور نہلاتے اور کھانا وقت سے منٹ بھر ادھر ادھر نہیں ہوتا تھا۔ منجھ کی کھری چارپائی پر کپاس کے دھاگے سے بُنی ہوئی دوہر اور تکیہ اتنے صاف اور سفید تھے کہ ان پر چمکتی دھوپ کا گمان ہوتا اور اس پر تکیے کے سہارے بیٹھا ہوا بابا الہٰ دین سفید لٹھے کے لباس اور سفید پگڑی باندھے واقعی کسی نواب کی صورت دکھائی دیتا۔ کوئی نیا آنے والا محسوس نہیں کر سکتا تھا کہ چارپائی پر بیٹھا ہوا شخص معذور یا غریب آدمی ہے۔ حالانکہ گاوں میں ہر کوئی جانتا تھا کہ ان کی معاشی حالت کیا ہے۔ مگر کڑوا تمباکو اور ٹھنڈی لسی پاس بیٹھنے اور ملنے والوں کے لئے ہر صورت مہیا رہتی کہ اس سے بڑھ کر دوسری کوئی شے ان دنوں تواضع کے لئے اُس سے بہتر اور سستی نہیں تھی۔ سڑک کچی ہونے کے باوجود اس پر گرد و غبار اس لئے نہیں تھا کہ وہاں ٹریفک نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ دن بھر میں ایک آدھ گڈھ یا کوئی سائیکل پر پھیری لگانے والا گزر جاتا یا پھر پیدل چلنے والے۔ باقی اللہ اللہ۔

خیر بابے الہٰ دین کو معذور ہوے کئی سال ہو چکے تھے اور اتنے ہی برس اس چارپائی اور چارپائی کے گرد پڑے موڈھوں پر بیٹھنے والوں کو گزر چکے تھے۔ جن میں شریف کھوکھر، مستا بھٹی، اسماعیل بھٹی، شیدا بٹیر، طفیل باجوہ، بابو رجب علی، جمال بھٹی اور دوسرے دو چار لوگ ایسے تھے کہ ان کو موت ہی ناغہ کروائے تو کروائے۔ الہٰ دین سمیت سب کے پاس اتنے قصے تھے کہ قیامت تک ختم نہ ہو سکتے، کبھی کوئی اپنا افسانہ سناتا اور کبھی کوئی اپنی کتھا چھیڑ دیتا۔ جس کے ساتھ ساتھ دوسروں کی چھیڑ چھاڑ سے وہ کتھا اتنی لمبی ہو جاتی کہ انہیں کچھ دیر کے لئے مشرقی پنجاب میں چھوڑے ہوئے اپنے گھر بار بھول جاتے۔ لیکن یہ ان کے جی بہلانے کا بہانہ تھا یا ہجرت کی یادوں سے دور رہنے کی ایک چال کہ ہر ایک کے پاس سنانے کو پرانے وطن ہی کی داستانیں تھیں۔ ہجرت کو چودہ سال گزر جانے کے بعد بھی نئے دیس کی ان کے پاس کوئی بات نہیں تھی یا وہ سنانا ہی نہیں چاہتے تھے۔ بہر حال جو کچھ بھی تھا، قصے پرانے ہی تھے۔ چنانچہ جمال بھٹی نے بیٹھتے ہی سامنے والے موڑھے کو کھینچ کر آگے کیا اور کاندھے سے پٹکا اتار کر اس پر رکھ دیا۔ پھر سر سے پگڑی اتار کر زانوؤں پر رکھی اور حقے کی نے اپنی طرف کھینچ کر بولا۔

''بھئی الہٰ دین! وطنوں کے قصے بھی عجیب ہیں، خدا دشمن کو بھی ان کی یاد نہ دلائے۔ بھلا اُجاڑے سے پہلے کسی کو پتا تھا کہ یوں دیس دیس مارے پھریں گے؟ فیروز پور میں چوری چکاری کا اچھا بھلا کاروبار تھا

اور عزت کی روٹی کھا رہے تھے۔ توبہ کر کے کہتا ہوں ان ہاتھوں سے سینکڑوں روپے گنے۔ خدا جھوٹوں کو اٹھنے سے پہلے قبض کرے، فیروز پور کی پانچ تحصیلوں میں کون تحصیل ایسی ہو گی جہاں سے ڈھور ڈنگر گھیر نہ لائے ہوں۔ اُس وقت چوری مردوں کا گہنا تھی۔ بس بھائی الہٰ دین ساری عزت اور محنت کی کمائی اُجاڑے نے کھا لی، سب کچھ لٹا کر پلو جھاڑا اور یہاں چلے آئے۔ ہاتھ کی ڈنگوری اور یہ کاندھے کا پٹکا بچا اس تباہی میں۔

بابا الہٰ دین جو اپنے تکیے سے سہارا لئے بیٹھا تھا، تھوڑا سا اور سیدھا ہوا اور ہنستے ہوئے بولا۔

''جمالے! شکر کر تُو سلامت چلا آیا۔ اس قیامت میں زندہ بچ کے نکل آنا بھی ولی اللہ ہونے کی نشانی ہے۔ جان ہے تو جہان ہے، قسمت میں لکھا ہے تو پھر فیروز پور میں چلے جائیں گے۔ ویسے اُجاڑے میں جس طرح ٹوکا چلا ہے، تیری گردن تو اس کی پوری حق دار تھی۔''

بابے الہٰ دین کی جمال پر اس پھبتی سے جمال سمیت سب ہنسنے لگے۔ پھر ہر ایک اپنی اپنی واردات بولنے لگا۔ اسی حقے کی گڑگڑاہٹ اور قہقہوں کی گونج میں بابا الہٰ دین نے کہا۔

''چل چھوڑ جمالے ان باتوں کو، تو اپنی چوریوں کا کوئی قصہ تو سنا۔''

جمال دین نے ہلکا سا کھنگھار لے کر گلا صاف کیا اور حقے کی نے حیات علی کی طرف کرتے ہوئے بولا۔

''ایک دفعہ ہوا یہ کہ کافی عرصہ ہمیں کسی گائے بھینس کھولنے کا موقعہ نہ ملا۔ میں اور اللہ رکھا (خدا اسے رب رسول کے واسطے جنت میں جگہ دے، اُجاڑے میں سکھوں کی کرپان کے صدقے چڑھ گیا) خیر ہم دونوں مال کی تاڑ میں پھرتے پھراتے روحی جا نکلے۔ وہاں ہمیں خچر ہاتھ لگ گئے، الہٰ دین تمھیں تو پتا ہے روحی کے خچروں کا، کتنے بڑے اور موٹے تازے، روحی کا چھولیا کھا کھا کے دنبے کی طرح ان کی چکلیاں نکلی ہوئی تھیں۔ لیکن اس وقت ہمیں ان کی وقعت کا اندازہ نہیں تھا۔ میں نے اللہ رکھا سے کہا، میاں رکھے ان گدھوں کا ہم کیا کریں گے؟ اس نے کہا بھئی چلو جو چار چھ روپے ہاتھ آئیں۔ اب اور کچھ نہیں ملتا تو بھوکے مرنے سے بہتر ہے انھی کو کھول کر لے جائیں۔ چنانچہ ہم وہ خچر لے آئے۔

اب ہمارے لئے مسئلہ پیدا ہوا کہ یہ چوری کے کھوتے کہاں ٹھکانے لگائیں۔ بڑی سوچ بچار کی، شرم کے مارے کسی کو بتاتے بھی نہ تھے کہ لوگ کہیں گے کہ اب جمال کی یہ اوقات رہ گئی وہ کھوتے چوری کرنے لگا، ڈوب کے مر جائے۔ اسی خموشی میں کئی دن گذر گئے۔ پھر اچانک مجھے ایک طریقہ سوجھا، میں نے سوچا کہ ہم یہ مال عیسے اور دلاور کو دے دیتے ہیں۔ مال کے بدلے میں مال کے طور پر۔ الہٰ دینا اپنے عیسے اور دلاور کو تو جانتے ہو، یہ دونوں بھی بڑے کاری گر چور تھے۔''

''ایسے ویسے چور..... جمالے میں تھوڑی دیر کے لئے تیری بات کاٹتا ہوں اور ایک چھوٹا سا

واقعہ اسی عیسے اور دلاور کا سناتا ہوں۔اس کے بعد تو اپنی بات سنانا۔'' بابے الہٰ دین نے دائیں ہاتھ سے اپنے پاؤں پر خارش کرتے ہوئے بات شروع کر دی۔

''ان دونوں کا ایک بڑا بھائی شبر علی تھا جو آج کل لائل پور میں ہے۔ یہ چوری چکاری سے ہمیشہ دور رہتا اور وائی بیجی کی محنت کر کے کھاتا تھا۔عیسٰی اور دلاور جب بھی کوئی مال مار کر لاتے ،دو تین دیگیں چاولوں کی پکا کر اللہ کے نام پر لوگوں اور غریب غربا کو کھلاتے۔اس کے خرچے کا تیسرا حصہ بھائی ہونے کے ناطے یہ شبر علی سے بھی وصول کرتے۔اب ان کا مال تو لوٹ مار کا ہوتا مگر شبر بچارے کو اپنے خون پسینے کی کمائی سے حصہ ڈالنا پڑتا۔دو تین سال تو وہ حصہ بھرتا رہا آخر کب تک ساتھ نبھاتا۔ایک دن بچارا تنگ آ کر کہنے لگا.....'بھائیو! اگر خدا اسی طرح راضی ہوتا ہے تو میں دوزخ میں ہی اچھا ہوں۔آئندہ تم اور تمھارے خدا سے میرا کوئی تعلق نہیں۔کیونکہ میں اپنے خون پسینے کی کمائی سے تمھارے حرام مال کو حلال نہیں کر سکتا۔اس طرح اس بچارے نے اپنی جان چھڑائی۔''

بابے الہٰ دین کی اس بات پر سب کی ہنسی چھوٹ گئی۔اس کے بعد الہٰ دین نے جمال سے کہا۔

''جمالے! اب تو اپنی بات شروع کر۔'' جمال بھٹی نے حقے کا ایک تازہ گھونٹ بھر کر بات وہیں سے پھر جوڑ دی۔

''تو میں کہہ رہا تھا بھائی اسماعیل! یہ دونوں بھائی ریاست پٹیالہ سے مال چوری کر کے فیروز پور میں لا بیچتے۔ہمیں یہ توقع نہیں تھی کہ وہ اتنی آسانی سے ہمارے کھوتوں کے ساتھ اپنی گائے بھینسوں کا سودا کرنے کے لئے تیار ہو جائیں گے۔لیکن ہم نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ برابر برابر ان سے سودا کر لیا۔یعنی تین خچروں کے عوض تین گائیں۔اس کامیاب سودے کے بعد ہم نے روحی کے خچروں پر ہی ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیئے اور جی میں بڑے خوش کہ ہم عیسٰی اور دلاور کو دھونی دے رہے ہیں۔اب کیا تھا، ہم دونوں روحی کے خچر چوری کر کر کے انہیں دیتے رہے اور وہ ان کے بدلے میں پٹیالہ کی گائیں بھینسیں ہمیں دینے لگے۔یہ کام تین سال تک چلتا رہا اور پورے تین سال تک ہم ان کو اس طرح احمق بناتے رہے۔ایک دفعہ ہم خچر لے کر آ رہے تھے کہ فاضلکا بنگلہ میں ہمیں ایک کمہار مل گیا۔اس نے کہا کہ یہ دونوں خچر مجھے بیچو گے؟ ہم نے کہا، کہیں تو بیچنے ہیں، تم لے لو۔وہ بولا، قیمت بتاؤ؟ میں نے کہا تم خود ہی بتا دو کتنے دو گے۔اس نے کہا دونوں کے تین سو لے لو۔لو جی یہ سنتے ہی میرے تو ہوش اڑ گئے۔اس وقت اچھی سے اچھی گائے کی قیمت بھی پچاس روپئے سے زیادہ کی نہیں بکتی تھی۔اب مجھے پتا چلا کہ خچر جسے ہم گدھا سمجھتے رہے وہ تو دراصل گائے سے تین گنا قیمتی تھا اور عیسٰی ہمیں بدھو بنا کر کتنا عرصہ ہمارا کباڑہ کرتا رہا۔

جمال کی اس بات سے سب ہنس ہنس کر دہرے ہونے لگے۔بابے الہٰ دین نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

''پھر کیا تم نے عیسٰی سے کوئی حساب کتاب کیا؟''

''حساب کتاب کیا کرنا تھا میاں الہٰ دین۔'' جمال بھٹی تاسف سے بولا۔

''اس کے بعد تو کچھ رہا ہی نہیں، اُجاڑے پڑ گئے اور وہ دونوں بہشتی تحصیل مکھسر میں سکھڑوں کے ہاتھوں حلال ہو گئے۔بس بھائی الہٰ دینو! جس طرح روزے مسلمانوں پر فرض کر دئے گئے ہیں اسی طرح جب سے میں پیدا ہوا ہوں میری قسمت میں نقصان فرض کر دیا گیا ہے۔لیکن سچ پوچھیں تو مجھے اپنے لٹنے کا نہیں ان کے مرنے کا بہت دکھ ہوا، خدا جانتا ہے بڑے جی دار آدمی تھے۔ایک دفعہ (نور محمد کو مخاطب کرتے ہوئے) نورے بھائی! آپ نے تو عیسٰی کو خود دیکھا ہے، جھنڈے پور میں لٹھ بازی کے مقابلے میں اس نے پورے دس لٹھ بازوں کو ہرایا تھا۔ایک ہی ہلے میں۔(ٹھنڈی سانس بھر کر) ہاااااا۔بس رہے نام اللہ کا۔''

جمال دین کے ان درد بھرے جملوں سے تھوڑی دیر کے لئے سب ہی رنجیدہ سے ہو گئے اور خاموشی چھا گئی۔اتنے میں سورج ماتھے کے کناروں پر آ چڑھا اور پیڑوں نے اپنی چھاؤں سمیٹ کر تنوں سے لگا لی جس کی وجہ سے موڑھوں اور بابے الہٰ دین کی چارپائی پر دھوپ کے گرم شیشے پڑنے لگے۔عین اسی وقت بابے الہٰ دین کا بیٹا منیر جو سب سے چھوٹا تھا وہ باہر نکلا اور الہٰ دین کی چارپائی کھینچ کر مزید پیڑ کے نیچے تنے کے ساتھ لگا دی تا کہ بابے پر دھوپ نہ پڑے۔اس کے بعد ٹھنڈی لسی کا ایک بڑا دونا بھر لایا جس میں سے سب نے ایک ایک گلاس تانبے کا لسی سے بھر کر پیا۔اس طرح سب ہی ایک بار مزید تازہ دم ہو گئے اور نئے سرے سے باتوں کے طوطے مینا اُڑانے لگے۔لہذا بابا الہٰ دین نے اپنے باپ کے ایک واقعے سے گفتگو کا دوبارہ آغاز کر دیا۔

''بابو رجب علی! پرانے لوگوں کی کیا بتاؤں.....'' الہٰ دین نے حقے کا ایک لمبا گھونٹ بھر کر اس کی نے مستے بھٹی کی طرف سرکاتے ہوئے کہا۔

''بس سادہ لوح بندے تھے۔فائدہ نقصان ان کی ضد میں تھا، اگر ضد پوری ہو جائے تو فائدہ ہی فائدہ، اگر ضد نہ پوری ہو تو نقصان۔اب میرے باپ خوشی محمد ہی کو دیکھ لو۔اللہ جنت نصیب کرے ان کا دماغ بھی اپنا ہی تھا۔مجال ہے کسی کی بات مان جائیں۔یہ بات اجاڑے سے کوئی آٹھ سال پہلے کی ہے۔اُس دفعہ بارشیں بہت ہوئیں اور روحی میں بارش ہونے کا مطبل تھا کہ غلہ وافر ہو گا اور اس کی بے قدری۔چنانچہ اس کی وجہ سے روحی میں چنے کی فصلوں کا سیلاب آ گیا۔اس بار ہماری چنے کی فصل بھی تین ہزار من ہوئی۔فیروز پور کی منڈی ہم سے کافی دور تھی البتہ تحصیل مکھسر دس کوس پر تھی۔اس وقت دو ہی بیل

گاڑیاں ہمارے پاس تھیں۔جن پر اتنی زیادہ فصل لاد کر لے جانا بہت مشکل تھا۔ ہری چند کھتری میاں جی کے پاس آیا اور ایک روپیہ فی من کے حساب سے پورا غلہ گھر سے اُٹھانے کا سودا کر لیا۔میاں جی نے کہا کل بتاؤں گا۔اس کے جانے کے بعد میاں جی نے منڈی سے ریٹ معلوم کرنے کے لئے بندہ بھیج دیا، پتا چلا کہ منڈی کا ریٹ ایک روپیہ چار آنے ہے۔بس پھر کیا تھا، میاں جی کا لاٹو گھوم گیا۔انہوں نے کہا، غلہ میں خود منڈی لے کر جاؤں گا، اس کھتری کو چار آنے کس بات کا منافع دوں؟ اب ہزار طرح سے ان کو سمجھانے والے، کہ میاں جی غلہ کھتری کو بیچ کر سر دردی سے بچو۔کس جھنجھٹ میں پڑنے والے ہو۔مگر ان کی جوتی سُنے۔ بنگلہ فاضلکا میں اس کا بیلی رفیعا کمھار تھا، اس کو بلا بھیجا اور تین آنے فی من کے حساب سے مکھسر کی منڈی میں غلہ پہنچانے کا اس سے معاہدہ کر لیا۔ وہ تیسرے دن ہی سو گدھا اور پندرہ بندے لے کر آ گیا۔ غلے کو گدھوں پر چھٹیوں کے ذریعے سے مکھسر کی منڈی میں ڈھونا شروع کر دیا۔اب کیا تھا، چل سو چل، پندرہ بندوں کی تین وقت کی روٹی اور سو گدھے کا چارہ بھی ہمارے ذمے تھا اور ساتھ روز کا دس روپئے خرچ۔سبز چارہ اس وقت تھا نہیں چنانچہ گدھے بھی ہر وقت چنے ہی کھاتے اور بے حساب کھاتے۔ یوں پورے ڈیڑھ مہینے میں پتا نہیں سو گدھوں اور پندرہ بندوں نے کتنے چنے اور کتنی روٹیاں کھائیں اور ہمیں کیا بچا؟ بس یہ ہوا کہ میرے والد میاں خوشی محمد کی ضد پوری ہوگئی۔ڈیڑھ مہینے بعد رفیعے کمھار کو تین آنے فی من کی مزدوری اور ایک آنہ فی من کے حساب سے انعام دے کر خوشی خوشی رخصت کیا۔اور بڑے فخر سے کہنے لگے۔دیکھ لو اسے کہتے ہیں عقلمندی، کھتری خوامخواہ میں چار آنے بچا رہا تھا۔''

الہٰ دین کے اس واقعہ سنانے پر سب نے اپنی اپنی رائے کا مزید نمک ڈالا۔اور سادہ لوح بزرگوں پر مزید کئی قصے سنائے گئے اور ان کی نیک روحوں پر رحمتوں کی دعائیں کی گئیں۔اس طرح کئی گھنٹے نکل گئے اور کسی کو پتہ بھی نہ چلا۔ اتنے میں بابے کے منجھلے بیٹے نے باہر آ کر کہا، میاں جی روٹی تیار ہوگئی ہے۔اس کا مطلب تھا کہ دوپہر کے سورج نے عصر تک چھٹی کا گھنٹہ بجا دیا۔ چنانچہ سب اُٹھ کر اپنے اپنے گھروں کو چل پڑے جبکہ الہٰ دین کا بیٹا اسے اُٹھا کر گھر میں لے گیا۔اور چار بجے سہ پہر تک محفل برخواست ہوگئی ۔

پورے گاؤں میں نہ تو کسی کے پاس ریڈیو تھا اور نہ ہی اخبار کی آمد، لیکن گاؤں شہر کے نزدیک تھا۔اس لئے روزانہ کوئی نہ کوئی خبر پہنچ جاتی جس پر اس وقت تک گفتگو چلتی جب تک اگلی خبر نہ پہنچ جاتی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب پاکستان بنے ابھی بارہ تیرہ سال ہوئے تھے اور گاؤں بھی شہر کے مضاف میں تھا جہاں برلہ ٹیکسٹائل مل کی وجہ سے سرخ انقلاب کی باتیں شہر کے گلی محلوں میں پھیلی ہوئی تھیں۔ چنانچہ بابے الہٰ دین کے مجمعے میں بھی اکثر اس کے متعلق خبریں پہنچتیں جو زیادہ تر راؤ اصغر علی ہی کی زبانی بیان ہوتیں۔ راؤ اصغر علی کا

وقت بابے الہٰ دین کے پاس آنے کا ٹھیک چار بجے سہ پہر کا ہوتا۔اس کی ہر خبر کو اس لئے مستند سمجھا جاتا کہ ایک تو وہ پوری آٹھ جماعتیں پڑھا تھا اور دوسری وجہ یہ تھی کہ اس کے پاس گاؤں میں چینی کا ڈپو تھا۔اس سلسلے میں اسے اکثر شہر جانا ہوتا جہاں وہ ڈھونڈ ڈھانڈ کے ضرور کوئی نہ کوئی خبر لے ہی آتا اور جلدی سے بابے الہٰ دین کے گھر کا رخ کرتا۔راؤ صاحب گڑگاؤں کے رہنے والے تھے۔نجانے پوری برادری سے کٹ کر کیسے اس گاؤں میں آ بیٹھے۔ابھی سب لوگ اپنے موڑھوں پر دوبارہ آ کر بیٹھے ہی تھے کہ دور سے راؤ اصغر علی دائیں ہاتھ سے اپنی دھوتی کے پلو اڑستا ہوا آتا دکھائی دیا۔دھوتی کیا دوگز کی لنگی تھی جو ہمیشہ گھٹنوں سے اوپر ہی اوپر رہتی۔ پاؤں میں ٹائر کے جوتے جو دور سے ہی کھٹ کھٹ بجتے آ رہے تھے۔ پاس آ کر کرتے کی آستین سمیٹی اور ایک موڑھے پر ٹک گیا۔اس کے بعد حقے کے تین چار کش لئے، ایک بھرپور نظر اِدھر اُدھر بیٹھے لوگوں پر ڈالی اور پھر بابے الہ دین کی طرف منہ کر کے بولا۔

''میاں الہٰ دین! بس اب کچھ ہی دن رہ گئے گریبوں کی تقدیر بدلنے کے۔روس نے فیصلہ کر لیا ہے کہ پاکستان میں لال جھنڈا اب لگا ہی دیا جائے۔روس کے صدر نے خط لکھا ہے کہ جلدی سے گریبوں کو دن میں تین مرتبہ روٹی اور گھر دے دو ورنہ ہم چار مہینوں کے بعد خود آ کر حکومتاں کریں گے۔بس کچھ دن اور تنگی کاٹ لو۔پھر تو ہر شے مفت راشن میں آئے گی۔میاں الہٰ دین! ان ڈاکوؤں اور سرمایہ داروں سے جان چھوٹ جائے گی۔''

''راؤ صاحب! یہ ہر روز جو آپ سرمایہ دار سرمایہ دار کرتے رہتے ہو۔آخر یہ ہے کیا بلا؟'' مشتاق جلاہے نے حیرانی سے سوال کیا۔

''میں نے بھی آخر بڑی دنیا پھری ہے، فیروز پور، لدھیانہ، منٹگمری، ہر جگہ گیا ہوں اور پتن پتن کا پانی پیا ہے لیکن اس جانور کو نہیں دیکھا۔''

اس سے پہلے کہ راؤ اصغر مشتاق کے اس سوال سے چکرا جاتا، اسی لمحے مہنگا درزی غیر متوقع طور بول پڑا۔

''لو جی! اس کو دیکھو، مشتاق بھائی تو بھی جلاہے کا جلاہا ہی رہا۔اب جس کو سرمایہ دار کا نہیں پتہ پھر اسے اپنے سر کا پتہ ہے۔سر کا معنی، سر، اور مایا کا معنی پیسہ، اور دار کھوتے کو کہتے ہیں۔مطبل یہ کہ جس گدھے کے سر پر پیسے کی گٹھڑی ہو اسے سرمایہ دار کہتے ہیں۔'' مہنگے درزی کی اس وضاحت پر سب اسے تحسین سے دیکھنے لگے حتیٰ کہ راؤ صغر بھی اس کی اس بات پر حیران رہ گیا اور مہنگے درزی کی بھرپور تائید میں سر ہلا دیا۔اسماعیل بھٹی جس کے دو ہی کام تھے، پانچ مرتبہ مسجد میں جا کر نماز پڑھنا اور دوسرا شوق سے پائے کا شوربہ پینا، اس نے راؤ اصغر علی کی بات سن کر پہلے سر سے پگڑی اتار کر زانو پر رکھی پھر تسلی سے شفاف ٹنڈ پر

اپنی انگلیوں سے خارش کی اور پگڑی کو درست کر کے پھر سے سر پر رکھا اور بولا۔

''راؤ صاحب! یہ ساری بات تو تیری ٹھیک ہے پر سُنا ہے یہ روس والے پکے کافر ہیں۔ اگر آ گئے تو مسجدیں بند کر دیں گے، نماز پڑھنے والوں کو کوڑے ماریں گے۔'' اسماعیل کی بات سن کر ایک دفعہ سب گھبرا گئے اور فکرمندی سے بابے الہٰ دین کو دیکھنے لگے، اگرچہ الہٰ دین کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا لیکن سب جانتے تھے کہ اس کے بارے میں صحیح بات الہٰ دین ہی جانتا ہے۔ چونکہ راؤ اصغر الہٰ دین کی اس بارے میں بے خبری کی مجبوری کو جانتا تھا چنانچہ فوراً ہنستے ہوئے بولا۔

''لے بھائی الہٰ دین اور سن لو (پھر اسماعیل کی طرف منہ کر کے) بھائی اسماعیل تمھیں کس نے کہ دیا وہ کافر ہیں؟ تم بھی کاٹھ کیا اُلور ہے، بس شورہ پی لیا اور لیٹ گئے۔ او بھلے لوگا! بھائی الہٰ دین سے پوچھ، روس والے مسلمان ہیں یا کافر؟ (پھر الہٰ دین کی طرف منہ کر کے) الہٰ دینا بتا، اسماعیل کو روس والے کیا ہیں؟ او بھائی! وہ مسلمان ہیں مسلمان، گوشت کھاتے ہیں، سر پر ٹوپیاں رکھتے ہیں اور یہ جو سرخ جھنڈا ہے یہ علم ہے علم۔ امام حسین کا جھنڈا پہلے لال ہوتا تھا، پر تجھے کیا پتا؟''

اب دوسرے لوگوں کو بھی کچھ حوصلہ ہوا اور وہ بھی اسماعیل کی طرف دیکھ کر ہنسنے لگے۔ الہٰ دین جو معذوری کے سبب چارپائی پر سیدھا ہو کر نہیں بیٹھ سکتا تھا تکیے کا ہلکا سا سہارا لے کر پائیں کی جانب سرکا، اسماعیل سمیت سارا مجمع بابے الہٰ دین کی بات سننے کے لئے ہمہ تن گوش ہو گیا۔

''سائیں لوگا!'' الہٰ دین حقے کی نے ہاتھ میں لیتے ہوئے بولا۔

''مجھے یہ بتا اگر وہ مسلمان نہ ہوتے تو انھیں کیا ضرورت تھی غریبوں کو کھانا اور گھر دینے کی، جو جو ہمارے نبیؐ نے کہا ہے وہ پورا پورا تول کر وہی کچھ تو کر رہے ہیں، اسی لئے تو امام حسین کا علم کا نشان لال جھنڈا ان کے پاس ہے۔ دوسری بات یہ کہ اگر وہ کافر ہوتے تو ایران کا بادشاہ ان کے ساتھ کیوں صلح صفائی سے رہتا؟''

حیات دین جو ساری بات غور سے سن رہا تھا اس نے ہلکے سے خدشے کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''پر میاں الہٰ دین، پرسوں شیخ غلام کہہ رہا تھا کہ وہ شراب بھی پیتے ہیں۔''

اس سے پہلے کہ اس کی اس بات سے لوگ دوبارہ روس سے بدظن ہوتے، راؤ اصغر پھر ہنستے ہوئے بولا۔

''حیاتے! اگر تُو سال سال بغیر نہائے اور دن رات افیم کھا کھا کر مسلمان رہ سکتا ہے تو وہ کیوں نہیں مسلمان رہ سکتے؟''

راؤ اصغر کی اس پھبتی پر سب نے زوردار قہقہہ لگایا اور حیات خاں کھسیانا سا ہو کے حقہ پینے لگا۔

اس کے بعد کافی دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتیں رہیں اور پھر راؤ اصغر اُٹھ کر چلا گیا۔ ابھی وہ تھوڑی دور ہی پہنچا تھا کہ شیدا بٹیرا ایک بٹیرے کو مٹھلاتے ہوئے آن بیٹھا۔ اس کے ایک کندھے پر تکونی رومال تھا جسے وہ روزانہ اپنے ہاتھ سے دھوتا اور کاندھے پر ڈال لیتا لیکن دوسرے کپڑے ہفتے بعد ہی بدلتا۔ باپ سے آٹا پیسنے کا خراس وراثت میں ملا تھا جس کی حالت روز بروز بگڑتی جا رہی تھی۔ پتھر کے پُرگھس گھس کر آدھے رہ گئے تھے اور اونٹ خوراک کی کمی کی وجہ سے اس طرح ہڈیوں کا پنجر بن گیا تھا کہ جسم کے ہر حصے پر کوہان نکل آئے تھے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ شیدے کو سوائے بٹیروں کے کسی بات سے علاقہ نہیں تھا۔ بس چلتا تو رہا سہا خراس بیچ کر اس کے بھی بٹیر خرید لیتا لیکن مصیبت یہ تھی کہ ایک تو چھوٹا بھائی اس میں رکاوٹ تھا دوسرا یہ کہ اب اس کا کوئی خریدنے والا نہیں تھا۔ چھوٹا بھائی شریف آدمی تھا ورنہ یہ خراس بھی کب کا اُجڑ چکا ہوتا اور شیدا برسوں پہلے تھڑے پر آ جاتا۔ یوں تو بابے الہٰ دین کے پاس آ کر بیٹھنے والا ہر شخص اپنی ذات میں عجوبہ تھا لیکن شیدے بٹیر کی بات ہی کچھ اور تھی۔ اسے دیکھ کر ہر شخص چہک اُٹھتا اور ایک دوسرے کی طرف سے خوب چٹکلے چھوڑے جاتے۔ شیدا بٹیرا ابھی بیٹھا ہی تھا کہ اتنے میں چراغ اُرائیں آ گیا۔ چونکہ دونوں کی خوب لگتی تھی اس لئے محفل خوب گرم ہو جاتی۔ بابے الہٰ دین نے شیدے سے اس کے بٹیرے کا حال احوال پوچھا اور ابھی وہ جواب دینے ہی لگا تھا کہ چراغ بول پڑا۔

''الہٰ دین! بٹیرے کا حال کیا ہو گا۔ اس بچارے کی جان تو اس کے ہاتھوں کی بدبو سے ہی قبض ہوئی رہتی ہے۔''

چراغ کی پھبتی پر الہٰ دین سمیت وہاں بیٹھے ہوئے سب ہنس پڑے لیکن شیدے بٹیر نے فوراً ہی ایسا منہ توڑ جواب دیا کہ چراغ اُرائیں کی بولتی بند ہو گئی، بولا۔

''دیکھ الہٰ دین! اس تھوم خور کو سمجھا، جس کی بیوی صرف اس لئے طلاق لے گئی کہ یہ رات کو پادیں مار مار کر اس کو ہیضہ کر دیتا اور بچاری کو ساری رات سونے نہیں دیتا تھا۔ اسی لئے اس کی بیماری نہیں جاتی تھی۔ شوہدی سارا دن حواس باختہ باولی باولی پھرتی رہتی۔ آخر اُس نے سوچا، جان ہے تو خاوند بہت ..... لہٰذا چھوڑ کر چلی گئی، مگر اس ڈھیٹ کو ابھی تک شرم نہ آئی۔ اسی بٹیرے کی قسم، میں ہوتا تو وہیں نیلا تھوتھا کھا کے مر جاتا مگر میں بھی کس کو کہہ رہا ہوں؟ یہ باتیں تو غیرت مندوں کے لئے ہیں۔''

شیدے کے جوابی حملے پر سب کی طرف سے زوردار قہقہہ لگا اور چراغ اُرائیں بچارا بجھ سا گیا۔

بہرحال حقے کے ساتھ باتوں اور قصہ گوئی کے پرے جمے ہوئے تھے۔ انہی قصوں، آپ بیتیوں اور جگ بیتیوں میں کبھی کبھی بابو رجب علی کی شاعری چل پڑتی جس پر خاص کر مشتاق جلاہا جھوم جھوم کر واہ واہ

کرتا۔شام چھ بجے چونکہ لوگ اپنے کام کاج نپٹا کر فارغ ہو جاتے تھے اس لئے پورے دن کے معمول سے آٹھ دس لوگ اور بڑھ جاتے اور یہی وقت بابو رجب علی کی شاعری کا ہوتا۔ بابو رجب علی کا دادا پہلے پہل مسلمان ہوا تھا اس لئے لہجہ ابھی تک خالص سکھ تھا جس میں رجب علی کمشری پڑھتے ہوئے لہریں لیتا نظر آتا۔اسے سننے کے لئے دوسرے راہگیر بھی رک جاتے۔اس کے ساتھ ہی شریف کھوکھر، مستا بھٹی، اسماعیل بھٹی، شیدا بٹیر، طفیل باجوہ، جمال بھٹی اور دوسرے دو چار آدمی بھی خوب داد دیتے۔ بابو رجب علی ساٹھ کے پیٹے میں تھا اور مشرقی پنجاب میں اس کی شاعری کی شہرت گھر گھر تھی۔ فیروز پور کی ایک بستی کالاٹبہ سے اُٹھ کر اس گاؤں میں چلا آیا۔اب چونکہ یہاں کوئی سننے والا نہیں تھا اس لئے یہی چار پائی ان کو غنیمت تھی۔آج بھی کوئی نئی چیز لکھی تھی، بھاگے ہوئے چلے آئے اور بیٹھتے ہی حقے کے دو چار گھونٹ لئے، جیب سے رومال نکال کر ماتھے کا پسینہ پونچھا، پھر رومال کو تہہ کر کے جیب میں رکھا اور دوسری جیب سے گورمکھی میں لکھا ہوا کاغذ نکال کر تھوڑا سا ادھر ادھر بیٹھے ہوؤں پر نظر ماری اور بولا۔

''لومترو! سنو، بالکل سجری کو یتا لکھی آ، سن کے جی ٹھر جاوے گا۔'' تب الہٰ دین سمیت سب ہمہ تن گوش ہو گئے۔اور انہوں نے قصہ شاہ داؤد سنانا شروع کر دیا۔

میاں جی کو چار پائی پر پچیس سال ہو گئے تھے۔اس عرصے میں ان کے ساتھ والے کئی پنچھی ایک ایک کر کے اُڑ گئے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے، وہ منگل وار آٹھ جولائی کا دن تھا۔گرمی سے زمین کا سینہ تپ کر ایسا جیسے آگ پر تانبا چڑھا ہو اور سورج کی شعاعیں آدمی تو کیا پانی کا کلیجہ چیر رہی تھیں۔میاں جی کی چار پائی معمول کے مطابق میں خود پیڑوں کی چھاؤں میں رکھ کر اور موڑھے بچھا کر کام پر چلا گیا۔اس دن مجھے رینالہ جانا تھا۔اور نذیر ہمیشہ کی طرح آج بھی گھر پر نہیں تھا۔جبکہ اماں رفیق کے ساتھ اس کے سسرال گئی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ میں دوپہر تک لوٹ آؤں گا مگر لیٹ ہو گیا۔میاں جی کی مجھے فکر تو کافی تھی لیکن تردد اس لئے زیادہ نہیں تھا کہ آس پاس بیٹھنے والے اس کی خبر رکھیں گے۔لیکن میں جو تین بجے سہ پہر وہاں پہنچا تو کلیجہ دہل کر رک گیا اور جگر جل کر بھن گیا۔کیا دیکھتا ہوں، میاں جی اکیلے چار پائی پر بیٹھے ہیں۔کوئی آدم زاد وہاں موجود نہیں اور وہ چار پائی پر بیٹھے دھوپ کی کڑاہی میں جل رہے ہیں۔ دھوپ ایسی کہ خدا بھی اس سے پناہ مانگے۔ جولائی کی اس سخت دھوپ میں معذور اور اُٹھنے سے لاچار میاں جی اپنے پسینے کے پانی میں بار بار بھیگ رہے تھے اور بار بار سورج کی آگ اس پانی کو بھاپ بنا کر اُڑا رہی تھی۔

بیٹا کیا بتاؤں، اس دن تیرے دادا کو یوں دھوپ کے آگے لاچار دیکھ کر میری کیا حالت ہوئی۔ دل دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔جی چاہا سڑک پر ٹکریں ماروں۔اور ایسا پاگل پن چھایا کہ سڑک پر کھڑے ہو

کر گاؤں والوں کو بیہودہ گالیاں بکنے لگا کہ کیا میاں جی دھوپ میں بیٹھے ہوئے کسی کو نظر نہ آئے؟ حرامزادے دیکھ کر گزرتے رہے اور کسی نے چار پائی اُٹھا کر سائے میں نہیں کی۔اسی غصے اور باؤلے پن میں کئی گالیاں میاں جی کو بھی دے گیا کہ اس نے کسی راہگیر کو کیوں نہیں کہا کہ چار پائی اٹھا کر سائے میں کر دے۔میاں جی سر نیچا کئے مسلسل چپ بیٹھے میری بلند بانگ گالیاں سنتے رہے اور کچھ منہ سے نہ بولے۔ خیر اسی غصے میں میں نے ان کو اُٹھایا اور گھر کی طرف لے کر بھاگا۔انہیں اُٹھاتے ہی ایسے لگا جیسے میں نے آگ کے کوئلے پکڑ لئے ہوں۔جسم اس قدر گرم تھا۔جلدی سے لے جا کر نلکے کے نیچے بٹھایا اور ٹھنڈا پانی اوپر پھینکنے لگا۔بس پانی پھینکتا جاتا تھا اور لوگوں کو گالیاں دیتا جاتا تھا۔اس بے انتہا غصے کے عالم میں میرے منہ سے جھاگ بہہ رہی تھی۔ میں سچ بتاؤں اگر تب کوئی گھر کا فرد گھر میں ہوتا، اور میاں جی کے ساتھ ایسا واقعہ ہو جاتا تو میں اسے مار مار کر ادھ موا کر دیتا۔لیکن اب تو گھر میں نہ ہونے کی وجہ سے جتنا گھر والے قصور وار تھے اتنا ہی میں بھی تھا۔اسی وجہ سے آج زندگی میں پہلی دفعہ میں نے میاں جی کے سامنے نہ صرف دلیری سے لوگوں کو گالیاں دیں بلکہ خود میاں جی پر بھی برس گیا تھا۔اور وہ خلاف توقع چپ سنتے رہے۔نہلانے کے بعد میں نے انہیں گھر میں موجود شہتوت کے نیچے بٹھایا اور پھر بڑی دیر تک دستی پنکھا جھلتا رہا۔ساتھ ساتھ بڑبڑاتا بھی رہا۔اس کے بعد مٹی کی کوری چاٹی سے پیتل کے دو گلاس ٹھنڈی لسی کے بھر کر پلائے۔اور کھانا کھلایا۔اس سارے عرصے میں وہ بالکل بھی نہیں بولے۔اتنے میں پانچ بج گئے اور اماں بھی آ گئی۔ میں اس قدر شرمندہ تھا کہ اماں سے آنکھیں نہیں ملا رہا تھا۔اماں جو سارا دن میاں جی کی پل پل خبر رکھتی، آج ہی گھر نہ تھی تو اس کو یہ حالت ہو گئی۔ خیر اس کے آنے کے بعد میں خاموشی سے گھر سے باہر نکل گیا۔لہذا اماں جی کو کچھ پتہ نہ چلا کہ کیا واقعہ ہوا ہے۔

دوسرے دن میں صبح اذان کے وقت اُٹھا تا کہ میاں جی کا حقہ تازہ کر دوں کیونکہ صبح کاذب کے حقہ تازہ کرنے کا کام برسوں سے میرے ہی ذمے تھا۔ جب میں نے حقے پر چلم رکھ کر ان کی چار پائی کے پاس رکھی تو انہوں نے مجھے کہا۔

''پتر بشیر! ایک منٹ یہاں بیٹھو۔'' اب چونکہ میرا کل والا جوش ٹھنڈا ہو چکا تھا اور پورے حواس میں تھا اس لئے ڈرنے لگا کہ اب میاں جی پتا نہیں کیا کہیں گے۔ خیر ڈرتے ڈرتے ادوائن کی طرف بیٹھ گیا۔اب وہ آہستہ سے بولے۔

''بیٹا! مجھے ایک بات بتا، تم لوگوں نے میری کتنے سال خدمت کی ہے؟''

میں چپ رہا اور کچھ جواب نہ دیا حتیٰ کہ آنکھیں بھی نیچے کئے رکھیں۔آخر کچھ لمحوں کے بعد وہ خود

ہی بولے۔

''دیکھ پتر! آج اس چارپائی پر مجھے پچیس سال ہوگئے، اس سارے عرصے میں تم نے اور تمھاری ماں اور بھائیوں نے میری خدمت کا حق ادا کر دیا۔ جس کا اجر خدا ہی کے پاس ہے۔ لیکن دنیا کانچ کے پیڑ کی طرح ہے جس کا نہ تو سایہ ہے اور نہ ہی اس کا پھل ہضم ہوتا ہے۔ اب اگر کل میں کسی پاس بیٹھنے والے یا راہگیر کو کہہ دیتا کہ میری چارپائی چھاؤں میں کر دے۔ وہ چارپائی تو چھاؤں میں کر دیتا لیکن اس کے ساتھ ہی سارے گاؤں میں کہتا پھرتا، دیکھو بھائی! کیا خون سفید ہوگیا ہے۔ الہٰ دین کے پانچ بیٹے ہیں لیکن وہ بچارا دھوپ میں لاچار پڑا جل رہا تھا، کوئی پوچھنے والا نہیں تھا۔ میں نے اس کی چارپائی اٹھا کر سائے میں کی اور ٹھنڈا پانی پلایا۔ بس خدا کسی کو نافرمان اولاد نہ دے اور معذور ہونے سے پہلے ہی اُٹھا لے۔ پتر! مجھے بتا، پھر تمھاری ساری عمر کی خدمت اور میری عزت بازاروں میں کس بھاؤ بکتی اور پاس آ کر بیٹھنے والوں کے آگے میرا کیا وقار رہتا؟ لیکن کل میں اس لئے چپ رہا کہ غصے میں آدمی کا دماغ کسی بات کو نہیں مانتا۔''

میاں جی کی اس بات میں ایسی شفقت اور محبت تھی کہ میرے آنسو نکل آئے اور میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اسی حالت میں انھوں نے میرا سر اپنی گود میں رکھ لیا جس میں پوری کائنات کا پیار بھرا تھا۔''

اس کے بعد میرے والد نے دادا کی قبر کی مٹی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے میری طرف دیکھا اور بولے۔

''بس بیٹا! اس واقعے کے چوتھے دن ہی تیرے دادا کی چارپائی اُٹھ کر اس قبرستان میں آ گئی، لیکن یاد رکھنا اس قبر میں تیرے دادا کی چارپائی دفن نہیں ہوئی بلکہ ایک پوری تہذیب دفن ہوگئی ہے۔''

اس کے بعد انہوں نے میرا بازو پکڑا اور قبر کے پہلو سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ پھر میرا سہارا لے کر چلنے لگے۔ اسی لمحے میں نے محسوس کیا کہ میرے والد صاحب کے ساتھ بھی ایک تہذیب وابستہ ہے۔ اور اب وہ بھی کافی بوڑھے ہوگئے ہیں۔

◂◂ ● ▸▸

Mirza Ghalib Kitab Markaz
City Arcade Plaza Basement Shop No. 10
I.I.T. Markaz Islamabad (Pakistan)
+3117779783

● ڈاکٹر نگہت نسیم

ابو پاری

شاہو کو گم ہوئے چار گھنٹے ہو چکے تھے۔

کہاں گیا ہوگا؟

کس کے ساتھ ہوگا؟

ہائے اگر اسے کچھ ہو گیا تو..... میں یہ سوچتے ہی گھبرا گیا۔ ایک بار پھر ماہ نور، زیبا سے پوچھا کہ بھائی کو آخری بار انہوں نے کہاں دیکھا تھا؟ وہ دونوں روہانسی اسے ہی ڈھونڈ رہی تھیں اور بار بار یہی کہے جا رہی تھیں۔

''ابو جی! شاہو یہاں دروازے کے پاس ہی کھڑا تھا۔'' میں پھر چیخ پڑا۔

''اور تم لوگ سوئے ہوئے تھے اس وقت..... اور..... آپ..... کہاں تھیں..... جو بیٹے کا خیال نہ رکھ پائیں.....؟'' مجھے رہ رہ کر سلمٰی پر غصہ آ رہا تھا کہ وہ تو ماں تھی، اس نے کیسے لاپروائی کر لی کہ شاہو کو داخلی دروازے پر دیکھا اور سرزنش نہیں کی۔

''آپ کو معلوم ہے نہ کہ وہ بول نہیں سکتا..... کسی کو اپنی بات سمجھا نہیں سکتا..... وہ اپنا دفاع بھی نہیں کر سکتا.....'' اس کے ساتھ ہی میری آواز نے میرا ساتھ چھوڑ دیا۔ مجھے شاہو کی معذوری نے ذہنی مریض بنا ڈالا تھا۔ میں جو پوری دنیا کو اپنے کاندھے پر اٹھائے پھرتا تھا، اس کی پیدائش کے چھ ماہ بعد بھر بھری مٹی کی طرح زمین بوس ہو گیا۔

''سنئے! مل جائے گا شاہو.....'' سلمٰی کے نرم ہاتھ بھی مجھے اپنے شانوں پر کانٹوں کی طرح لگ رہے تھے۔

شاہو بھلا کہاں جا سکتا ہے؟ کوئی دوست تو دور کی بات اس کی تو اپنی ماں بھی اس کے لئے چھاؤں نہ تھی اور بہنیں بھی غمگسار نہ تھیں۔ گھر میں اسے اتنا ہی پوچھا جاتا جتنا ضروری ہوتا۔ میرے خدا! اسے تو سوائے بلاوجہ ہنسنے، ایک ٹک بولنے والے کو دیکھتے رہنے یا چلتے رہنے کے علاوہ کچھ اور آتا بھی تو نہ تھا۔ میری آنکھوں میں اپنے بیٹے شاہو کی تنہائی پر نمی سی اُتر آئی۔ قدرت بھی عجیب تھی۔ اس کی کل کائنات میں شاہو کو صرف دو لفظ نصیب ہوئے تھے..... 'ابو اور پاری'..... پاری کا ذہن میں آتے ہی میں اسے ڈھونڈنے صحن سے اپنے کمرے میں آ گیا کہ اس وقت وہ دونوں زیادہ تر میرے ہی کمرے میں کھیلتے تھے۔ میں نے جہاں تک ممکن ہو سکتا تھا ہر

کونے میں، بیڈ کے نیچے، الماری کے اندر دیکھ ڈالا، پر پاری ہوتی تو ملتی۔ پاری شاہو کی بلی تھی جو ہم نے دو ماہ پہلے ڈاکٹر ریشم کے کہنے پر خریدی تھی۔ میں نے وہیں سے زیبا سے پاری کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ بھی صبح ہی سے غائب ہے۔ اوہ میرے خدا! کہیں شاہو اسے ڈھونڈنے گھر سے باہر نہ چلا گیا ہو۔ سوچتے ہی میرے پیروں تلے جیسے زمین نکل گئی۔ حلق میں کانٹے سے پڑ گئے۔

''میرے خدا! چار گھنٹوں سے شاہو نہیں ہے اور تم لوگ اتنے سکون سے بیٹھے کیا میرا انتظار کر رہے تھے!'' میں اپنی بے بسی اور تینوں کی بے حسی پر چلا پڑا۔

''اور مانئے آپ اس ڈاکٹر ریشم کی باتیں۔'' سلمٰی کو تو جیسے زہر اگلنے کا بہانہ مل گیا تھا۔ میں نے حیرانگی سے اسے دیکھا جو باورچی خانے سے مسلسل بول رہی تھی۔ خدایا یہ کونسا وقت ہے ڈاکٹر ریشم کو کوسنے کا، پر سلمٰی کی شکی اور جھکی طبعیت سے کون جیتے۔ میں کمرے سے نکل کر دوبارہ صحن میں آ گیا جہاں داخلی دروازے کے عین سامنے ایک چھوٹا سا چبوترا بنا ہوا تھا۔ صبح میں شاہو کو یہیں بٹھا کر ناشتہ کروایا کرتا تھا اور یہیں سے اسے خدا حافظ کہہ کر آفس کے لئے گاڑی میں بیٹھ جاتا تھا۔ اور وہ مسکرا کر کہتا۔

''ابو..... پاری!'' میں نے ایک بار پھر اس کی تلاش میں چبوترے کے آس پاس، ادھر ادھر دیکھا۔ بارہ سالہ شاہو جس کی جسمانی ساخت اور ذہنی عمر صرف پانچ سال کی تھی، وہ کہیں پر نہیں تھا۔ پر میرے تصور میں وہ ابھی تک جیسے چبوترے پر ہی بیٹھا ہوا تھا۔ اور اس کے ساتھ اس کی بھوری بلی 'پاری' بھی اس سے جڑ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ پاری کے بھورے جسم پر کالے رنگ کے دائرے اور کالے ہی پیر اسے کئی بلیوں میں منفرد کرتے تھے۔ جب وہ اپنے مخاطب کی بات سنتے ہوئے اپنے کان اسی رخ پر ہلاتی اور اپنی بڑی بڑی ہلکی بھوری آنکھیں کھولتی بند کرتی تو جیسے چابی سے چلنے والی کوئی گڑیا لگتی۔ اس کے گلے میں لال رنگ کے بینڈ کے ساتھ پرویا ہوا چھوٹا سا سنہرا گھنگھرو جہاں کہیں بجتا شاہو مسحور ہو کر اس کو ڈھونڈنے نکل پڑتا۔ پھر دونوں دنیا سے بے نیاز ایک دوسرے کے آمنے سامنے یوں بیٹھ جاتے جیسے دو دوست مدتوں بعد ایک دوسرے سے ملے ہوں۔ پر آج وہ دونوں دلدار گھر پر نہیں تھے۔

میں نے نمناک آنکھوں سے باہر بڑھتی ہوئی شام کو بے بسی سے دیکھا اور تیزی سے چھت کی طرف لپکا کہ کہیں وہ کھیلتے کھیلتے وہاں نہ چلے گئے ہوں۔ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے مجھے شاہو کی زندگی کے اُتار چڑھاؤ بھی یاد آتے گئے۔ وہ، ماہ نور اور زیبا دونوں سے بڑا تھا۔ اس کا اصل نام شاہین تھا پر لاڈ میں پیار سے ہم سب اسے شاہو کہہ کر پکارتے تھے۔ میں شاہو کو پا کر اتنا خوش تھا کہ اس دن میرا دل کیا کہ خدا کو بھی مٹھائی بھیج دوں۔ میں اپنی اس نئی پہچان پر کہ میں اب سرخ و سفید، بولتی ہوئی آنکھوں اور پھولے ہوئے گالوں

والے شاہو کا باپ ہوں کئی بار خود پر فخر کرنے بیٹھ جاتا۔ میں اپنی خوشی میں مگن ہی رہتا جو سلمٰی کی تشویش مجھے خبردار نہ کرتی۔ شاہو کو گردن ٹکانے میں دقت ہو رہی تھی۔ سہارے سے بھی بیٹھ نہ پاتا تھا۔ میں اسے سلمٰی کا وہم ہی سمجھتا جو ایک دو ماہ کی دیر سویر ہوتی۔ پر شاہو نے جب مجھے ابو کہہ کر نہیں پکارا تو میں چونک گیا۔ اس نے میری طرف محبت سے نہیں دیکھا تو میں ڈر گیا۔ میں جب آفس سے آتا تو وہ لپک کر مجھ تک نہیں پہنچ پاتا تو میں خوفزدہ ہو گیا۔ سلمٰی جو پہلے ہی سے پریشان تھی اب خاموشی سے مجھ سے لاتعلق ہو گئی جیسے شاہو کی معذوری میں سارا قصور میرا تھا۔

سلمٰی کی لاتعلقی اتنی بڑھی کہ میں اکیلا ہی شاہو کو لئے ایک ڈاکٹر سے دوسرے ڈاکٹر تک دوڑتا رہا۔ پر ہماری قسمت لکھی جا چکی تھی۔ میں دن رات افسردہ اور الگ تھلگ رہنے لگا اور سلمٰی اپنے معذور بچے کو ذہنی طور قبول نہ کر سکنے کی وجہ سے اس سے بھی دور ہو گئی۔ پھر یوں ہوا کہ سلمٰی، ماہ نور اور زیبا ایک پارٹی بن گئے اور میں اپنے شاہو کے ساتھ اکیلا پڑ گیا۔ سارا دن آفس میں رہنے کے بعد گھر آتا تو مجھ سے جو جو بن پڑتا میں شاہو کے لئے کرتا۔ شاید اسی لئے کسی کو نہیں معلوم تھا کہ شاہو اور پاری کہاں چلے گئے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے دل ہی دل میں سب دعا کر رہے ہوں کہ خدا نہ کرے جو شاہو ملے۔ مجھے شاہو کے ساتھ سلمٰی کی سرد مہری بہت دکھی کرتی تھی۔ پر ہر بار خود کو بہلانے بیٹھ جاتا کہ وہ عورت پہلے ہے پھر ماں ہے۔ معذور بچے کے کام دس بچوں کے برابر ہوتے ہیں۔ پیمپرز بدلنا، کھانا کھلانا، نہلانا دھلانا، اس کی حفاظت کرنا، اس کی باتوں تک رسائی پانا، لوگوں کے ہر وقت کے دل دکھا دینے والے سوالات کو جھیلنا..... ہر پل اپنی تمناؤں اور خوابوں کو اُجڑتے دیکھنا کچھ بھی تو آسان نہ تھا۔ شاید ہم میں سے کوئی بھی کسی کے لئے تسلی نہ بن سکا تھا۔ میں نے سرد آہ بھری۔ ان دونوں کو چھت پر بھی نہ پا کر مایوسی سے سر کو جھکائے سیڑھیاں اتر کر پھر صحن میں آ گیا۔

جب سے ماہ نور اور زیبا نے اسکول جانا شروع کیا تھا تب سے شاہو اور بھی تنہا ہو گیا تھا۔ سلمٰی کے گھر پر ہونے کے باوجود وہ اداس رہتا۔ میں جب بھی آفس سے واپس گھر آتا وہ اسی چبوترے پر ملتا جہاں چھوڑ کر گیا ہوتا جیسے سارا وقت وہ دھوپ چھاؤں کا گواہ رہا ہو۔ گھر بھر میں وہ صرف مجھ سے ہی مانوس تھا سو میری وجہ سے کھانا بھی ایک ہی وقت کھانے لگا تھا۔ اب تو کچھ ہفتوں سے اس کا وہ کھانا بھی برائے نام رہ گیا تھا۔ میں جب منت کرتا تو وہ اکثر میرے ہونٹوں پر ابو پاری کہتا ہوا اپنا منہ رکھ دیتا۔ ہائے! میرے بیٹے کو چومنا بھی نہیں آتا تھا۔ پچھلے ہفتے ہی تو پڑوس کے کریم صاحب کہہ رہے تھے کہ شاہو کا خیال رکھا کریں۔ اس کے سامنے گاڑی بھی آ جائے تو وہ ہٹنے کی بجائے اس کے آگے آگے چلتا رہتا ہے۔ کریم صاحب کا ساتھ شمیم صاحب نے بھی دیا کہ وہ بھی اسی طرح کے واقعات کے چشم دید گواہ تھے کہ کئی بار انھوں نے شاہو کو گلی کے

کتے کے ساتھ بیٹھے دیکھا تھا۔ کتا بھونکتا رہتا اور شاہو ہنستا رہتا۔ میں شرمندہ سا ہو گیا۔ کیا کہتا کہ میں تو سارا دن آفس میں ہوتا ہوں اور سلمیٰ کو کچھ بھی سمجھانا بیکار ہے۔

اس دن کی شرمندگی، ضمیر کی ملامت اور سلمیٰ کی روز کی بحث تکرار کا ایک فائدہ ہوا کہ شاہو کو اسپیشل اسکول میں داخل کروانے کا ارداہ جو کئی برسوں سے غیر اہم جان کر آج اور کل پر ٹل رہا تھا وہ تکمیل پا گیا۔ اس کا اسپیشل اسکول صبح نو بجے سے دوپہر تین بجے تک کا تھا اور فیس بھی نہ ہونے کے برابر تھی۔ دل میں سکون سا اتر آیا کہ اس بہانے سلمیٰ کو بھی تھوڑا آرام مل جائے گا اور وہ بھی کچھ سیکھ جائے گا۔

شاہو کے اسکول کی ڈاکٹر ریشم نے اس کا جسمانی اور نفسیاتی تجزیہ کرنے کے بعد یہ کہہ کر ہمیں حیران کر دیا کہ شاہو کو ڈپریشن ہے۔ وہ کہہ رہی تھی کہ دنیا اتنی خودغرض ہو چکی ہے کہ عام انسانوں کو قبولیت نہیں ملتی شاہین تو پھر ایک معذور بچہ ہے۔ میں بے بسی سے ڈاکٹر ریشم کو دیکھتا رہ گیا پر انہیں بتا نہ سکا کہ مجھے اپنے بیٹے کے ساتھ معذور کا لفظ کبھی اچھا نہیں لگا۔ ایسے لگتا ہے جیسے کسی نے مجھے باپ کی گالی دے دی ہو..... یا تہمت لگا کر بدنام کر ڈالا ہو، یا پھر اپنوں غیروں کی عدالت میں مجرم بنا دیا ہو۔ میں تو یہ بھی انہیں نہ بتا سکا کہ سلمیٰ اور بچے جہاں تک ممکن ہوتا شاہو سے فاصلہ رکھ کر چلتے تھے۔ اسی بے توجہی سے وہ الگ تھلگ رہنے لگا تھا۔ ڈاکٹر ریشم کی تجویز تھی کہ شاہو کو ڈپریشن سے باہر لانے کے لئے کوئی پالتو جانور کتا یا بلی رکھ دیں تا کہ اس کا دل لگ جائے، توجہ بٹ جائے۔ بہت سوچ سمجھ کر ہم سب نے فیصلہ کیا کہ کم خرچ اور کم توجہ پر بھی خوش رہنے والی ایک بلی خرید لیتے ہیں۔ اتفاق رائے سے اسی ہفتے بلی ہمارے گھر آ گئی۔ شاہو اسے دیکھ کر حیران سا تھا۔ پھر جانے کیا ہوا..... مسکراتے ہوئے اپنا منہ بلی کے سر پر رکھ دیا..... اور ''ابو پاری'' کہہ کر مجھے تائید کے لئے دیکھا۔ میں نے خوشی سے سر ہلاتے ہوئے پانچ ہفتے کی بلی کا نام 'پاری' رکھ دیا۔

پاری بڑی ہی ملنسار اور خوش اخلاق بلی تھی۔ پہلے ہی دن اس نے بھی شاہو سے دوستی کر لی۔ وہ جہاں جاتا وہ سائے کی طرح اس کے ساتھ ہوتی۔ کبھی اس کی گود میں بیٹھی ہوتی تو کبھی اس کو کھینچ کر باہر لے جا رہی ہوتی تو کبھی دونوں ایک پتلی سی ڈنڈی جس پر میں نے لال رومال باندھ دیا تھا اس سے کھیل رہے ہوتے۔ شاہو ڈنڈی گھماتا اور پاری اس کو پکڑنے کے لئے اس کے گرد گھومتی رہتی۔ کتنے مہینوں کے بعد شاہو مسکرایا تھا۔ یونہی ایک دن کھانا کھاتے ہوئے شاہو کے منہ سے نوالہ زمین پر گر گیا جسے پاری نے دوڑ کر اپنے دانتوں میں دبا لیا اور اس کے سامنے لا کر رکھ دیا۔ شاہو نے وہی نوالہ محبت سے پاری کو ایسے کھلایا جیسے میں اسے کھلایا کرتا تھا۔ شاہو میں ایک مہربان انسان دوست کو دیکھ کر میں حیران ہی تو رہ گیا تھا۔

جس دن شاہو دیر تک سوتا رہتا اس دن پاری کو تنہائی کاٹنی محال ہو جاتی۔ کبھی اس کے ماتھے کو چوم

کر اسے جگا رہی ہوتی تو کبھی اس کے گالوں پر زبان پھیر کر شرارت کر رہی ہوتی۔ شاہو کی آنکھ اس وقت طرح کھل جاتی جب وہ اس کی گردن پر پیار کر رہی ہوتی۔ شاہو اسے دیکھ کر ادھ کھلی آنکھوں سے مسکرا دیتا۔ اور پاری اس کی ساری رمزیں، باتیں سمجھ لیتی اور اس کے ساتھ اس وقت تک لیٹی رہتی جب تک شاہو خود نہ اٹھ جاتا۔ ابھی کچھ ہفتوں پہلے ہی کی بات تھی..... چھٹی کا دن تھا وہ اسی چبوترے پر ہی بیٹھا ہوا تھا۔ اگلی کی طرف والی دیوار پر سے دو تین بلیاں کود کر ایک ساتھ گھر میں گھس آئیں۔ شاہو انہیں دیکھ کر ہنستا جا رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ کوئی ان بلیوں کو شاہو کے پاس سے ہٹاتا، جانے کس کونے سے پاری اُڑتی ہوئی آئی اور غرا غرا کر پنجے مار مار کر انہیں گھر سے باہر نکال دیا اور خود شاہو کی کمر سے اپنی کمر ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔ اس دن شاہو چبوترے سے اس وقت تک نہ اُٹھا جب تک اس نے خود آنکھیں نہ کھولیں۔ اسی رات پاری آخری نوالہ شاہو کے ہاتھ سے کھاتے ہوئے اس کی انگلیوں کو اپنی زبان سے چاٹ چاٹ کر خوشی کا اظہار کرتی رہی۔ میں رات گئے تک سوچتا رہا کہ خدا نے بولنے والوں کو ایسی محبت سے کیوں محروم رکھا۔ پھر دیر تک ایک ایسی محبت کے خواب دیکھتا رہا جو غمگساری اور دلداری کی رمزیں سکھاتی ہے۔ اظہار اور رشتوں کی قید سے آزاد کر دیتی ہے۔

اب دونوں اکثر ساتھ ہی کھانا کھاتے تھے۔ پاری جب تک شاہو کے ہاتھ سے اپنے کھانے کا آخری نوالہ نہ کھاتی اس کے پیچھے پیچھے پھرتی رہتی۔ کھانے کے بعد شاہو ٹی وی دیکھ رہا ہوتا تو وہ اچک کر اس کی گود میں بیٹھ جاتی اور اپنی زبان سے خود کو صاف کرتے کرتے اس کے ہاتھ پاؤں بھی صاف کرتی جاتی۔ شاہو کو یہ سب بہت اچھا لگتا تھا۔ اب تو وہ پاری سے ہوں ہاں میں باتیں بھی کرنے لگا تھا۔ باتیں کرتے ہوئے جب وہ اس کی کمر پر ہاتھ رکھتا تو اس کا لمس پاتے ہی پاری بل کھا کر اپنی گردن اس کے سامنے رکھ دیتی جسے شاہو اتنے پیار سے سہلاتا کہ پاری کی آنکھیں بند ہونے لگتیں۔ میرا بس نہ چلتا تھا کہ میں ڈاکٹر ریشم کو دنیا کا سب سے بڑا مسیحا کہہ دیتا جن کی وجہ سے شاہو اب گھر میں کسی کو 'وجہ شرم' نہ لگتا تھا بلکہ پاری کی وجہ سے اکثر موضوع سخن رہتا۔ شاہو کا یہ مثبت رویہ گھر کے ماحول کو جہاں خوشگوار بنا رہا تھا وہاں اس کی جانب سے سب اتنے مطمئن رہنے لگے تھے کہ اکثر گھر میں کسی کو دھیان ہی نہ رہتا کہ وہ کہاں ہے؟ آج بھی یقیناً یہی ہوا ہوگا۔ پر اب سردیوں کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ آجکل ویسے بھی دھند نے صبح کو شام اور شام کو رات کا بنا رکھا تھا۔ ایسے موسم اور وقت میں شاہو اور پاری کو کہاں ڈھونڈوں؟ اس پر گلی کے کتوں اور گاڑیوں کے ساتھ اندھیرے اور سردی کا خیال آتے ہی میری روح تک کانپ گئی۔ اب مجھے دونوں کو گھر سے باہر ڈھونڈنے میں ایک سیکنڈ بھی دیر نہیں کرنی چاہئے۔ میں نے جلدی سے کرسی کی پشت پر سے کالا

کوٹ اٹھا کر ابھی پہنا ہی تھا کہ ماہ نور کی آواز نے چونکا دیا۔

''ابو جی.....ابو جی.....! جلدی سے آیئے۔ شاہو اور پاری مل گئے ہیں۔'' ماہ نور کی آواز یوں لگی جیسے دونوں جہاں کی سب سے میٹھی آواز ہو۔

''کہاں سے ملے؟'' میں اپنی خوشی کو نہ چھپا سکا۔ ماہ نور مسکرا دی۔

''آیئے میرے ساتھ۔'' وہ اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھے مجھے بھی خاموش رہنے کا کہتے ہوئے شاہو کے کمرے کی طرف چل دی جو اس کے اور زیبا کے کمرے کے ساتھ ہی تھا۔ گھر لینے کے بعد ہم نے خاص طور پر ایک دروازہ دونوں کمروں کے بیچ بنوایا تھا جو ہمیشہ کھلا ہی رہتا تھا کہ ماہ نور اور زیبا کی نظر آتے جاتے شاہو پر رہے۔ وہ دونوں اسی دروازے کے پیچھے سے ملے تھے۔ شاہو شدید سردی میں کمبل کے بغیر ٹھنڈی ننگی زمین پر گھٹنے سکیڑے بے خبر سو رہا تھا اور اس کے ساتھ ہی پاری نیلے پھولوں والا کمبل اوڑھے شاہو کے بازو پر اپنا سر اور ایک ہاتھ اس کی گردن پر رکھے سو رہی تھی۔ شاہو نے کھڑکی کی طرف سے آنے والی ہوا سے بچانے کے لئے کمبل کے کونے کو اپنی مٹھی میں دبا رکھا تھا کہ کہیں پاری کو ٹھنڈ نہ لگ جائے۔ دونوں ایک دوسرے کی طرف منہ کر کے بے خبر سو رہے تھے۔ شاہو رحم دلی اور محبت کے اوج کمال پر تھا۔

مجھے یاد آیا۔ کل ہی تو سب کے لئے نئے کمبل آئے تھے۔ میں نے جب شاہو سے پوچھا کہ اسے کون سا رنگ پسند ہے تو وہ مسکرا دیا اور آہستگی سے بولا۔

''ابو پاری!'' شاہو کے لئے یہی دو لفظ اس کی کل کائنات اور اس کے ہر احساس کا اظہار تھے۔ پاری جو اس کے ساتھ ہی بیٹھی ہوئی تھی اُچک کر نیلے پھولوں والے کمبل پر بیٹھ گئی اور گردن موڑ کر شاہو کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھیں جگنوؤں جیسی جل بجھ رہی تھیں۔ شاہو نے ہاتھ بڑھا کر کمبل اپنے سینے سے لگا لیا اور 'ابو پاری' کہتا ہوا، اکیلے ہی کمبل گھسیٹتا ہوا اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔ اس کے پیچھے پیچھے مدھر گھنٹیاں بجاتی پاری جا رہی تھی۔ میں بے اختیار ہو کر وہیں دوزانوں بیٹھ گیا۔ میرا وجود آنسوؤں میں ڈھل گیا۔ خدایا جو محبت کرنا جانتے ہیں انہیں بولنا کیوں نہیں آتا۔

◀◀ ● ▶▶

21 Juction Road
Moorebank, NSW-2170 Australia
0425 20 1035

● دلشاد نسیم

کہنی کی چوٹ

امیر علی کی بیوی کا انتقال ہو گیا، بالکل اچانک۔ شہر بھر میں موذی بخار نے کئی گھروں سے میتیں اٹھائیں ان میں سے ایک گھر امیر علی کا بھی تھا۔ موت نے رخسانہ بیگم کو جب لے جانے کا بہانہ بنایا تو یہ بھی نہ دیکھا اس کے بیٹوں کا کیا ہو گا۔ امیر علی کی طرف دیکھنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ امیر علی جب بیوی کو بچانے کی کوششوں میں لگا ہوا تھا وہ نہیں جانتا تھا اس کی محنت اس کی دعائیں رائیگاں ہو جائیں گی اور جب رخسانہ کے چہرے کو نرس سفید چادر سے ڈھک رہی تھی تو اسے لگا اس کی پوری کائنات پر کسی نے گہرا پردہ ڈال دیا ہو۔ بس اب اس کے لئے سب ختم ہو گیا۔ اسے یقین آ گیا کہ اگر اس پوری دنیا میں کوئی بے حس ہے تو بس یہ موت ہے جو کسی کے جذبے کسی کی چاہت کو نہیں دیکھتی۔

امیر علی کی اپنی عمر بھی کیا تھی بس پینتالیس سال.....بھلا یہ بھی کوئی عمر ہے ایسا عذاب سہنے کی اسے خود پہ ترس آ رہا تھا۔ رخسانہ کا آخری دیدار کرتے ہوئے اس کے ساتھ گزارے بیس سال بیس لمحوں میں اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم گئے۔ وہ اس سے پانچ چھ برس چھوٹی تھی۔ کتنا خوبصورت وقت گزرا، کتنی حسین عورت تھی.....اب منوں مٹی کے نیچے جا سوئے گی۔ امیر علی کو اس وقت اپنے غم سے زیادہ حسین عورت کی جوان مرگی رلا گئی۔

بچے بہت چھوٹے نہ تھے کہ سنبھل نہ پاتے، سنبھل گئے۔ اسے بھی لگا جیسے وہ بھی رفتہ رفتہ سنبھل رہا ہے۔ بیوی کی موت کہنی کی چوٹ جیسی ہے لگے تو جان کھینچ لیتی ہے مگر یہ اذیت بہت دیر تک نہیں رہتی، سنبھالا مل جاتا ہے لیکن امیر علی کے لئے کہنی کی چوٹ روگ بن گئی۔

چالیسواں ہوا تو سب دوست احباب اور رشتے داروں نے گھر میں عورت نہ رہنے پر اندیشہ ظاہر کیا کہ اب گھر، گھر نہیں رہے گا۔ گھر تو بناتی ہی عورت ہے جس گھر میں عورت نہ ہو اس گھر کے تالے زنگ آلود ہو جاتے ہیں، پہرے خاموش ہو جاتے ہیں، بچے من مانی کرنے لگتے ہیں۔ امیر علی سر جھکائے ساری حکائتیں سن رہا تھا۔ اسے یقین تھا اب کوئی دوست، عزیز، رشتے دار یہ ضرور کہے گا۔

''امیر علی ہے تو مشکل مگر تمھیں یہ کڑوی گولی نگلنی ہو گی۔ اپنے لئے نہ سہی بچوں کے لئے، گھر کے

لئے۔ہم جانتے ہیں رخسانہ کی جگہ کوئی نہیں لے سکتا مگر اسے مجبوری سمجھو اور شادی کر لو'' اور وہ روائتی پس و پیش کے بعد اِس عظیم پیشکش کو بصد انکسار قبول کر لے گا۔ظاہر ہے نظامِ زندگی بھی تو چلانا ہے۔ابھی پچھلی شب بستر پہ لیٹے لیٹے اس نے کس شدت سے رخسانہ کی کمی کو محسوس کیا تھا۔امیر علی نے آہ بھری۔کیسے جھٹ پٹ مرگئی بے چاری۔اس نے دکھ سے سوچا۔اس کی آنکھوں میں نمی آ گئی۔وہ مسلسل خودترسی کے مرض میں مبتلا ہوئے جا رہا تھا۔جانے اور کتنی زندگی ہے۔جتنی بھی ہے تنہا کیسے کٹے گی؟ میں گھر دیکھوں یا دکان؟؟ جب سے رخسانہ مری ہے خدا گواہ ہے نہ کھانے کا ہوش رہا نہ کپڑوں کا نہ ہی گھر کی کسی اور شے کے ٹھکانے کا پتہ چل رہا تھا۔کوئی بیٹی ہوتی تو بات اور تھی مگر اب.....رخسانہ مجھے معاف کر دینا۔ہمارا گھر مکان بنتا جا رہا ہے.....بس ایک سرائے جیسا۔اگر سب مل کر مجھے شادی کے لئے مجبور کریں گے تو مجھے کرنی پڑے گی تیرے گھر کی، تیرے بچوں کی خاطر.....مگر یہ کیا؟ اس نے سننے کے لئے ساری توجہ بڑے بیٹے رضوان کی طرف کر دی وہ مسلسل جرح کر رہا تھا۔

''یہ کیسے ممکن ہے.....میں ابھی اِس جھنجٹ میں نہیں پڑنا چاہتا۔ابھی میری عمر ہی کیا ہے۔آپ لوگ ابو کی شادی کیوں نہیں کرا دیتے؟'' وہ ناگواری سے بولے جا رہا تھا۔اس نے پہلے تو غور سے بات کی نوعیت کو سمجھا پھر خود کو ٹٹولا۔اسے رضوان کی بات میں کافی وزن نظر آیا۔واقعی ابھی رضوان کی عمر ہی کیا تھی .....صرف انیس سال۔امیر علی نے رضوان کی بات کو آگے بڑھانے کی خاطر کچھ کہنے کے لئے گلا صاف کیا مگر اس کے کہنے سے پہلے ہی خاندان کی ایک بزرگ عورت بول پڑی۔

''پاگل ہو گئے ہو کیا، باپ کی شادی کراؤ گے؟ سوتیلی ماں لاؤ گے؟ ایک بات بتائے دیتے ہیں تمہیں، سیانے کہتے ہیں ماں سوتیلی ہو تو باپ آپ ہی سوتیلا ہو جاتا ہے، تو اپنے چھوٹے بھائیوں کو سوتیلے پن کی آگ میں جلانا چاہتا ہے کیا؟''

امیر علی پریشان ہو گیا۔سب کے چہروں کو خالی خالی نظروں سے دیکھنے لگا۔وہی بوڑھی عورت پھر بولی۔

''امیر علی تیری کیا صلح ہے، اپنے بچوں کو سوتیلی ماں کے قہر میں رکھنا چاہتا ہے یا رضوان کو منائے گا؟''

امیر علی کے بولنے سے پیشتر ہی اس کی بڑی چچی نے کتھا کھائے دانتوں کے بیچ سپاری رکھ کر بھنچے بھنچے منہ سے کہا۔

''لو بھلا، امیر علی کو کیا اعتراض ہو گا، پکا پکایا ملے گا، کپڑا دھلا ہوا، طریقہ سلیقہ آ جائے گا پھر سے گھر میں۔اور ہاں بہو آ جائے گی تو سکون سے باہر نوکری کر سکے گا ورنہ تو سارا دھیان اِدھر بچوں میں لگا رہتا ہو گا بے چارے کا۔'' پھر لمبا سانس کھینچ کے دکھی لہجے میں بولیں۔

''رخسانہ کی بے وقت موت نے کیسے ادھ موا کر دیا ہے غریب کو۔''

امیر علی نے سب کی باتیں سنیں۔اسے اپنی سوچ پر خود سے ہی شرم آنے لگی۔اس نے سر جھکا کر سب کی باتوں پر سرِ تسلیم خم کر لیا۔طے پایا رضوان کا بیاہ اگلے اتوار سادگی کے ساتھ کر دیا جائے گا۔لڑکی چچی نے پہلے ہی نظر میں رکھی ہوئی تھی۔ان کے شوہر کی بھتیجی کامنی۔سب لوگ فیصلہ سنا کے چلتے بنے اور وہ رخسانہ کی قبر پہ آ بیٹھا، اس سے معافی مانگنے کہ وہ گمراہ ہو گیا تھا۔دل کی باتوں اور جسم کی تھکان نے اس پہ جادو کر دیا تھا ورنہ وہ رخسانہ کے سوا کسی اور کے بارے میں کہاں سوچنے والا تھا۔شکر ہوا بروقت فیصلہ ہو گیا۔

کامنی بمشکل سترہ سال کی تھی۔تیکھے نقوش، سانولا رنگ مگر جلد ایسی ملائم کہ پانی کا قطرہ بھی پھسل پھسل جائے۔گالوں کے اندر ان گنت چراغ روشن رہتے۔آنکھوں میں شرم و حیا سرمے کی طرح پہرے دیتی اور بدن میں ایسی سختی کہ جو اگر بھولے سے امیر علی کی نظر اس پہ جا پڑتی تو اسے جھرجھری سی آ جاتی۔کامنی کے آتے ہی گھر کا نقشہ بدل گیا تھا جیسا کہ چچی نے کہا تھا۔اسے دھلا دھلایا ملتا۔گھر کی ہر شے قرینے سے رہتی۔دستر خوان بن مانگے سج جاتا۔وہ سوچتا شاید اس کی بیٹی بھی ایسی ہنر مند اور سلیقہ شعار نہ ہوتی۔وہ دیکھتا کامنی صبح ہوتے ہی سب کو ناشتہ بنا کے دیتی۔اسے اور رضوان کو دکان جانا ہوتا تھا۔چھوٹے دونوں ابھی سکول کالج میں تھے۔سب کو بھیج کے گھر کے کاموں میں لگ جاتی۔پھر دوپہر کا کھانا، بے چاری کتنا تھک جاتی ہو گی۔اسے ہمیشہ کامنی کا خیال رہتا۔وہ سوچتا اتنی کم عمری میں اگر اس کی سگی بیٹی پر اتنی ذمہ داریاں پڑ جاتیں تو کیا وہ اس کا ساتھ نہ دیتا۔جانے کیوں وہ غیر شعوری طور پر کامنی اور اپنی اس بیٹی میں مقابلہ کرتا رہتا جو تھی ہی نہیں۔شاید اِس لئے کہ بیٹی کی محرومی کامنی نے آ کے بہت خوبصورتی سے ختم کر دی تھی۔وہ کوشش کرتا گھر کے چھوٹے چھوٹے کاموں میں کامنی کا ہاتھ بٹا دے۔اس دن بھی دکان سے آ کے موٹر سائیکل صحن میں کھڑی کرتے کرتے اس نے سوکھے کپڑے تار پہ لہراتے دیکھے تو اس سے رہا نہ گیا۔یہ کپڑے اس نے پچھلے کل دھوئے تھے لیکن اسے اتارنے کا وقت ہی نہ مل سکا۔امیر علی کو کامنی کی مصروفیت کا خیال تھا اسی لئے اس نے کپڑے اتارنے شروع کر دیئے۔یہ کام اس کے لئے کون سا نیا تھا۔جب سے رخسانہ دنیا سے رخصت ہوئی تھی وہ سب ہی کام خود اپنے ہاتھوں سے کر رہا تھا۔سوکھے کپڑے تار سے اتارنے کیا معنی رکھتے تھے۔اسے تو اکثر کپڑے دھونے بھی پڑتے رہے ہیں۔ہاں البتہ جبتّی رخسانہ کی زندگی میں کبھی اس نے کسی کام کو چھو کے نہ دیکھا تھا۔اچانک کپڑے کھینچتے کھینچتے اس کے ہاتھ اپنی جگہ جم گئے۔آج تک اس نے صرف پینٹ اور شرٹ ہی کو تار پہ لہراتے دیکھا تھا پہلی بار ایسا ہوا کہ مردانہ کپڑوں کے درمیان زنانہ خوشبو میں بسے کامنی کے کپڑے بھی سوکھ رہے تھے۔وہ سونگھنا نہیں چاہتا تھا، ہاتھ بھی نہیں لگانا چاہتا تھا مگر.....امیر علی کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ماتھے

پر پسینے کے قطرے چمکنے لگے۔لگا ہاتھ نے بے ساختہ ہی انگاروں کو چھولیا ہو۔امیر علی نے محسوس کیا کپڑوں کی گٹھری بناتے وقت اس کے بازوؤں میں وہ طاقت نہیں رہی تھی جس کا اسے ہمیشہ گمان رہتا تھا۔

کامنی اس وقت روٹیاں سینک رہی تھی۔ چولہے کی گرمی اور آگ کی تپش نے اس کی جلد کے سارے دیئے روشن کر رکھے تھے۔اس کی سیاہ کاجل سے بھری آنکھوں میں سرخ آگ کا عکس دھڑک رہا تھا۔اچانک امیر علی کو کپڑوں کا گٹھڑ لاتا دیکھا تو گڑ بڑا گئی۔توے پہ روٹی اتارے بغیر ہی لپکی۔وہ جانتی تھی اس نے سوکھنے کو کون کون سے بچھّو تار پہ ڈال رکھے تھے۔تب ہی تو شرم سے اور بھی سرخ ہوگئی۔

''ہائے اللہ! ابو آپ نے کیوں اتارے کپڑے..... میں خود اتار لیتی فارغ ہو کے۔'' وہ نیچی نظر کئے کئے بولی۔

''میں بھی فارغ ہی تھا۔'' امیر علی نے نرمی سے انجان بن کے جواب دیا۔کامنی نے شکر گزاری سے گٹھری اس کے ہاتھ سے لی اور ایک طرف رکھ کے دھیمے سے انداز میں بولی۔

''ابو آپ ہاتھ دھولیں۔میں کھانا لگاتی ہوں۔''

''بچے کہاں ہیں؟'' امیر علی نے باورچی خانے کی ٹونٹی سے ہاتھ دھوتے دھوتے پوچھا۔

''فیضی اور ارسلان ہوم ورک کر رہے ہیں اور 'یہ' کہہ رہے تھے ابھی بھوک نہیں۔''

''خیر تو ہے، بھوک کیوں نہیں؟'' امیر علی نے ہاتھ دھو کے ہوا میں ہاتھ جھٹک کے پانی کے چھینٹے اُڑاتے اُڑاتے پریشانی سے پوچھا۔کامنی پھر شرما گئی اور جب وہ شرماتی امیر علی دل اچھل کے حلق میں آجاتا اور نظر جھک جاتی۔خدا گواہ تھا امیر علی کے دل میں کامنی کو دیکھ کے کبھی برا خیال نہ آیا تھا مگر عورت کو اس نے قریب سے دیکھ رکھا تھا۔وہ نسوانی اداؤں سے واقف تھا۔ بدن کے کیف سے واقف تھا۔ وہ جانتا تھا نئی بیاہتا کے شرمانے کے راز کیا ہیں۔اس کی بوجھل پلکیں کیا چھپانا چاہتی ہیں اور بے وجہ مسکراتے ہونٹ کیا بتانا چاہتے ہیں۔

''دہی بھلے اور سموسے لے آئے تھے یہ۔ہم سب نے مل کے ابھی کچھ دیر پہلے ہی کھائے ہیں۔''

امیر علی حیران رہ گیا۔رضوان اور دہی بھلے، سموسے دو مختلف سی باتیں لگ رہی تھیں۔کامنی امیر علی کی حیرت تک پہنچ گئی۔کھانے کی ٹرے اس کے سامنے رکھتے رکھتے بولی۔

''میرا جی چاہ رہا تھا ابو۔اس لئے لائے تھے۔'' مگر امیر علی اس کی سن کہاں رہا تھا۔وہ تو جھکی ہوئی کامنی کی بھول بھلیوں میں گم تھا۔شائد کامنی کو احساس ہوگیا۔وہ دوپٹہ ٹھیک کرتی وہاں سے ہٹ گئی مگر منظر پھر بھی ٹھہر گیا۔

دن گزر رہے تھے۔ وہ دیکھ رہا تھا کامنی کی دونوں دیوروں سے محبت بھی گہری ہوتی جا رہی تھی۔ رضوان کے دل پر تو وہ یوں قابض ہوئی جیسے کسی کنواری پہ آسیب۔ وہ جہاں جاتی رضوان کی نگاہیں اس کے

تعاقب میں رہتیں۔کامنی کو خوب اندازہ تھا اِسی لئے پلٹ پلٹ کے مسکراتی رہتی۔بن بات کبھی آنکھوں سے تو کبھی ہونٹوں سے۔ دیکھا جائے تو اِس سے اچھی کیا بات ہوسکتی تھی کہ اس نے ساری ذمہ داریاں آہستہ آہستہ اپنے نازک کاندھوں پہ ڈال لی تھیں۔

وہ گرمیوں کے دن تھے اور حبس بھری راتیں اور اگر یہ دن گرمیوں کے نہ بھی ہوتے تب بھی امیر علی کے سب دن گرم اور تمام راتیں حبس زدہ ہو چکی تھیں۔ بات صرف اتنی تھی کہ وہ شریف انسان تھا۔کچھ لوگ کہتے ہیں شریف وہ ہوتا ہے جسے موقع نہیں ملتا اور کچھ شریف ایسے بھی ہوتے ہیں جو میسر نہ آسکنے والی چیز کو مقدر کے سپرد کر دیتے ہیں۔گویا اِسے چھونا ممکن نہ لگے وہ ان کے حساب سے خدا ہی ہوتا ہے۔امیر علی کی معاشرے میں بڑی عزت تھی۔اس کی اولاد جیسے اپنے باپ کی شرافت کی قسمیں کھاتی تھی۔جس طرح رضوان اس کے خاموش مشورے سے خوش تھا۔سب مل کر اس سے اس کی طاقت چھین چکے تھے۔دل کی ساری آرزوئیں اس کے لئے خدا بن چکی تھیں۔حبس بھرے ماحول، سوچوں کی یلغار اور خود سے گھبرا کے امیر علی نے چھت پہ جائے پناہ ڈھونڈنی چاہی۔اس کی عمر تو ایسی نہ تھی مگر اس کے تشخص نے اسے وقت سے پہلے بوڑھا اور کمزور کر دیا تھا۔اب اس کے گھر میں بہو آچکی تھی بہت جلد اسے دادا بھی بن جانا تھا۔ایک ایک سیڑھی اس کے لئے بلند چوٹی کی چڑھائی جیسی مشکل ہو رہی تھی اور کیوں نہ ہوتی، اس کے اندر کا جوان امیر علی اپنی بیوی کے مرتے ہی خود کو ختم جو کر چکا تھا۔رفتہ رفتہ اسے سمجھ آنے لگا تھا، ستی کی رسم ختم ہو جانے کے باوجود ابھی باقی ہے مرد اور عورت کی تشخیص کے بغیر۔بس اب اس کو ادا کرنے کا طریقہ بدل گیا ہے۔

آخری سیڑھی پر پیر رکھتے ہوئے کامنی کی مدھر آواز نے اس کا راستہ روک لیا۔اس نے سرگوشی میں کہا مگر سناٹے میں آواز کا سفر آسان ہو جاتا ہے۔کامنی کی آواز بھی امیر علی تک با آسانی پہنچ گئی اس نے سنا وہ کہہ رہی تھی۔

''سنئے! کیا ہم ابو کی شادی نہیں کرا سکتے؟''

''کیا؟'' رضوان کو جیسے کرنٹ لگ گیا۔آواز امیر علی کے کانوں سے ٹکرائی۔

''پاگل ہوگئی ہو کیا؟ ابو ہرگز نہیں مانیں گے۔''

''آپ کہہ کے تو دیکھیں..... مان جائیں گے۔'' اس نے اصرار کیا۔

''دیکھو! اگر انہوں نے شادی کرنی ہوتی تو تب ہی کہہ دیتے جب سب مجھے مجبور کر رہے تھے لیکن وہ اپنے بچوں پہ سوتیلی ماں لانا ہی نہیں چاہتے ویسے بھی میں ان کو اچھی طرح جانتا ہوں وہ امی کے علاوہ کسی عورت کو بیوی کا درجہ دے ہی نہیں سکتے۔''

''آپ سمجھتے کیوں نہیں؟'' وہ زچ ہو رہی تھی۔

''مرد کو ہمیشہ بیوی نہیں چاہئے ہوتی۔''

امیر علی کو یوں لگا جیسے کامنی نے اس کی چوری پکڑ لی ہو۔ اسے کوئی نہیں دیکھ رہا تھا مگر اس کے اندر کا شریف آدمی پسینے پسینے ہو گیا۔ پھر چارپائی چرچرائی۔ یقیناً رضوان نے کروٹ لے کر اپنا رخ کامنی کی طرف کیا ہوگا۔ امیر علی نے قدم پچھلی سیڑھی پہ دھرا۔ سرگوشی اُبھری۔

''کتنا بور کرتی ہو تم..... دیکھو، کتنی ٹھنڈی میٹھی رات ہے۔ شکر ہے چاند بھی نہیں چمک رہا، تاریکی ہی تاریکی ہے۔ اِس پر تم ابو کی وکیل بنی بیٹھی ہو!''

''کیونکہ مجھ سے ان کی تنہائی دیکھی نہیں جاتی..... وہ اتنے اکیلے اور.....!'' کامنی بات کرتے کرتے خاموش ہو گئی۔ شائد رضوان نے اس کے نرم ہونٹوں پہ انگلی رکھ دی ہوگی یا پھر..... سوچ کے ہی امیر علی کے کان سلگ اٹھے دل کی دھڑکن بہت تیز ہو گئی۔

''یہ ہمارے پیار کا وقت ہے۔ اِس میں، میں کسی کا ذکر برداشت نہیں کر سکتا، ابو کا بھی نہیں۔''

امیر علی کے جسم میں لرزہ سا آ گیا۔

''آہستہ بولیں رضوان! اگر ابو اوپر آ گئے..... اور انہوں نے سن لیا تو.....؟''

''کل سے ان کے کمرے میں تالا لگا کے آیا کروں گا میں، تاکہ تمھارا یہ دھڑکا بھی ختم ہو جائے کہ وہ اوپر آ سکتے ہیں۔''

امیر علی کا ہاتھ بے ساختہ سینے پہ پڑا۔ درد کی شدید لہر اس کے سینے سے نکلی اور پورے جسم میں پھیل گئی۔ اس کا پیر لڑکھڑایا اور وہ گرتا چلا گیا۔

ہوش آیا تو سب اس پہ جھکے ہوئے تھے۔ کامنی بہت پریشان تھی۔ امیر علی کی نظر چاروں طرف گھومی۔ وہ سمجھ گیا کہ وہ ہسپتال میں ہے۔ کامنی کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ امیر علی کو ہوش میں آتا دیکھا تو بے تابی سے اس پہ جھکی۔

''ہائے اللہ ابو آپ ٹھیک ہیں ناں؟'' وہ رو دی۔

''شکر ہے آپ کو ہوش آ گیا۔ اگر آپ کو کچھ ہو جاتا تو ہائے اللہ!'' اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے گال پیٹے۔

''ڈاکٹر کہہ رہا تھا آپ کا جلدی ہوش میں آنا بہت ضروری ہے۔ چوٹوں کی تو خیر ہے ٹھیک ہو جائیں گی، مگر.....'' امیر علی نے کامنی کی بات سے توجہ ہٹانی چاہی۔ ایک لمحے میں اسے سب کچھ یاد آ گیا۔ محض اپنی توجہ بانٹنے کے لئے اس نے اپنے جسم کو حرکت دی۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کا پورا جسم درد سے چور پھوڑا

بنا ہوا ہے۔ اس نے اپنا بایاں ہاتھ اٹھانا چاہا مگر کامنی نے جلدی سے امیر علی کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھ دیا۔

''نہیں ابو ہاتھ نہ ہلایئے گا، کہنی کا جوڑ ہل گیا ہے۔ بہت گہری چوٹ لگی ہے۔ ڈاکٹر کہہ رہا تھا احتیاط بہت ضروری ہے۔ اگر احتیاط نہیں کی تو کہنی کا جوڑ ٹھیک نہیں ہوگا..... کیوں رضوان؟''

جانے رضوان نے کیا جواب دیا۔ امیر علی نے آنکھیں بند کر لیں۔ یہ تو وہ جان گیا تھا کہنی کی چوٹ بہت ظالم ہوتی ہے۔ اچانک لگے تو لگتا ہے جیسے جان ہی نکل گئی ہو مگر سنبھالا مل جاتا ہے لیکن نہیں، سنبھالا اتنا آسان کہاں تھا۔ اس نے سنا کامنی نے بھرپور معصومیت سے نمک پاشی کی۔

''رضوان! اگر ابو کی چوٹ ٹھیک نہ ہوئی تو ان کی زندگی ان پر کتنی بوجھ بن جائے گی؟''

امیر علی کی آنکھوں میں اپاہجی کا ممکنہ دکھ آنسو بن کے چمکنے لگا۔ اس نے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا..... جیسے جو ہونا ہے ہو جائے کیوں کہ کہنی کی چوٹ روگ تو بن سکتی ہے جا نہیں سکتی۔

◂◂ ● ▸▸

Khazeena
House # 63 block B
State life housing society Near DHA Lahore
03018497006

قطرہ قطرہ احساس کے بعد

اقبال حسن آزاد

کا دوسرا افسانوی مجموعہ

مردم گزیدہ

شایع ہو چکا ہے

صفحات : ۱۶۰

قیمت : ۲۵۰/روپے

ملنے کا پتہ: ثالث پبلیکیشنز، شاہ کالونی، شاہ زبیر روڈ، مونگیر ۸۱۱۲۰۱

● وحید احمد قمر

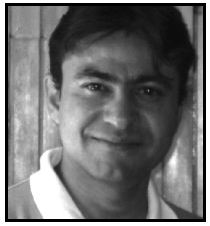

مامتا

وہ کسی قسم کے شور کی آواز ہی تھی جس سے سعدیہ کی آنکھ کھل گئی، کمرے میں اندھیرا تھا۔اس نے ہاتھ بڑھا کر میز پر پڑا لیمپ آن کیا اور ساتھ پڑی گھڑی میں وقت دیکھا۔ چار بج رہے تھے۔ وہ یوں اچانک آنکھ کھل جانے پر حیران تھی کیونکہ کافی گہری نیند سوتی تھی۔ عام طور پر رات کی سوئی صبح سے پہلے نہ اُٹھتی تھی۔''شاید کسی ڈراؤنے خواب نے اٹھا دیا ہے۔'' اس نے سوچا، کچھ دیر خالی الذہنی کی کیفیت میں بیٹھی رہی پھر دوبارہ سونے کا ارادہ کرتے ہوئے روشنی بجھانے کے لئے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ فائر کی تیز آواز نے رات کے سکون کو تہ و بالا کر دیا۔ وہ خوفزدہ ہو کر اُٹھ بیٹھی۔ آواز کافی قریب سے آئی تھی، شاید قریبی سڑک سے۔ چند منٹ کے وقفے سے دوسرا فائر ہوا، پھر تیسرا، چوتھا.....اور یہ سلسلہ چل نکلا۔ باقاعدہ فائرنگ ہونے لگی۔ یوں لگتا تھا جیسے دو متحارب گروہ آپس میں الجھ پڑے ہوں۔ سعدیہ سہم کر دیوار سے جا لگی۔ وہ بہت ڈر گئی تھی۔ اس نے کل شام کو ہی ٹی وی کی خبروں میں سنا تھا کہ چند خطرناک دہشت گرد حوالات سے فرار ہو گئے ہیں۔ پولیس نے شہر سے باہر جانے والے راستوں کی کڑی نگرانی شروع کر دی ہے اور سرگرمی سے ان مجرموں کو تلاش کر رہی ہے۔عوام سے اپیل کی گئی تھی کہ وہ گھروں کے دروازے، کھڑکیاں اچھی طرح بند کر لیں اور کسی قسم کی غیر معمولی صورتحال پیش آنے پر پولیس کو فون کریں۔ سعدیہ نے خبریں سنتے ہی کھڑکیاں اور دروازے اچھی طرح بند کر لئے تھے اور رات سونے سے پہلے ایک دفعہ پھر انہیں اچھی طرح چیک کیا تھا۔اس وقت اس نے تصور بھی نہ کیا تھا کہ دہشت گرد اس طرف آ نکلیں گے کیونکہ سعدیہ کا گھر کافی گنجان آباد علاقے میں تھا۔اور اس کے خیال میں مجرم فرار کے لئے عموماً ویران راستوں کو ترجیح دیا کرتے ہیں مگر فائرنگ کی آوازیں اس کے اس خیال کی نفی کر رہی تھیں۔ وہ کافی دیر تک ڈری سہمی بیٹھی رہی۔ فائرنگ کی شدت میں اب کمی آ گئی تھی۔ وقفے وقفے سے ایک آدھ فائر کی آواز سنائی دیتی اور پھر سناٹا چھا جاتا۔ان وقفوں کے دوران دوڑتے قدموں کی آوازیں اور کئی قسم کا ملا جلا شور بھی سنائی دیتا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ خاموشی چھا گئی۔ سعدیہ کافی دیر تک انتظار کرتی رہی کہ شاید پھر کوئی فائر ہو مگر ماحول پر اک پرہول سا سناٹا چھا گیا۔اس طرح سکوت ہو گیا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

وہ کچھ دیر مزید خالی الذہنی کی کیفیت میں بیٹھی رہی۔ پھر اٹھ کر کچن کی طرف چل دی۔ پیاس سے اس کا گلا خشک ہو رہا تھا جبکہ دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔اس نے فریج سے پانی کی بوتل نکالی اور ایک ہی سانس میں نصف بوتل خالی کر دی۔ کچھ اوسان بحال ہوئے تو قریبی کرسی پر بیٹھ گئی اور چھوٹے چھوٹے گھونٹ لینے لگی۔ پانی پینے کے بعد واش بیسن کے قریب آئی اور چہرے پر پانی کے چھینٹے مارنے لگی۔ منہ دھونے کے بعد کچھ اوسان بحال ہوئے تھے۔اس نے دونوں ہاتھوں سے چہرے پر بکھرے بالوں کو سمیٹا اور ہیئر کلپ سے باندھنے لگی۔ ایسا کرتے وقت اچانک اس کی نگاہ کھڑکی کی طرف اٹھ گئی۔ایک سایہ سا کھڑکی کے آگے سے گزر گیا تھا۔ وہ ایک دم ساکت ہو گئی۔اسی وقت کچن کی بیرونی دیوار کی طرف کھٹکا سا سنائی دیا۔اس نے کچن کے بیرونی دروازے کے ہینڈل کو گھومتے دیکھا۔مگر چونکہ دروازہ اندر سے بند تھا اس لئے باہر سے کھولا نہ جا سکتا تھا۔تو گویا بالکونی میں کوئی موجود تھا۔اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ چند لمحوں کے بعد سیاہ ہیولا پھر کھڑکی میں نظر آیا۔ وہ شاید اب کھڑکی پر زور آزمائی کرنا چاہتا تھا مگر غنیمت یہ تھی کہ کھڑکی میں لوہے کی مضبوط گرل کے علاوہ ایسا موٹا شیشہ لگا ہوا تھا جس کے آر پار نہ دیکھا جا سکتا تھا۔مگر یہ بات ہی کافی دہشت زدہ کر دینے والی تھی کہ بالکونی میں کوئی موجود تھا جو گھر کے اندر گھس آنا چاہتا تھا جبکہ ذرا ہی دیر پہلے باہر سے ہولناک قسم کی فائرنگ کی آوازیں بھی آتی رہی تھیں۔ سعدیہ کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔اگر وہ شخص کسی طرح اندر آنے میں کامیاب ہو گیا تو.....اس سے آگے وہ سوچنا نہیں چاہتی تھی۔اس نے دوپٹے سے چہرے پر آئے پسینے کو پونچھا اور تیزی سے اندرونی کمرے کی طرف بڑھی۔ تاکہ فون پر پولیس کو اطلاع دے سکے۔ابھی وہ راہداری میں ہی تھی کہ اسے کچن کا بیرونی دروازہ دھڑ دھڑائے جانے کی آواز آئی۔آوازیں کافی اونچی اور مسلسل تھیں یوں لگتا تھا جیسے کوئی دروازے کو باہر سے کھولنے کے لئے زور آزمائی کر رہا ہو۔وہ واپس کچن میں پلٹ آئی۔دروازے پر باہر سے ضربیں لگائی جا رہی تھیں۔ سعدیہ نے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگائی کہ ضربیں اگر اسی شدت سے جاری رہیں تو دروازہ کسی بھی وقت ٹوٹ سکتا ہے۔ کچن کی طرف والی بالکونی بالکل ویران رہتی تھی۔ یہ عمارت کا پچھواڑا تھا۔ یوں بھی کچھ دیر پہلے ہوئی فائرنگ کی وجہ سے سب لوگ اپنے اپنے گھروں میں دبک کر بیٹھ گئے تھے۔اگر کوئی یہ آوازیں سنتا بھی تو شاید ہی ان کی طرف توجہ دیتا اور مدد کے لئے آتا۔ اس لئے اپنی حفاظت کے لیئے جو کرنا تھا سعدیہ کو خود ہی کرنا تھا۔اس نے جلدی جلدی کھانے کی میز گھسیٹی اور کسی نہ کسی طرح دروازے کے آگے سرکا لائی۔ میز کو دروازے کے آگے رکھنے کے بعد وہ برتنوں کی الماری کی طرف بڑھی۔الماری کے نیچے پہیئے لگے ہوئے تھے۔اس لئے سعدیہ آسانی سے اسے بیرونی دروازے کے سامنے ٹکی میز کے آگے اس طرح لے آئی کہ اب اگر دروازہ ٹوٹ بھی جاتا تو میز اور الماری کے دباؤ کی وجہ سے اندر کو نہیں کھل سکتا تھا۔مزید احتیاط کے طور پر اس نے ایک چھوٹی میز الماری اور اندرونی دیوار کے درمیان پھنسا دی۔اب گویا اپنی

دانست میں اس نے اندر آنے والے کی راہ میں مضبوط رکاوٹیں قائم کر دی تھیں۔ دوسری طرف دروازے پر پڑنے والی ٹھوکروں اور ضربوں کی شدت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ کچھ ہی دیر میں دروازہ ٹوٹ جائے گا۔ اور یہی ہوا۔ چند لمحوں بعد دروازہ اُکھڑ گیا تھا۔ سعدیہ گھبرا اُٹھی اور تیزی سے اندرونی راہداری کی طرف بھاگی اور کچن کے اندرونی دروازے کو بند کر کے چٹخنی چڑھا دی۔ اسی وقت کچن سے کچھ گرنے کی آواز آئی، ساتھ ہی برتنوں کے ٹوٹنے اور بکھرنے کا شور بھی، گویا برتنوں کی الماری اپنی جگہ پر قائم نہ رہ سکی تھی۔ سعدیہ دروازے کے ساتھ لگی گہری گہری سانسیں لے رہی تھی۔ اس کا سارا جسم پسینے میں شرابور تھا۔ پھر اس دروازے کا ہینڈل گھومتا محسوس ہوا جس کے ساتھ وہ لگی کھڑی تھی۔ خوف کی ایک لہر اس کے پورے جسم میں سرایت کر گئی۔ اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ اب کیا کرے۔ لاشعوری طور پر وہ اس انتظار میں تھی کہ شاید اس دروازے پر بھی ضربیں پڑنی شروع ہوں مگر جب کچھ دیر گزر گئی اور کوئی آواز سنائی نہ دی تو اسے تعجب ہوا مگر اگلے ہی لمحے یہ تعجب دہشت میں بدل گیا۔ شاید وہ شخص سٹور کی طرف بڑھ گیا ہو۔ اگر ایسا ہوا ہے تو راہداری تک پہنچنا اس کے لئے بالکل آسان ہو جائے گا۔ سعدیہ کا دل بیٹھ گیا۔ اس نے سہمے ہوئے انداز میں راہداری کے اس سرے کی طرف دیکھا جہاں سٹور تھا اور پھر اس کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔

وہ راہداری میں قدم رکھ رہا تھا..... سرتاپا سیاہ لباس میں ملبوس۔ اس کے دائیں ہاتھ میں پستول دبا ہوا تھا۔ وہ نپے تلے انداز میں قدم بڑھاتا سعدیہ کی طرف بڑھنے لگا۔ جبکہ سعدیہ دیوار سے لگی اندرونی کمرے کی طرف کھسکنے لگی۔ اس کے سارے جسم پر کپکپی طاری تھی۔ بال ایک دفعہ پھر کھل کر چہرے پر بکھر گئے تھے جبکہ سینہ لوہار کی دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ جونہی وہ اندرونی کمرے کے دروازے پر پہنچی سیاہ پوش کی گرجدار آواز گونجی۔

''ٹھہرو!''

سعدیہ اپنی جگہ پر ساکت ہو گئی۔ وہ ذرا ہی دیر میں سعدیہ کے سر پر آ پہنچا۔ اس کے پستول کا رخ سعدیہ کے سینے کی طرف تھا۔ سعدیہ کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

''شاید تم گھر میں اکیلی ہو۔''

اس بار سیاہ پوش کا لہجہ نسبتاً دھیما تھا۔ سعدیہ کا سر اثبات میں ہل گیا۔ پھر اچانک کسی خیال کے آتے ہی نفی میں سر ہلاتے ہوئے پھنسی پھنسی آواز میں بولی۔

'' اوپر میرے بچے سو رہے ہیں۔ شور کی آواز سن کر شاید وہ جاگ اُٹھے ہوں۔ مجھے اوپر اپنے بچوں کے پاس جانے دو۔ وہ ڈر رہے ہونگے۔'' سعدیہ کے لہجے میں دنیا جہاں کا درد سمٹ آیا۔

'' نہیں!'' سیاہ پوش نے پستول کو جنبش دے کر کہا۔

''تم کہیں نہیں جاؤ گی، اگر بچے اٹھے ہوتے تو ان میں سے کوئی نیچے ضرور آتا۔ وہ اتنے چھوٹے بھی نہ ہونگے کہ سیڑھیوں سے نیچے نہ اتر سکیں، کیوں؟''

''ہاں!'' سعدیہ کا سر اثبات میں ہل گیا۔ یوں بھی میرے بچے کافی گہری نیند سوتے ہیں۔''

'' تمہارا خاوند کہاں ہے؟''

''رات کی دیوٹی پر..... وہ ڈاکٹر ہیں۔''

سیاہ پوش کی آنکھوں میں چمک سی لہرائی۔

'' پھر تو گھر میں فرسٹ ایڈ کا سامان بھی ہوگا۔''

''ہاں ہے..... گھر میں ضروری استعمال کی تمام دوائیں ہر وقت موجود رہتی ہیں۔''

''چلو، فرسٹ ایڈ بکس لے کر آؤ۔ فائرنگ کے تبادلے کے دوران ایک گولی میری ٹانگ کو چھو کر گزر گئی ہے۔ معمولی زخم ہے مگر خون تھم نہیں رہا۔''

سعدیہ نے بے اختیار اس کی ٹانگوں کی طرف دیکھا۔ دائیں ٹانگ پر گھٹنے سے ذرا نیچے خون رس رہا تھا۔ سعدیہ کمرے میں داخل ہوئی اور الماری کی طرف بڑھی۔ سیاہ پوش اس کے پیچھے پیچھے کمرے میں چلا آیا تھا۔ سعدیہ نے الماری کا پٹ کھولنے کے لئے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ سیاہ پوش بولا۔

''ذرا ٹھہرو!''

سعدیہ کا اُٹھا ہوا ہاتھ رک گیا۔ لیکن اس نے پلٹ کر نہ دیکھا تھا۔

''کیا فرسٹ ایڈ بکس الماری میں ہے؟'' سیاہ پوش اس کے برابر پہنچتا ہوا بولا۔ سعدیہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

''تم ٹھہرو، میں الماری سے بکس نکالتا ہوں۔''

سعدیہ ایک طویل سانس لے کر رہ گئی۔ سیاہ پوش نے ایک جھٹکے سے الماری کھول دی۔

سامنے الماری کے اوپری خانے میں ایک ننھا سا پستول چمک رہا تھا۔

سیاہ پوش نے معنی خیز نظروں سے سعدیہ کی طرف دیکھا اس کی سرخ آنکھوں میں سختی آ گئی تھی۔

سعدیہ نظریں چرا کر دوسری سمت دیکھنے لگی۔

''تم بہت خطرناک لڑکی ہو، اور دلیر بھی۔ مگر میرے ساتھ کسی قسم کی چالاکی تمہارے لئے سخت نقصان دہ ثابت ہوگی۔''

سعدیہ خاموشی سے ہونٹ کاٹتی رہی۔

''دیکھو لڑکی، تمہیں میرے ساتھ تعاون کرنا چاہیے، اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔''

سعدیہ نے اسکی طرف دیکھا۔ وہ کہتا رہا۔ اگر تم تعاون کرنے پر آمادہ نہیں ہوتو تمھاری موت پر مجھے ذرا بھی افسوس نہ ہوگا۔'' اس کے لہجے میں سفاکی در آئی۔

'' تم کیا چاہتے ہو؟'' سعدیہ نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔

''سب سے پہلے اپنے زخم کی ڈریسنگ، اوراس وقت تک تمھارے گھر میں قیام جب تک پولیس اس علاقے سے چلی نہیں جاتی۔''

'' تمھارے زخم کی ڈریسنگ تو میں کر دونگی۔ مگر زیادہ یہاں ٹھہرنا خود تمھارے لئے نقصان دہ ثابت ہوسکتا ہے۔ میرے شوہر علی الصبح ڈیوٹی سے واپس آ جاتے ہیں۔''

''فی الحال میرے زخم کی ڈریسنگ ہونی چاہئے، بعد کا بعد میں دیکھا جائیگا۔''

''اچھا.....الماری کے نچلے خانے میں فرسٹ ایڈ بکس پڑا ہے، وہ نکالو'' سیاہ پوش نے بکس نکلا اورالماری میں پڑے پستول کو بھی اٹھا کر اپنی جیب میں ڈال لیا۔ جبکہ اپنے پستول کا رخ سعدیہ کی طرف کرتے ہوئے قریبی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''تم پستول جیب میں رکھ لو۔ مجھے اس سے خوف محسوس ہوتا ہے۔ اس کی موجودگی میں اچھی طرح زخم کی دیکھ بھال نہ کرسکونگی۔''

''تم پر اعتبار نہیں کرسکتا۔''

''دیکھو! میں ایک نرس رہ چکی ہوں اور یہ بات میری تربیت میں شامل ہے کہ مریض کا علاج پوری دیانتداری سے کرنا ہے۔''

سیاہ پوش چند لمحے خاموشی سے سعدیہ کی طرف دیکھتا رہا جیسے اس کے لہجے کی صداقت کو پرکھنے کی کوشش کررہا ہو۔ پھراس نے پستول جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔

''تم یہ نہ سمجھنا کہ پستول جیب میں رکھنے کے بعد تم کسی قسم کی کوئی حرکت کرسکوگی۔ میں خالی ہاتھ سے بھی پلک جھپکنے میں تمہیں دبوچ سکتا ہوں۔''

سعدیہ خاموش رہی۔ اس نے فرسٹ ایڈ بکس کھولا اور سیاہ پوش کا زخم دیکھنے لگی۔

کچھ وقت زخم صاف کرنے اور مرہم پٹی میں گزر گیا۔ جب سعدیہ اس کام سے فارغ ہوئی تو سیاہ پوش کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''تم نے تو انتہائی ماہرانہ انداز میں ڈریسنگ کی ہے۔''

''میں نے کہا نا کہ میں ایک نرس ہوں۔ وہ تو بچوں کی پیدائش کے بعد جاب چھوڑ دی کہ بچوں کی

دیکھ بھال ہی ایک کل وقتی جاب ہے۔''

''تمہارے کتنے بچے ہیں؟''

دو، چار سالہ جویریہ اور چھ سالہ احمد۔ جسے میں پیار سے ساشا کہتی ہوں۔''

''ساشا، یہ تو رشین لفظ ہے شاید؟'' سیاہ پوش بولا۔

''میں تھوڑی بہت رشین جانتا ہوں۔''

''ہاں، ان دنوں میں ایک رشین سٹیٹ میں جاب کرتی تھی جب احمد پیدا ہوا تھا۔ وہاں بعض مائیں اپنے چھوٹے بچوں کو اسی طرح کے ناموں سے پکارتی ہیں۔'' سعدیہ کے لہجے میں پیار سمٹ آیا۔

''تم اپنے بچوں سے بہت پیار کرتی ہو؟''

''بہت زیادہ۔ ہر عورت کی طرح میرا خاوند اور بچے ہی میری کل زندگی کا سرمایہ ہیں۔ مگر ہر عورت کی طرح نہیں کہنا چاہیے میں نے کچھ عورتوں کو اپنے خاوند سے بے وفائی کرتے اور بچے چھوڑ کر کیریئر کے پیچھے بھاگتے دیکھا ہے۔''

''مگر تم ان عورتوں میں سے نہیں ہو۔ اپنے گھر کی حفاظت اور بچوں سے محبت کے اس جذبے سے میں بہت متاثر ہوا ہوں۔'' سیاہ پوش کا لہجہ بے حد نرم تھا۔

اسی وقت اطلاعی گھنٹی کی آواز سنائی دی۔ سیاہ پوش اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے دونوں پستول نکال کر ہاتھوں میں لے لئے تھے۔

''کون ہوسکتا ہے، تمھارا خاوند؟'' اس کی آواز میں غراہٹ تھی۔ ذرا دیر پہلے والی نرمی کا لہجے میں شائبہ تک نہ تھا۔ سعدیہ نے نفی میں سر ہلایا۔

'' صہیب عموماً ساڑھے چھ سے پہلے نہیں آتے، ابھی تو شاید پانچ بجے ہونگے۔''

'' پھر یہ کون آ گیا..... پولیس؟'' سیاہ پوش کے لہجے میں گھبراہٹ تھی۔ اطلاعی گھنٹی پھر بجی۔

سعدیہ بولی۔

''دیکھو! تم جس طرف سے آئے ہو اسی طرف سے نکل جاؤ۔ اگر یہاں رہے تو کسی چوہے کی طرح پکڑے جاؤ گے۔''

''تم ٹھیک کہتی ہو'' سیاہ پوش نے کہا اور کچن کی طرف بڑھ گیا جبکہ سعدیہ تیزی سے بیرونی دروازے کی طرف بڑھی، گھنٹی اب مسلسل بج رہی تھی۔

''اے! تم کہاں چلیں'' سیاہ پوش کی درشت آواز نے اس کے قدم روک لئے۔

''جلدی سے مرے آگے کچن کی طرف چلو۔''اس نے دائیں ہاتھ میں دبے پستول سے اشارہ کیا۔سعدیہ خاموش کھڑی رہی۔

''چلو!'' وہ غرایا اور وہ کچن کی طرف چل دی۔سیاہ پوش اس کے پیچھے پیچھے آیا تھا۔اطلاعی گھنٹی کی آواز اب نہیں آ رہی تھی۔کچن کے فرش پر برتنوں کی الماری گری پڑی تھی اور برتن فرش پر بکھرے ہوئے تھے۔سعدیہ نے رک کر سیاہ پوش کو دیکھا۔وہ اسے پستول سے کور کرتا ہوا اُکھڑے ہوئے دروازے کی جانب بڑھا اور سر نکال کر باہر جھانکا۔پھر سعدیہ کی طرف دیکھ کر پرتشویش لہجے میں بولا۔

''پچھلی گلی میں بھی پولیس موجود ہے۔چلو، واپس کمرے میں۔'' اس بار اس نے سختی سے سعدیہ کا بازو پکڑا اور اندر کمرے میں دھکیل لایا۔پستول کی نالی اس نے سعدیہ کی کنپٹی سے لگا دی تھی۔سعدیہ تھر تھر کانپنے لگی۔

''تم کیا کرنے جا رہے ہو؟'' اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

اب بیرونی دروازے کو کئی ہاتھوں سے پیٹا جا رہا تھا۔

''یقیناً باہر پولیس ہے۔وہ شاید کچن کا اُکھڑا ہوا دروازہ دیکھ کر اس طرف آئے ہیں۔اب میرے بچاؤ کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ تمہیں یرغمال بنا لوں۔'' سیاہ پوش سفاک لہجے میں بولا۔

سعدیہ کے بازو پر اسکی گرفت مزید سخت ہو گئی تھی۔وہ خوفزدہ سی اسے دیکھتی رہ گئی۔اُس کے چہرے پر انتہائی کرختگی اور آنکھوں میں وحشت تھی۔سعدیہ نے ایک جھرجھری لی۔اس کا سارا جسم کانپ رہا تھا۔دوسری طرف دروازہ مسلسل دھڑ دھڑایا جا رہا تھا۔بلکہ اب دروازے پر ضربیں بھی لگنی شروع ہو گئی تھیں۔سیاہ پوش کہہ رہا تھا۔

''دروازہ ٹوٹنے کی صورت میں پولیس سیدھی یہیں آئے گی۔شاید وہ لوگ کچن کی بالکونی سے بھی اوپر چڑھنے کی کوشش کر رہے ہونگے۔میں دونوں طرف سے گھر کر نہ رہ جاؤں۔چلو اوپر۔'' اس نے سعدیہ کو سیڑھیوں کی طرف دھکیلا۔

''نہیں، اوپر میرے بچے ہیں۔وہ تمہیں دیکھ کر ڈر جائیں گے۔میں تمہیں اوپر نہیں جانے دونگی۔'' سعدیہ نے سخت لہجے میں کہا۔نہ جانے اس میں اتنی جراءت کہاں سے آ گئی تھی۔بیرونی دروازے پر پڑنے والی ضربیں شدید ہو گئی تھیں۔

''تم بہت ضدی ہو اور کسی بھی وقت میرے لئے خطرناک ثابت ہو سکتی ہو۔لہذا اب میں تمہیں چھوڑ کر تمہارے بچوں کو ہی یرغمال بناؤنگا۔''

سیاہ پوش نے یہ کہہ کر سعدیہ کو صوفے پر دھکیلا اور تیزی سے سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔

سعدیہ صوفے پر گرتے ہی اُٹھ کھڑی ہوئی اور دھاڑتی ہوئی بولی۔

''رُک جاو، ورنہ میں تمہیں جان سے مار دونگی۔'' سعدیہ نے چیختی ہوئی آواز میں کہا۔پھر جیسے اس کے جسم میں بجلی بھر گئی۔اس نے چھوٹی میز پر پڑی پھل کاٹنے والی چھری اُٹھائی اور بے تحاشا سیاہ پوش کی طرف لپکتے ہوئے اس کے سر پر جا پہنچی۔سیاہ پوش اسکی موجودگی محسوس کر کے پلٹا۔عین اسی وقت سعدیہ نے ہاتھ میں پکڑی چھری پوری قوت سے سیاہ پوش کے ٹھیک دل کے مقام میں پیوست کر دی اور پے در پے وار کرتی چلی گئی۔سیاہ پوش لڑکھڑایا اور تیورا کر گرا۔پھر سیڑھیوں پر نیچے کی طرف لڑھکتا چلا گیا۔عین اسی وقت کمرے میں پولیس گھس آئی۔سعدیہ نے دیکھا ساتھ اس کا شوہر بھی تھا۔وہ بھاگتا ہوا سیڑھیاں چڑھتا سعدیہ کے پاس پہنچا اور اسے سہارا دے کر نیچے اُتار لایا۔سعدیہ نے کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا۔

''یہ شخص میرے بچوں کو نقصان پہنچانا چاہتا تھا صہیب۔پولیس کو بتاؤ میں قاتلہ نہیں ہوں۔میں نے اپنے بچوں کی جان بچانے کے لئے اسے مارا ہے۔'' پھر وہ انسپکٹر کی طرف دیکھ کر بولی۔

''اوپر میرے بچے سو رہے ہیں، میری جویریہ اور ساشا۔'' اس کے حواس جواب دے رہے تھے۔اگلے ہی لمحے وہ اپنے خاوند کے بازوؤں میں جھول گئی۔صہیب نے آہستگی سے اسے صوفے پر لٹا دیا۔

پولیس انسپکٹر سیاہ پوش کے قریب بیٹھ کر اسکی نبض دیکھ رہا تھا۔

''یہ مر چکا ہے۔'' انسپکٹر نے کہا اور اٹھ کر صہیب کے قریب آیا۔یہ بہت خطرناک دہشت گرد تھا اور اسکی گرفتاری پر انعام بھی مقرر تھا۔آپ کی بیوی نے ایک بڑا کارنامہ سرانجام دیا ہے۔'' وہ کچھ دیر رکا، ایک نظر دہشت گرد کی لاش پر ڈالی اور پھر بولا۔

''ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔بقول آپ کی بیوی کے اوپر آپ کے بچے سو رہے ہیں جن کو بچانے کے لئے انہوں نے مجرم پر وار کیا مگر حیرت کی بات ہے کہ اس شور شرابے اور ہنگامے نے بھی بچوں کی نیند میں خلل نہیں ڈالا۔''

صہیب نے آہ بھر کر کہا۔

''انسپکٹر، کچھ عرصہ قبل میرے دونوں بچے سکول سے واپس آتے ہوئے بم دھماکے میں جاں بحق ہو گئے تھے۔''

◀◀ ● ▶▶

Industrie str 13 63150 Heusenstamm
GERMANY
0049 15778568649

● شاہین کاظمی

نرتکی

مدھو نے گہری سانس لے کے بدن ڈھیلا چھوڑ دیا۔ اس کے چہرے پر تھکن تھی، پیشانی پر آئے پسینے کے قطرے پونچھتے ہوئے وہ گرنے کے سے انداز میں بیٹھ گئی۔

''کیا ہوا آج اتنی جلدی تھک گئیں؟'' سنگتراش کا دھیان ٹوٹا تو وہ اپنی ناگواری نہ چھپا سکا۔

''جلدی؟ مہاراج! دن کا تیسرا پہر ڈھلنے کو ہے اور آپ کو اب بھی جلدی لگتی ہے۔'' اس کے بدن میں بلا کی اینٹھن تھی۔ صبح سے ایک ہی زاویئے پر کھڑے انگ انگ میں تھکن اُتر آئی تھی۔

''تم جانتی ہو نا یہ مورتی میرے لئے کتنی ضروری ہے۔ میں اسے وقت پر ختم کرنا چاہتا ہوں اور تم ہو کہ.....'' سنگتراش کے لہجے میں ترشی تھی۔

''دیکھو راجہ، مدھو کو کسی کا حکم ماننا پسند نہیں ہے، تمھیں اپنی مورتی سے پیار ہے اور مجھے اپنے آپ سے۔'' اس نے پاس پڑی ہوئی چادر اٹھا کر لپیٹ لی۔ اس کے گال دہک رہے تھے، اور بدن میں ہلکی ہلکی کپکپاہٹ تھی۔

پچھلے کئی دنوں سے اس کی طبیعت بوجھل تھی۔ سورج ڈھلتے ہی بدن پھنکنے لگتا۔ ریشہ ریشہ الگ ہوتا ہوا محسوس ہوتا، لیکن پیٹ کی آگ بدن کی آگ سے کہیں زیادہ تیز ہوتی ہے۔ سو وہ بھی سب بھلا کر گھنٹوں رقص کا ایک ہی زاویہ بنائے ساکت کھڑی رہتی۔ پاؤں شل ہو جاتے۔ آنکھوں کے آگے ناچتے سیاہ دائرے پھیل کر سارے رنگ نگل لیتے۔ اسے لگتا جیسے وہ کسی جادوئی اثر میں ہو۔ سنگتراش کا تیشہ پتھر پر نہیں اسے اپنے آپ پر چلتا محسوس ہوتا۔ لیکن بھوک ناگ کو کون قابو کر سکا ہے۔ پھنکارتا ہے تو بڑے بڑے ڈھے جاتے ہیں اور وہ تو پھر ایک کمزور عورت تھی۔ اس پر بوڑھے باپ اور بہن کا بوجھ، اس کے پاؤں کو متحرک رکھنے کو کافی تھا۔

اس چھوٹے سے گاؤں میں مدھو کا خاندان پشتوں سے آباد تھا۔ سبھی چھوٹے موٹے کام کر کے جیون کی گاڑی کو دھکا لگائے ہوئے تھے۔ مدھو اس خاندان میں کیا آئی خاندان کے نصیب کی ٹمٹماتی لو بھی بھڑک کر بجھ گئی۔ ماں اس کی پیدائش پر چل بسی اور جاتے جاتے عمر بھر کی نحوست مدھو کے حصے میں لکھ گئی۔ بابا

کچھ دنوں تک تو سوگ میں رہا، پھر ایک دن گھر سے غائب ہو گیا۔ واپسی پر سرخ جوڑے میں لپٹی سلونی شاماں اس کے ساتھ تھی۔ وہ تن من دونوں سے کالی تھی۔ ذرا ذرا سی غلطی پر ایسی چار چوٹ کی مار دیتی کہ مدھو دنوں آنسو پیتی رہ جاتی۔ شاماں نے معذور بیٹی کو جنم دیا تو مدھو کی نحوست اور نفرت کئی درجے پھلانگ گئی۔ اسے اندر کمرے میں آنے کی اجازت نہ تھی۔ جاڑوں کی لمبی سیاہ راتیں ہوتیں یا گرمیوں کی چلچلاتی دوپہریں، وہ صحن کے کونے میں بنی چھوٹی سی کوٹھری میں گذار دیتی۔ شاماں کو یاد آتا تو کھانا پٹخ کر چلی جاتی ورنہ بہت بار ایسا ہوا کہ مدھو بھوکی ہی سو گئی۔ اس کا سارا بچپن تنہا گذرا۔ لوگ اس کے سائے سے بھی بدکتے تھے۔ گلی میں اسے آتا دیکھ کر عورتیں دروازے بند کر لیتیں۔ شاماں کے سنائے ہوئے نحوست کے قصے ہر کان تک پہنچے اور مدھو کے لئے گھر باہر دونوں جہنم بن گئے۔ شاماں مدھو کو دیکھتی تو اس کے سینے پر جیسے سانپ لوٹنے لگتے۔ جانے کیا کھا کر مدھو کی ماں نے اسے جنا تھا۔ جو بھی دیکھتا دیکھتا ہی رہ جاتا۔ گلال ملے میدے کی سی رنگت، سرخ رسیلے ہونٹ، سیاہ لانبے بال، جنھیں ہفتوں تیل صابن نصیب نہ ہوتا، لیکن ان کی چمک پھر بھی چندھیائے رکھتی۔

شاماں کی نفرت مدھو کے ساتھ جوان ہوتی گئی۔ مدھو بھی اپنے نام کی ایک تھی۔ اس نے درد اپنے اندر اتارنا سیکھ لیا تھا، لیکن اندر اترا ہوا درد زہر بن جاتا ہے اور یہی مدھو کے ساتھ ہوا۔ اس کی زبان کا ڈسا پانی نہیں مانگتا تھا۔ ایسی ایسی گالیاں اور کوسنے دیتی کہ شاماں جیسی عورت بھی زچ ہو جاتی۔

وہ اٹھارہ سال کی ہو چکی تھی، اور گاؤں کی نوٹنکی میں اس کی دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی۔ شاماں کے لاکھ کوسنے کے باوجود اس نے وہاں اپنی مفت 'پرفارمینس' ترک نہ کی۔ کیا غضب کا ناچتی تھی۔ نوٹنکی کے کرتا دھرتا بنسی مہاراج اسے بیٹی کی طرح چاہتے تھے۔ انھوں نے مدھو ہی کے کہنے پر اسے ناچ کی باقاعدہ تعلیم بھی دینا شروع کر دی۔

''گرو جی! میرے پاس گرو دکشنا دینے کو کچھ بھی نہیں۔'' وہ ان کے پیر چھوتے ہوئے بولی۔ جانے کیوں اس کی آواز بھرّا گئی تھی۔

''ایک چیز تم گرو دکشنا میں دے سکتی ہو بٹیا۔'' مہاراج اپنے نرم لہجے میں بولے۔

''کہئے مہاراج!'' وہ سراپا عقیدت تھی۔

''تم پورے من سے نرت سیکھو اور پھر اس کلا میں اپنا نام کماؤ، یہی میری گرو دکشنا ہو گی۔'' انھوں نے بہت محبت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا تو مدھو کی آنکھوں کے گوشے بھیگنے لگے۔ اس نے اپنا تن من سب رقص میں جھونک دیا۔ اس کا چاندنی جیسا دودھیا بدن جب دھیرے دھیرے اپنے راز کھولتے ہوئے نرت

کے بھاؤ بتاتا تو بڑے بڑوں کے ایمان ڈولنے لگتے۔ گرو جی اس سے بہت خوش تھے۔

اس دن برابر والے گاؤں میں کسی کی شادی تھی۔ نوٹنکی ٹولی وہاں مدعو تھی۔ گرو مہاراج نے خاص طور پر مدھو کو آنے کو کہا تھا۔ تیز روشنیوں میں سرخ گھاگھرے اور چھوٹی سے کسی ہوئی چولی میں جب مدھو کے سیماب بدن کے زوایئے کھلنا شروع ہوئے تو دل گھنگھرو بن گئے۔ پیسوں کی جیسے برسات شروع ہو گئی۔ نذرانے میں ملے چار سو کے نوٹوں کے لئے چھوٹی سی چولی مزید چھوٹی ہوگئی۔

اسی دن شاماں نے ہمیشہ کے لئے آنکھیں موند لیں۔ مگر جاتے سے ایک معذور بیٹی، بوڑھا بیمار شوہر اور گھنگھرو مدھو کو بخش گئی۔ مدھو بھی جانے نصیب میں کیا لکھوا کر لائی تھی، ساری عمر دوسروں کے رحم و کرم پر گذار دی۔ جو دوسروں نے چاہا وہی ہوا۔ وہ چاہے بابا ہو، شاماں ہو، یا یہ رینو کا..... نہ چاہتے ہوئے بھی اسے اس کی دیکھ بھال کرنا پڑتی۔

''کیا میرا جیون کی سندرتا پر کوئی حق نہیں ہے؟ ماں کا مرنا میرا دوش کیسے ہوا؟ رینو کا روگ لکھوا کر لائی تو کیا بھگوان سے میں نے سفارش کی تھی؟ اور اب شاماں گئی، اس سے تو اچھا تھا بھگوان مجھے ہی اُٹھا لیتا۔''

اسے شاماں کے مرنے کا ملال تھا، کم از کم گھر میں زندگی کا احساس تو رہتا تھا۔ اب تو قبرستان کی سی خاموشی تھی۔ مدھو کا دم گھٹنے لگتا۔ رینو کا سارا دن خاموشی سے جھلنگا سے چارپائی پر پڑی رہتی۔ مدھو کھانا رکھ دیتی تو کھا لیتی، ورنہ بڑے بڑے دیدے گھماتے ہوئے نامراد جانے خلاؤں میں کیا گھورا کرتی۔ بابا نے بھی شاماں کے بعد چپ سادھ لی تھی۔ کبھی مدھو سے آنکھ ملا کر بات نہ کی۔ شاید اندر ہی اندر شرمسار تھا۔ شاماں کی ہر زیادتی پر اس نے اپنا منہ بند ہی رکھا تھا۔ اور اب تقدیر نے اسے مدھو ہی کے رحم و کرم پر لا پھینکا تھا۔ لیکن مدھو سب بھلا کر ان دونوں کی دیکھ ریکھ میں لگ گئی۔ اس پر دوہری ذمہ داری آن پڑی تھی۔ اوپر سے سماج کی نفرت کا بھاری طوق۔ اسے زندگی بوجھ لگنے لگتی۔ روز سوت کات کر چادر بنانا کب آسان ہوتا ہے۔ گونوٹنکی میں اس کا کام بہت سراہا جاتا تھا۔ اس سے کم از کم پیسوں کی چنتا کم ہوگئی تھی، لیکن کبھی کبھی وہ اتنا اکتا جاتی کہ اس کا مرنے کو جی چاہنے لگتا۔

بلراج سے اس کی ملاقات گرو مہاراج نے کروائی تھی۔ اسے راج بھون کے لئے مورتی تراشنا تھی، اور وہ کسی سندر، ملیح چہرے کی تلاش میں تھا۔ جب گرو مہاراج نے اسے مدھو سے ملوایا تو اسے لگا اس کی تلاش مکمل ہوگئی ہے۔ بلراج نے خاصی بڑی رقم اسے یکمشت ادا کر دی تھی۔ لیکن ایک مسئلہ تھا۔ مورتی مکمل ہونے تک اسے بلراج کے ساتھ اس کے سٹوڈیو میں ہی جا کر رہنا تھا۔

''گرو جی! بابا اور رینو کا کا کیا ہوگا۔'' مدھو قدرے فکرمند تھی۔

''تم فکر نہ کرو پتری! میں کوئی انتظام کروا دونگا۔ تم جاؤ، ایسے موقعے بار بار نہیں ملتے۔ راج بھون مورتی کے لئے تمہارا چناؤ بڑی بات ہے بٹیا! بہت بڑی بات، مانو تمہارے تو دن پھر گئے۔'' گرو مہاراج بہت خوش تھے۔

اس نے ان روپیوں میں سے کچھ روپئے بابا کے ہاتھ میں تھمائے اور جانے کی اجازت چاہی۔

''بابا! سندری موسی روز آ کر کھانا اور دوسرے کام کر دیا کرے گی۔ رات کو بھیم چاچا ادھر ہی سوئیں گے۔ تم پریشان نہ ہونا، میں نے سب انتظام کر دیا ہے۔ بس کچھ ہی دنوں میں لوٹ آؤں گی۔'' بابا نے ایک نظر اسے دیکھا اور اپنا کانپتا ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیا۔ مدھو کو لگا جیسے جلتی دھوپ میں اچانک کہیں سے آنے والا بادل برسنے لگا ہو۔

لمبے گیسو، غلافی آنکھوں اور گھٹے ہوئے تنومند جسم والا بلراج ساحر تھا۔ اس کے ہاتھوں کے لمس سے پتھروں میں جیسے زندگی اُگنے لگتی۔ تیشے کی ہر حرکت پتھر میں ڈھلی زندگی کے نشیب و فراز سے نقاب سرکاتی جاتی۔ بلراج خاصا منہ پھٹ اور بے باک تھا۔ مدھو پہروں اس کے سامنے بے لباس کھڑی رہتی۔ شروع شروع میں اسے یہ سب بہت مشکل لگتا۔ بلراج کے بار بار کہنے کے باوجود اس کے بدن میں ایک اَن دیکھا سا تناؤ رہتا۔ بلراج کے نگاہیں اسے چبھنے لگتیں اور نہ چاہتے ہوئے بھی وہ بدن چرانے لگتی۔

''دیکھو مدھو! ایسے کام نہیں چلے گا۔ تمھارے بدن کا تناؤ مجھے کچھ کرنے نہیں دیتا۔'' بلراج سخت غصے میں تھا۔

''سوچو تم یہاں اکیلی ہو بالکل اکیلی۔'' اس کے کھردرے ہاتھ مدھو کے برہنہ شانوں پر ٹکے ہوئے تھے۔ مدھو کا بدن آنچ دینے لگا۔ کھردرے ہاتھوں نے کہیں اندر کوئی احساس جگا دیا تھا۔ بلراج نے بھی اس کی کپکپاہٹ محسوس کر لی تھی۔ اُس کے لبوں پر عجیب سی مسکراہٹ ابھری۔ اس نے ایک جھٹکے سے اسے بانہوں میں بھر لیا۔ مدھو نے وحشت زدہ انداز میں اسے دیکھا، لیکن لہو میں جاگتی آنچ نے اسے بے سدھ کر دیا تھا۔ بہت دھیرے سے اس نے آنکھیں موند لیں۔ جسم کے مختلف حصوں کو چھوتی ہوئی تیز گرم سانسیں کسی نئے جہاں کا در وا کر رہی تھیں۔ مدھو کے لئے یہ سب کچھ بہت نیا تھا۔ انوکھا اور خوبصورت، چکا چوند کر دینے والا، محبتوں کو ترسی ہوئی، ہوس کے کھردرے ہاتھوں کو محبت کا الوہی لمس جان کر تن من ہار بیٹھی تھی اور وہ بھی اپنے سے بیس سال بڑے مرد کے سامنے۔ بلراج جب مختلف زاویوں سے اس کے برہنہ جسم کو دیکھتا اور چھوتا تو مدھو کے انگ انگ سے جیسے مدھرا چھلکنے لگتی۔ قدم بن پیئے بہکنے لگتے۔ آنکھوں میں تیرتے گلابی ڈورے روح تک میں خمار بھر دیتے۔ خود سپردگی کی منزلیں طے کرتے کرتے مدھو کو اچانک

احساس ہوا کہ چاہنے اور چاہے جانے کا احساس کتنا خوبصورت ہوتا ہے۔

''بلراج مجھے چھوڑ تو نہ دو گے۔'' وسوسے مدھو کو ڈسنے لگتے۔

''جیون کون تیا گتا ہے مدھو!'' بلراج کی سرگوشی مدھو کو سرشار کر جاتی۔

مورتی مکمل ہونے والی تھی۔ مدھو کا دل انجانے خدشوں سے لرز لرز جاتا۔ دن بدن پھولتے پیٹ کو چھپانا اب ناممکن تھا۔ بلراج کو علم ہوا تو اس نے چند نوٹ اس کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے بہت سرد مہری سے اسے اس پاپ سے مکت ہونے کا مشورہ دے ڈالا۔ مدھو سکتے کی سی کیفیت میں کھڑی اسے دیکھتی رہ گئی۔

''یہ تم کہہ رہے ہو بلراج؟'' اس کی آنکھوں میں حیرت اور دکھ تھا۔

''تمہارے بھلے کی بات کی ہے، کشٹ بھوگنا چاہتی ہو تو اور بات ہے۔'' اس کا لہجہ بہت سرد تھا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟ تم پتا ہو اس کے۔''

''پتا؟'' بلراج کا قہقہہ بہت طویل تھا۔

''ارے کاہے ہلکان ہوتی ہے اس بالی عمریا میں، عیش کے دن ہیں بس عیش سے غرض رکھ۔'' وہ داہنی آنکھ دبا کر بولا۔

''یہاں تو یہ سب چلتا رہتا ہے، اب میں ہر ایک کو تو گلے میں لٹکانے سے رہا۔''

اس کے لہجے کی اَنی مدھو کو دل میں اُترتی ہوئی محسوس ہوئی۔

بلراج کے لئے تو یہ بہت عام سی بات تھی۔ راجہ صاحب کا خاص اور منہ چڑھا تھا۔ گو، راج، راجواڑوے ختم ہوئے زمانے بیت گئے تھے۔ راجہ صاحب بھی بس اب نام ہی کے راجہ رہ گئے تھے۔ نہ وہ پہلے والا کرّ وفر تھا نہ ہی وہ لوگ جو راجاؤں کا مان سمان ہوا کرتے تھے۔ لیکن مرے ہوئے ہاتھی کی بھی اپنی اہمیت ہوتی ہے۔ راجہ صاحب اپنی پشتینی حویلی کو راج بھون کا نام دے کر ہی بہت خوش تھے۔ حویلی میں وہی نوکروں کی فوج، وہی تام جھام، وہی اللے تللے آج بھی اسی طرح برقرار تھے۔ ہر سال شیوراتری پر راج بھون کے دیوان خاص میں نئی مورتی ایستادہ کی جاتی تھی۔ یہ پرکھوں سے چلی آ رہی ایک رسم تھی جسے ابھی تک نبھایا جا رہا تھا۔ بلراج ہر بار ایک شاہکار تخلیق کرتا تھا۔ اسی لئے راجہ صاحب اسے بہت مانتے تھے۔

مدھو ایک ٹک اسے دیکھے گئی۔ گو وہ بچپن ہی سے ٹھکرائے جانے کا درد سہتی آئی تھی۔ لیکن آج جانے کیوں دل کی رگیں ٹوٹتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ غصہ بے بسی میں اور بے بسی آنسوؤں میں ڈھل گئی۔ آج سے پہلے وہ نصیب پر شاکی رہی تھی، آج اس کا گلہ اپنے آپ سے تھا۔

''اور سنو! صبح وقت سے اُٹھ جانا۔ مورتی میں جو تھوڑا بہت کام باقی ہے وہ ختم کرنا ہے۔ راجہ

صاحب نے دو دن بعد کا مہورت نکلوایا ہے استھاپنا کے لئے۔'' بہت آرام سے کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔ مدھو کے اندر جیسے چھناکے سے کوئی چیز ٹوٹ گئی۔ اس نے نفرت سے اپنے پھولے ہوئے پیٹ کو دیکھا اور زمیں پر تھوک دیا۔ اس کی وہی ازلی بے حسی عود آئی تھی۔ اسی رات نہایت خاموشی سے وہ اپنے گاؤں واپس آ گئی۔ سندری موسی وہیں موجود تھی۔ جہاندیدہ عورت تھی بنا کہے اس کی حالت سمجھ گئی۔

''چل میرے ساتھ۔'' وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر قدرے سختی سے بولی۔

''میں شالنی سے بات کرتی ہوں کوئی کاڑھا ہی بنا کر دے دے تجھے، کس کس سے چھپائے گی اس پاپ کو؟''

''ابھی آتی ہوں، اسے اندر رکھ لوں۔'' اس نے زمین پر پڑی کپڑوں کی پوٹلی کی طرف اشارہ کیا۔ گرہ کھول کر اس نے چادر میں لپٹی ہوئی کوئی چیز نکالی۔ یہ اسکے اپنے سنگی مجسمے کا ٹوٹا ہوا پاؤں تھا، جس کی چھنگلی غائب تھی۔ پاؤں میں بندھے گھنگھرو سنگتراش کے ماہر فن ہونے کی بیّن دلیل تھے۔ ایک گہری سانس لے کر اس نے ٹوٹا ہوا پاؤں جستی صندوق میں رکھا اور چپ چاپ موسی کے ساتھ ہو لی۔ اس بار سنگتراش کا تیشہ خود اسی کو گھائل کر گیا تھا۔

◂◂ ● ▸▸

Arnegger Strasse, 10
9204, Andwil SG, Switzerland
0041791284275

گذارش

ادباء اور شعراء سے گذارش ہے کہ اپنی نگارشات اردو ان پیج (In Page) میں کمپوز کر کے درج ذیل ای میل پر ارسال کریں۔

email : eqbalhasan35@yahoo.com

◂◂ ● ▸▸

اعزازی کاپی بھیجنے سے ادارہ قاصر ہے اس لئے 'ثالث' کے مالی استحکام کے لئے خریداری قبول فرمائیں۔ شکریہ

● نور العین ساحرہ

سانپ

ثمن نے کار سے اترتے وقت ہر طرف پھیلے گھنے سنسان جنگل کی چنگھاڑتی خاموشی کو روح کی گہرائی تک محسوس کیا اور خوف کی ایک سرد لہر اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سرایت کر گئی۔ اس نے اظہار سے گریز کیا کہ خود کو بزدل ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ پہلے ہی سب لوگ اس کے سانپ سے بے پناہ خوف کی وجہ سے ہر وقت اس کا مذاق اڑانے سے باز نہیں آتے تھے۔

ایک ہاتھ میں پرس اور دوسرے میں کتاب کے ساتھ ساتھ پانی کی بوتل پکڑے جنگل کی طرف ابھی پہلا قدم اٹھایا ہی تھا کہ وہ بوتل اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گھنی جھاڑی میں لڑھک گئی۔

''اوہ گاڈ! اتنی گرمی ہے پہلے ہی سے اور میرا پانی بھی گر گیا۔'' اس نے بے بسی اور بے زاری کے ملے جلے احساس کے ساتھ آگ برساتے سورج کو دیکھ کر بآواز بلند احتجاج کیا۔ اپنے ماتھے سے پسینہ صاف کیا اور جھاڑی میں سے پانی کی بوتل اٹھانے کو جھکی۔

''رک جاؤ ثمن! میں کار سے دوسری بوتل نکال لاتا ہوں۔ اس جھاڑی میں کوئی سانپ بھی ہو سکتا۔ بھلے وہ بچارہ معصوم سا بغیر زہر کے گارڈن سنیک ہی کیوں نہ ہوا..... مگر تم نے تو اس کی دہشت سے ہی مر جانا ہے۔'' اس کے بھائی جمی نے اس کو جھکتے دیکھ کر روکنا چاہا تو وہ گھبرا کر پیچھے بھاگی اور خوفزدہ ہو کر کار کے بونٹ پر چڑھ کر یوں بیٹھ گئی گویا واقعی زہریلا ترین سانپ دیکھ ہی لیا ہو۔

وہ ہمیشہ سانپ کے نام تک سے یونہی ڈرتی تھی حتیٰ کہ اس کا ذکر بھی سن لیتی یا کسی کتاب میں اس کی تصویر بھی دیکھ لیتی تو پیر اُٹھا کر پلنگ یا صوفے پر رکھ لیا کرتی اور بند آنکھوں سے صفحہ پلٹنے کے باوجود خوف سے گھنٹوں دل دھک دھک کرتا رہتا۔ اب وہ خود کو کوس رہی تھی کہ وہ ماما اور سبین کے منع کرنے کے باوجود ایڈونچر کے شوق میں کیوں جمی اور صبی کے ساتھ اس ویران جنگل میں چلی آئی تھی۔ وہ دونوں سخت گرمی کے دنوں میں اکثر اپنے دوستوں کے ساتھ جنگل میں چھپی اس نہر میں نہانے آیا کرتے تھے۔ وہ جھنجھلائی۔

''کیوں لائے ہو تم دونوں مجھے یہاں اور میں بھی کتنی پاگل ہوں جو جنگل دیکھنے کے شوق میں مان بھی گئی۔ اچھا خاصا انجوائے کر رہی تھی اپنی فرینڈز کے ساتھ۔ سبین کی سالگرہ کی تیاری بھی مجھے ہی کرنی

تھی۔'' اس پر جمی غصے سے چڑ کر بولا۔

''ارے بابا! صرف دو گھنٹے کی تو بات ہے۔ تم نہر میں پیر لٹکا کر اپنی کوئی اچھی سی کتاب پڑھنا اور ہمارے جوتے، کپڑے اور سیل فون کی حفاظت کرنا تاکہ پچھلی بار کی طرح کوئی انہیں چرا نہ لے جائے۔ ہم صرف دو گھنٹے نہر میں نہانے کے بعد واپس چلیں گے۔ راستے میں تمھاری فیورٹ ببل ٹی بھی پلائیں گے۔ پھر تم جی بھر کے اپنی پیاری دوست کی سالگرہ کی تیاری کرتی رہنا۔''

باتیں کرتے کرتے تینوں جنگل کے اندر دوبارہ قدم بڑھا چکے تھے۔ پارکنگ لاٹ میں ان کے علاوہ بھی ایک کار موجود تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ کچھ اور لوگ بھی اردگرد موجود ہیں۔ اس کار کو دیکھ کر ثمن کا خوف تھوڑا سا کم ہوا ہی تھا کہ سامنے گھٹنوں تک لمبی گھاس میں صبی اور جمی کو مزے سے چہل قدمی کرتے دیکھ کر وہ ٹھٹھک کر وہیں رک گئی اور جھلا کر بولی۔

''تم جانتے ہو جنگلوں میں کتنے سانپ ہوتے ہیں اور اتنی شدید جھلستی ہوئی دوپہر میں تو ضرور اپنے بل سے باہر بھی نکلیں گے۔ میں باز آئی ایسے ایڈونچر سے۔ ہرگز اس گھاس میں نہیں آ سکتی۔ اس سے اچھا ہے کار میں بیٹھ کر تم دونوں کا انتظار کر لوں۔ تم لوگ نہا کر وہیں آ جانا۔''

وہ دونوں پلٹے اور کوئی بحث کئے بنا اس کو بازوؤں سے پکڑ کر زبردستی نہر کی طرف چل پڑے۔ اپنا کوئی بس نہ چلتا دیکھ کر وہ بھی چپ چاپ ان کے ساتھ گھسیٹے ہوئے نہر کے کنارے تک پہنچ گئی۔ یہاں پہنچ کر جو منظر دیکھا تو اس کی ساری کلفت دور ہو گئی اور اسے یقین ہونے لگا کہ اس کا یہاں آنے کا فیصلہ اتنا بھی غلط نہ تھا۔ ایک عجیب ٹھنڈک، تازگی، زندگی اور خوبصورتی کا احساس اس کے رگ و پے میں اُتر گیا۔ نہر کافی بڑی اور چوڑی تھی مگر اس مقام پر زیادہ گہری نہ تھی۔ بیچ میں کہیں کہیں کائی زدہ نوکیلے پتھر بھی پانی سے باہر نکلے نظر آ رہے تھے جن کے اوپر احتیاط سے چل کر پل کی طرح نہر کے پار بھی جایا جا سکتا تھا۔ نہر کے گدلے سے پانی میں چھوٹی چھوٹی ہزاروں مچھلیاں جیسے کوئی جشن منا رہی تھیں۔ اسے ایسا لگا وہ کسی پرستان میں پہنچ گئی ہے اور ابھی پریاں یہاں غسل کرنے کو آنے والی ہیں۔ دونوں طرف گہرا گھنا جنگل تھا اور پتوں کے اندر سے چھن چھن کر آتی روشنی نہر کے پانی میں جہاں جہاں پڑتی وہاں شعاؤں کی چمک آنکھوں کو خیرہ کرتی جا رہی تھی۔ وہ قدرت کی اس بے پناہ خوبصورتی اور صناعی سے مسحور ایسے ساکت کھڑی تھی جیسے کہ ذرا سی حرکت کرنے کی صورت میں وہ سارا منظر کسی کیلنڈر کے صفحے کی طرح پلٹ جائے گا۔ جمی اور صبی نے اپنے تیراکی کے لباس پہن لئے تھے اور اس کے لئے پتھروں پر ایک چادر بچھا کر سارا سامان بھی سیٹ کر دیا۔ وہ پانی میں پیر لٹکا کر مزے سے کتاب گود میں لے کر پڑھنے کی بجائے قدرت کی خوبصورتی میں کھو سی گئی۔ نہر

کے درمیان بڑے بڑے پتوں اور سفید پھولوں والا خوبصورت درخت موجود تھا۔ ایک لمحے کے لئے اس نے خود کو اس درخت کے سائے تلے کسی ملکہ کی طرح تخت پر بیٹھا محسوس کیا جس کے پتے ہوا سے ہل کر مورچھل کا کام دے رہے تھے۔ وہ خود کو روک نہ پائی اور ان نوکیلے پتھروں پر سنبھل سنبھل کر پیر رکھتی گرتی پڑتی کسی نہ کسی طرح اس درخت کے نیچے جا کھڑی ہوئی۔ راستے میں کئی بار پھسلتے پھسلتے بچی تھی۔ صبی اور جمی نے اس حرکت پر تالیاں پیٹ پیٹ کے کسی کرتب دکھانے والی خاتون کی طرح اس کو ڈھیروں داد دی۔ وہ اس وقت بہت خوش تھی اور بالکل بھول چکی تھی کہ وہ یہاں آنے پر ابھی کتنا ناراض ہو رہی تھی۔ وہ دونوں تو تیرتے ہوئے گہرے پانی میں جانے والے تھے اس لئے جب پانی میں اُترنے لگے تو اچانک معلوم ہوا کہ صبی اپنی لائف جیکٹ تو کار ہی میں چھوڑ آیا تھا۔ وہ لینے جا رہا تھا کہ جمی کو بھی اپنی کئی چیزیں یاد آ گئیں جو اسی وقت کار سے لانا بہت ضروری تھیں۔ اتنی لمبی لسٹ سن کر صبی گھبرا گیا اور غصے سے بولا۔

''تم چلو خود بھی میرے ساتھ۔ میں اکیلا اتنا سامان کیسے لا سکتا ہوں بھلا؟''

ان دونوں نے پلٹ کر ثمن کی طرف اجازت طلب نظروں سے دیکھا اور کہا۔

'' صرف پانچ منٹ لگیں گے۔ تم اکیلی گھبرا تو نہیں جاؤ گی؟'' اس نے ایک ذرا ہلکا سا خوف محسوس کیا۔ پھر کافی دور کچھ دوسرے لوگوں کو نہاتے دیکھ کر خوش ہو گئی جو دھبوں کی طرح نظر آ رہے تھے اور مسکرا کر بولی۔

''نہیں، میں ٹھیک ہوں، تم لوگ جاؤ۔ اپنا سیل فون ساتھ لے جانا اور میرا یہاں چھوڑ جانا۔ اگر کوئی ایمرجنسی ہوئی تو کال کر لوں گی۔ ویسے بھی کار اتنی دور بھی نہیں کہ کسی مشکل کی صورت میری چیخ بھی نہ سن پاؤ۔''

جیسے ہی وہ دونوں کار کے نزدیک پہنچے تو کار کی حالت دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ کسی نے وہاں سے گزرتے وقت ان کی کار کو بری طرح ٹکر ماری تھی اور گاڑی کا پچھلا دروزاہ بالکل ٹوٹ کر اندر دھنس گیا تھا۔ پچھلا شیشہ بھی ٹوٹ گیا تھا۔ جمی نے ابھی بالکل نئی کار لی تھی۔ اس کا یہ حشر دیکھ کر وہ ہکا بکا رہ گیا اور غم یہ تھا کہ ٹکر کرنے والا بھی پکڑا نہیں جا سکتا تھا کہ اس کی انشورنس یہ نقصان بھر دیتی۔ سارا نقصان خود اس کے اپنے ذمے آ گیا تھا۔ وہ دونوں کار کی حالت دیکھ کر بار بار گھر اور انشورنش کمپنی کو فون کرنے میں اتنے گھبرائے کہ ثمن کے بارے تو بالکل بھول ہی گئے۔

ثمن مکمل طور پر اس حسین ترین منظر میں گم ہو کر اپنے حواس کھو چکی تھی۔ اس کو یہ احساس تک نہیں ہو رہا تھا کہ وہ وہاں بالکل اکیلی تھی اور صبی، جمی کو گئے پانچ نہیں بلکہ تیس منٹ ہو چکے تھے جو یقیناً فکر مند ہونے والی بات تھی۔ اس نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ ہر بار صبی اور جمی کے ساتھ یہاں ضرور آیا

کرے گی بلکہ باقی گھر والوں کو بھی یہیں پکنک منانے پر اکسائے گی۔ اس کو پہلی بار احساس ہوا کہ خاموشی کیسے محو کلام ہو سکتی ہے اور اس کی اپنی ایک زبان ایک فیلنگ ہوتی ہے۔ ہر طرف جنگلی پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو، تا حد نظر پھیلی ہریالی، دھیرے دھیرے بہتے پانی کی دلکش موسیقی اور اس پر پتوں سے چھن چھن کر آنے والی سورج کی شعاؤں کا دلچسپ رقص اس کے دل و نظر کو خیرہ کر رہا تھا۔ اس نے خوشبو محسوس کرنے کے لئے سفید پھول والی ٹہنی کو اپنے چہرے کے قریب تر کر لیا۔

اب وہ وہیں بیٹھنے کے لئے مناسب جگہ کی تلاش میں نظریں دوڑا رہی کہ خوف سے اپنی جگہ جم کر رہ گئی اور جیسے سانس لینا ہی بھول گئی۔ جن پتھروں پر پیر رکھ کر چلتی آئی تھی وہیں ایک پتھر کی اوٹ میں بہت بڑا زہریلا سانپ لیٹا شاید ان ہی ساری کیفیات سے لطف اندوز ہو رہا تھا جن کا کچھ دیر پہلے تک وہ خود شکار رہی تھی۔ کافی دیر تو وہ خوف سے پتھر بنی رہی پھر دھیرے دھیرے حواس میں آنے لگی۔ یہ سوچ کر تھر تھر کانپنے لگی کہ سانپ کے اتنا قریب سے گزر کر آئی تھی۔ اس کو کچھ اندازہ نہیں تھا وہ سانپ اس وقت بھی موجود تھا یا بعد میں آ کر وہاں لیٹ گیا تھا۔ اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا زندگی میں اصلی سانپ سے اس کا واسطہ پڑے گا وہ بھی اس قدر قریب سے کہ روح فنا ہونے لگے۔ اب زندگی اور زندہ رہنے کی تمام حسیات تیزی سے بیدار ہونے لگی تھیں۔ خوف کی شدت سے بے ہوش ہونے کی بجائے اس نے خود میں ایک عجیب حیران کن حد تک بہادری کی لہر سرایت کرتی محسوس کی اور تخت اور تختہ یا تنگ آمد بجنگ آمد کے مقولے پر عمل کرنے کو جیسے تیار ہو گئی۔ اس کو بہت سمجھداری اور احتیاط سے خود کو بچانا تھا۔ اچانک یہ بھی احساس ہوا کہ صبی اور جمی کو گئے بھی تو بہت دیر ہو چکی تھی، شاید آدھا گھنٹہ یا کچھ زیادہ ہی۔ اپنی جگہ یہ بات بھی کم پریشان کن نہ تھی۔ پہلی بار ہاتھ پر گھڑی نہ باندھنے کی عادت پر بہت غصہ آیا۔ وہ چیخنا نہیں چاہتی تھی کیونکہ کہیں پڑھا تھا کہ سانپ سن نہیں سکتا صرف آواز کی لہروں کو محسوس کر کے ری ایکشن دیتا ہے۔ سو وہ بولنے کی حماقت نہیں کر سکتی تھی۔ تیزی سے اس کے دماغ نے سارے حساب کتاب کر ڈالے اور اس نے چپکے چپکے اپنے قدم اس کنارے کی طرف بڑھانا شروع کر دیئے جو اس کے سامان اور کار کی مخالف سمت میں تھا لیکن قریب تھا۔ اس کو کچھ علم نہیں تھا وہاں سے واپسی کیسے ہوتی مگر اس وقت تو سانپ سے دور جانا سب سے زیادہ اہم تھا۔ جیسے ہی وہ اس کنارے پر پہنچی اور مڑ کر دیکھا تو سانپ کو بھی اپنی طرف آتا پا کر چیخی اور دیوانہ وار جنگل میں بھاگی۔ بار بار پیچھے مڑ کر دیکھتی جاتی تھی۔ سانپ نے جیسے اس کا پیچھا کرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا تھا اور مزے سے کنڈلی مار کر کنارے پر ہی بیٹھ گیا تھا۔ وہ پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتے ہوئے تیزی سے بھاگ رہی تھی کہ اچانک کسی سے ٹکرا کر گر پڑی۔ سامنے دیکھا تو دو اجنبی ہاتھ میں شراب کے کھلے کین پکڑے حیرت سے اس کو دیکھ

رہے تھے۔ان کو دیکھ کر اسے ایسا لگا جیسے نئی زندگی مل گئی ہو۔صحرا میں بھٹکتے ہوئے کسی آبادی کا راستہ مل گیا ہو۔وہ بے ربط ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں ان کو بتانے کی کوشش کرنے لگی مگر ان کے چہرے پر اُلجھن دیکھ کر یاد آیا کہ وہ تو اردو بول رہی ہے۔ان کو کیا خاک سمجھ آئے گی۔جانے کون لوگ ہیں کونسی قومیت رکھتے ہیں۔ یہ وقت ایسی باتیں سوچنے کا نہیں تھا۔وہ جلدی سے اب وہی کوشش انگلش میں کرنے لگی کہ یہ زبان تو ہر ایک کو تھوڑی بہت آتی ہی ہے۔اس کے باوجود ان لوگوں کو کوئی ردعمل ظاہر نہ کرتے دیکھ کر اک دم خاموش سی ہوگئی۔ایسا لگا جیسے کہیں کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ایک خوف کی لہر اس کے بدن میں دوڑنے لگی اور ان دیکھے انجانے خطرے کا احساس کنڈلی مار کر دل میں بیٹھ گیا۔دہشت سے کانپتی ان کی طرف دیکھنے لگی۔وہ نشے میں کافی دھت تھے اور بہت واضح طور پر ان کی آنکھوں میں ہمدردی کی بجائے ہوس کے ہزاروں پھنکارتے زہریلے سانپوں کو اپنی طرف لپکتا دیکھ سکتی تھی۔وہ اپنے اپنے شراب کے کین پھینک کر اس کی طرف بڑھنے کو پرتول رہے تھے اور ان کے چہرے پر بہت شیطانی مسکراہٹ تھی۔

''نہیں،نہیں، پلیز ! میرے ساتھ ایسا مت کرو۔تمھارا جو بھی مذہب ہے یہ بہت بڑا گناہ ہے۔ اخلاقی اور قانونی طور پر بھی جرم ہے۔میں ابھی 911 کو کال کرتی ہوں۔'' وہ بے بس مجبور لڑکی جوان درندہ نما انسانوں سے مدد کی خواہاں تھی،خود کو پہلے سے بھی بڑے عذاب میں گھرا دیکھ کر جیسے ہمت ہار گئی اور زمین پر ڈھے سی گئی۔وہ دونوں اس کے عین سر پر پہنچ چکے تھے اور اپنی حفاظت کے لئے اس کے پاس کچھ بھی موجود نہیں تھا۔اس نے لاچاری سے ادھر ادھر کسی ہتھیار نما چیز کی تلاش میں نظر دوڑائی جو نا کام لوٹ آئی تھی۔اتنی دیر میں ایک شخص نیچے جھکا اور اس کو اپنی آغوش میں لینے کی کوشش کرنے لگا۔اس نے بے بسی سے آخری بار آسمان کی طرف امید بھری نظروں سے دیکھا کہ شاید کہیں سے ابابیلیں چونچ میں پتھر لئے آموجود ہوں اور آج بھی کوئی معجزہ رونما ہو جائے۔اسی لمحے اپنے بچاؤ کی خاطر تیزی سے چلتے دماغ میں امید کا کوندا سا لپکا۔اس کو ہتھیار مل گیا تھا۔وہ اپنی طرف بڑھتے ہوئے شخص کو کسی طرح پیچھے دھکیل کر اسی سانپ کے پاس پہنچ گئی۔جس سے بھاگ کر وہ ان سانپوں کے چنگل میں پھنس گئی تھی۔سانپ کی موجودگی سے بے خبر، وہ دونوں اس کے پیچھے لپکے۔اتنی دیر میں وہ تیزی سے جھکی اور سیدھے ہاتھ سے سانپ کو منہ کی طرف سے اُٹھا کر ان دونوں کی طرف اچھال دیا۔یہ سب اس برق رفتاری سے انجام پایا کہ کسی کو کچھ بھی سمجھنے کا موقع نہیں مل سکا۔سانپ نے اپنے ساتھ رونما ہونے والے اس واقعے پر برہمی کا اظہار ان میں سے ایک آدمی کے ہاتھ پر ڈس کر کیا۔اتنے زہریلے سانپ کو دیکھ کر وہ دونوں بہت خوفزدہ ہو گئے تھے۔جس کو ڈسا تھا وہ زمین پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گیا۔اس نے دیکھ لیا تھا سانپ بہت خطرناک تھا اب شاید ہی وہ بچ پاتا۔

اس کا ساتھی اس غیر متوقع صورت حال سے ہراساں ہو کر اسے سنبھالنے میں لگا تھا۔اس نے خوف اور حیرت کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ مڑ کر اس بہادر لڑکی کو دیکھا تھا۔سانپ کی تصویر دیکھ کر خوف اور دہشت سے سن ہو جانے والی شمن کی جگہ وہاں اب ایک پراعتماد اور بہادر لڑکی کھڑی تھی۔اس کو خود بھی یقین نہیں ہو رہا تھا کچھ دیر پہلے تک یہی سانپ اس کے اپنے ہاتھوں میں موجود تھا۔اس نے پھر نظر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا اور تشکر سے احساس سے مسکرا دی۔شاید ایک اور معجزہ رونما ہو چکا تھا اور وہ سانپ سرسراتا ہوا کہیں گھنی جھاڑیوں میں گم ہو رہا تھا۔

◀◀ ● ▶▶

3494 Caledonia Sir
Woodbridge, VA 22192(USA)
Contact No:301-300-1305

بغداد میں ایک نوجوان تھا- وہ بہت خوبصورت تھا،اور اس کا کام نعل سازی تھا- وہ نعل بناتا بھی تھا اور گھوڑے کے سموں پر چڑھاتا بھی تھا-نعل بناتے وقت تپتی بھٹی میں سرخ شعلوں کے اندر وہ نعل رکھتا اور پھر آگ میں اسے کسی 'جمور' یا کسی اوزار کے ساتھ نہیں پکڑتا تھا بلکہ آگ میں ہاتھ ڈال کے اس تپتے ہوئے شعلے جیسے نعل کو نکال لیتا اور اپنی مرضی کے مطابق اسے شکل دیتا تھا-لوگ اسے دیکھ کر دیوانہ کہتے اور حیران بھی ہوتے تھے کہ اس پر آگ کا کوئی اثر نہیں ہوتا- وہاں موصل شہر کا ایک شخص آیا۔جب اس نے ماجرا دیکھا تو اس نے تجسس سے اس نوجوان سے پوچھا کہ اسے گرم گرم لوہا پکڑنے سے کیوں کچھ نہیں ہوتا؟ اس نوجوان نے جواب دیا کہ وہ جلدی میں لوہے کو اٹھا لیتا ہے اور اب اس پر ایسی کیفیت طاری ہوگئی ہے کہ اس کا ہاتھ اسے برداشت کرنے کا عادی ہو گیا ہے-اور اسے کسی جمور یا پلاس کی ضرورت نہیں پڑتی -اس شخص نے کہا کہ میں اس بات کو نہیں مانتا۔''یہ تو کوئی اور ہی بات ہے-''اس نے نوجوان سے کہا کہ مجھے اس کی حقیقت بتاؤ؟ اس نوجوان نے بتایا کہ بغداد میں ایک نہایت حسین وجمیل لڑکی تھی اور اس کے والدین عمرے کے لئے گئے،اور کسی حادثے کا شکار ہو کے وہ دونوں فوت ہو گئے- اور یہ لڑکی بے یار و مددگار اس شہر میں رہنے لگی- وہ لڑکی پردے کی پلی ہوئی،گھر کے اندر رہنے والی لڑکی تھی اب اس کو سمجھ نہیں آتی تھی کہ زندگی کیسے گزارے- آخر کار نہایت غمزدہ اور پریشانی کی حالت میں وہ باہر سڑک پر نکل آئی -اس نے میرے دروازے پر دستک دی اور کہا۔''کیا ٹھنڈا پانی مل سکتا ہے؟''میں نے کہا، ہاں اور اندر سے اس لڑکی کو ٹھنڈا پانی لا کر پلایا اور اس لڑکی نے کہا خدا تمھارا بھلا کرے- میں نے اس سے پوچھا کیا تم نے کچھ کھایا بھی ہے کہ نہیں؟ اس لڑکی نے کہا نہیں میں نے کچھ نہیں کھایا- میں نے اس سے اکیلے اس طرح پھرنے کی وجہ پوچھی تو اس لڑکی نے اپنے اوپر گذرا سارا واقعہ سنایا اور کہا کہ مجھے سمجھ نہیں آتی میں زندگی کیسے بسر کروں- میں نے اس سے کہا کہ تم شام کو یہیں میرے گھر آجانا اور میرے ساتھ کھانا کھانا- میں تمھیں تمھاری پسند کا کھانا کھلاؤنگا وہ لڑکی چلی گئی -اس نوجوان نے بتایا کہ میں نے اس کے لئے کباب اور بہت اچھی اچھی چیزیں تیار کیں وہ شام کے وقت میرے گھر آگئی اور میں نے کھانا اس کے آگے چن دیا- (بقیہ صفحہ ۱۱۷ پر)

● عمر احمد بنگش

ناٹکا

''پتی والا پان لگائیو.....'' محمد شوکت عرف شوکی اُداس نے سڑک کے بیچ سے ہی آواز لگائی مگر کھوکھے والا بدستور منہ پر کھڑے گاہکوں کو سگریٹ پان اور ٹھنڈی بوتلیں برتانے میں مصروف رہا۔

''تیرے کان میں بھی حرام اُگ آیا ہے کیا؟ جلدی سے پان لگا.....'' شوکی جواب فٹ پاتھ پر تھا، یوں مخاطب کیا تو شنوائی ہوئی مگر منہ پھاڑ کر گالی واپس کی گئی اور مزید کچھ کہے کھوکھے والے نے کاغذ کی پُڑیا میں لپٹا پان اس کی جانب اچھال دیا۔ شوکی تیز پتی والا پان منہ میں اڑس، ہلکے دانتوں سے چباتا تھیٹر کی جانب بڑھ گیا۔

تھیٹر کے داخلی راستے میں سامنے کی دیوار پر اشتہار آویزاں ہے۔ آٹھ فٹ چوڑی اور پانچ فٹ عرض کی پینا فلیکس پلاسٹک کے اشتہار پر تین مقامی اداکاراؤں کے میک اَپ زدہ چہروں کی خاصی مضحکہ خیز تصویریں چھپی ہیں۔ ان تصویروں کے اردگرد کی خالی جگہ پر لگ بھگ آدھے درجن اداکاروں کی تصویریں چھوٹے گول دائروں میں اشتہار کے سرمئی پس منظر میں یوں بکھری ہیں کہ مٹی میں رُلتی بلوروں کا گماں ہو۔ نیچے کے ایک کونے میں معاون اداکاروں کے نام درج ہیں جن میں ایک نام شوکی اُداس کا بھی ہے۔ سرراہ ٹنگے اتنے بڑے اشتہار پر اپنا نام دیکھ کر اس کا سینہ چوڑا سا ہو گیا۔

اشتہار میں اپنے نام کے سرور سے سرشار، منہ میں پان اور ہاتھ میں پان کی کتھے سے رنگی ہوئی پڑیا کا کاغذ مسل کر روڑی بنائی اور اسے ایک جانب کو اچھال کر کتھے سے لال ہوتا ہاتھ دیوار پر رگڑ کر پونچھا اور پھر تیل پلائے لانبے بالوں پر پھیرتے ہوئے بائیں ہاتھ پر ٹکٹ کی کھڑکی کی جانب مڑ گیا۔ کھڑکی کے سامنے ٹکٹ خریدنے والوں کا اچھا خاصہ مجمع تھا کہ آج رات شہر کی مشہور رقاصہ جلوے دکھانے کو سٹیج پر اُترنے والی تھی۔ یہاں رک کر اس نے داہنے ہاتھ سے کان میں ڈلی بالی کو ادب سے چھوا گویا کسی مزار کی جالی پر ٹنگی منت ہو۔ پھر ماتھے پر ہاتھ ٹکا کر با آواز بلند اجتماعی سلام گزار کیا۔ چند ایک نے مڑ کر دیکھا مگر جواب دینے کی زحمت نہیں کی۔ رش میں سے راستہ بناتا ٹکٹ کی کھڑکی کے ساتھ ملحق پروڈیوسر صاحب کے دفتر میں حاضری دینے کی غرض سے آگے بڑھ کے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔

دفتر دس ضرب بارہ فٹ کا معمولی کمرہ تھا جس کا فرش کھدڑا سا اور دیواریں میلی تھیں۔ دیواروں پر فلمی پوسٹر چسپاں تھے، جن میں سے اکثر کی روشنائی اب عرصہ گزر جانے پر مدھم پڑ گئی تھی۔ دیواریں ان فلمی پوسٹروں کے سبب اور بھی بھدی محسوس ہو رہی تھیں۔ کمرے کے وسط میں ایک چوکور میز پر الا بلا دھر رکھا تھا، جس کے گرد ایک دفتری اور سامنے تین مہمانوں کی کرسیاں ترتیب سے بچھی ہوئی تھیں۔ دروازے سے داخل ہوں تو دائیں طرف کی دیوار کے ساتھ جوڑ کر ایک پرانے فیشن کا صوفہ بچھا ہوا تھا جو اس کمرے کے حساب سے خاصہ بے ڈھنگا محسوس ہوتا تھا۔ دفتر میں اس وقت پروڈیوسر صاحب کے ساتھ سٹیج ڈراموں کی اداکارہ شبانہ اپنی ماں کے ہمراہ موجود سنبھل کر بیٹھی تھی۔ شبانہ کو سٹیج کی دنیا میں اصل نام سے کم ہی لوگ جانتے تھے، فلمی نام شب چوہدری ہر خاص و عام میں یکساں مقبول تھا۔ یہ پانی چڑھے سونے سے لدی پھندی اور خاصے چست ریشمی لباس میں، چہرے پر مسکراہٹ سجائے، ایک ادا سے کبھی بالوں کی لٹ سنبھالتی اور پھر سنہری چوڑیوں سے کھیلتی ہوئی پروڈیوسر صاحب کی طرف متوجہ ہو کر بیٹھی تھی۔ ایک لمحے کو اگر خاصی بے باک نظر آتی تو دوجی ہی نظر میں یوں سنبھل جاتی کہ جیسے گٹھری ہو۔ پروڈیوسر صاحب پچاس کے پیٹے میں درمیانے قد کے آدمی ہوں گے، شبانہ کے پہلو میں اس پر یوں جھک کر کھڑے تھے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کمر میں یہ خم ازلی ہے۔ اس پر یوں جھک کر وہ خدا جانے شبانہ کو کیا سمجھا رہے تھے۔ پروڈیوسر صاحب کی سرگوشیاں سی گو اس کو سنائی نہ دیں پر شبانہ ایسے دکھتی تھی جیسے کوئی پتلی ہو جس کی ڈور پروڈیوسر صاحب نے تھام رکھی تھی۔ پروڈیوسر صاحب کی ہر بات اور اشارے پر اثبات میں ایک ناز سے جی ہاں، جی ضرور کی رٹ الاپتے تھک نہیں رہی تھی اور سامنے کرسی پر بیٹھی اس کی ماں اس پر اپنے دونوں ہاتھوں کو آگے کھینچ کر مٹھیاں بنا کر سر تک واپس کھینچ کر بلائیں لیتی جاتی تھی۔ باوجود اس عورت کی خوشامدیوں تو خاصی بے تکی محسوس ہوتی تھی مگر پھر بھی یہ ایسی ہوشیار تھی گویا کسی تیار باغ کا مالی ہو۔ شوکی کو یوں اس طرح بے دھڑک دفتر میں گھستے دیکھ کر پروڈیوسر صاحب کا پارہ چڑھ گیا۔ اسے وہیں کھڑے کھڑے جھڑک دیا۔

''ابے! تو یہاں کاہے کو گھسا چلا آ رہا ہے؟ سیٹھ کی اولاد کو دیکھو.....شو شروع ہونے میں پندرہ منٹ باقی ہیں اور یہ لاٹ صاحب ابھی تشریف لا رہے ہیں.....سین کی تیاری کیا تیرا باپ کرے گا؟''

شوکی کھسیانا سا اُلٹے قدموں باہر نکل آیا اور ہال کے ہنگامی راستے سے گزرتے ہوئے بڑبڑایا۔

''حرامی کا بڑھاپا دیکھو اور کیسے سلیش کی طرح چپک رہا تھا۔''

یہاں سے سیدھا چلتے ہوئے یہ ہال کے بالکل پچھواڑے پہنچ گیا جہاں سے سیدھا ڈریسنگ روم کی پشت کا دروازہ کھلتا تھا۔ ڈریسنگ روم میں خاصہ شور مچ رہا تھا۔ اسے اپنے سین کے لئے تیار ہونے میں

بمشکل پانچ منٹ لگے اور یہ وہاں سے باہر گیلری میں نکل آیا۔

آج رات ڈرامے کے تین شو تھے۔ دو گھنٹے کے ناٹک میں شوکی کا کردار ایک محافظ کا ہے جو ملیشیا لباس پہنے، ہاتھ میں بندوق اٹھائے بس چند منٹ کے لئے مرکزی اداکارہ کے ساتھ سٹیج پر نمودار ہوتا ہے۔ پھر دو ڈائیلاگ ہکلاتے ہوئے یوں ادا کرنے کہ معنی فحش ہو جائیں اور آخر میں دوسرے کرداروں کے ہاتھوں چند فقرے اور جھوٹ موٹ کی مار کھا کر ہٹ رہتا۔ اس مختصر سین کے بعد فوراً بعد رقص شروع ہو رہتا اور اس کی گلوخلاصی ہو جاتی، اللہ اللہ خیر صلا۔ مگر پروڈیوسر صاحب نے اس کو یوں جھڑکا تھا گویا یہ ڈرامے کا مرکزی کردار ہے جس کو تقریباً ہر وقت سٹیج پر گزارنا ہو۔ ڈرامے کو شروع ہوئے اب تھوڑی دیر ہو گئی تھی اور شوکی کو ابھی بھی خاصہ وقت میسر تھا۔ یہ گیلری میں دیوار سے کرسی ٹکا کر بیٹھ گیا اور سگریٹ سلگا لی۔ ڈریسنگ روم اور سٹیج کے بیچ اس مختصر گیلری میں تھیٹر عملے اور فنکاروں نے اودھم مچا رکھا تھا۔ ایک کونے پر ڈریسنگ روم اور دوسرے پر سٹیج تھا، دونوں ہی سرے اس وقت بقعہ نور بنے ہوئے تھے اور بیچ کی گیلری میں صرف ایک زرد بلب روشن تھا جس کی میلی روشنی نے لمبوترے راستے میں افسردگی بھر رکھی بھر دی تھی۔

پتہ نہیں یہ سگریٹ کا اثر تھا یا گیلری میں بے وجہ اداسی، ماضی کی یاد شوکی کو غڑاپ سے نگل گئی۔ اس گیلری سے اس کی بے شمار یادیں وابستہ ہیں۔ گو شوکی کو سٹیج پر ڈرامے کرتے چھ برس سے زائد ہو چلے تھے مگر اس مقام سے نسبت اس سے بھی پہلے کی ہے۔ شوکی کا باپ بائیس سال تک اسی تھیٹر میں باہر جنگلے پر ٹکٹ چیک کرنے اور مفت بروں پر نظر رکھنے کا بیگار کرتا رہا جبکہ ماں کی ساری جوانی اسی سٹیج پر رقص کرتے گزر گئی۔ تب اسٹیج کا رنگ کچھ اور ہوا کرتا تھا۔ فنکار کی عزت تھی اور جیسے ہی شو ختم ہوتا، یہی گیلری مداحوں سے یوں بھر جایا کرتی تھی کہ فرداً فرداً سب پر داد کے ڈونگرے برستے اگلے شو کا وقت ہو جاتا اور سب پر بھاگم بھاگ طاری ہو جاتی۔ ہر رات دوسرا شو چڑھتا تو سب چھوٹے بڑے فنکار تعریفوں کی گرمائش سے جیسے میدے کا کلچہ پھول جائے، اسی طرح کُپا ہوئے سٹیج پر نمودار ہوتے۔

ہال میں پٹتی تالیوں اور بڑھتے شور سے خیال ٹوٹ گیا اور اس نے سگرٹ کی راکھ جھاڑ کر ایک کش لیا۔ ماجھو چاچے کی لڑکی نگینہ ایک واہیات گانے پر بے ہنگم رقص کر کے لوٹ رہی تھی۔ اس نے تیز بینگنی رنگ کی کرتی پہن رکھی ہے جو پسینے میں نچڑ رہی تھی۔ نیچے لاچہ تھا جو خاصہ گھیر دار تھا مگر پھر بھی جب قدم آگے رکھتی تو ٹانگیں مناسب حد تک عریاں ہو جاتیں اور اگلے قدم پر گوگھیر سے عریانی ڈھک جاتی مگر اس چھپن چھپائی سے دیکھنے والے کی آنکھ میں تشنگی سی رہ جاتی۔ شوکی ٹھنڈی آہ بھر کر رہ گیا۔

نگینہ کے جاتے ہی اس نے بوجوہ سگرٹ دیوار سے رگڑ کر بجھایا اور ادھ پیا ٹوٹا جیب میں ٹھونس

دیا۔ گیلری میں اسے سیٹھ واجد آتا ہوا دکھائی دیا۔ سیٹھ صاحب کا شہر کی لوہا مارکیٹ میں اچھا خاصہ گودام تھا اور کچھ ہفتے قبل سیٹھ صاحب کا چھوٹا لڑکا بلدیاتی ووٹوں میں ناظمی کا الیکشن جیت کر آیا تھا۔ یہ ادب سے کھڑا ہوا اور جھک کر سیٹھ صاحب کو سلام کیا۔ سیٹھ صاحب سے ایک قدم پیچھے چلتے منشی نے شوکی سے شب چوہدری کے بارے استفسار کیا تو شوکی نے بے دلی سے پروڈیوسر صاحب کے کمرے کی طرف اشارہ کر دیا۔ یہ دونوں وہیں سے الٹے قدموں لوٹ گئے۔

یہ پھر سے وہیں بیٹھ رہا۔ گیلری سے ابھی ابھی گزری نگینہ سے ہوتی سیٹھ واجد اور پروڈیوسر صاحب کا کمرہ، سوچیں پھر سے در آئیں۔ اب تھیٹر میں مداحوں کی بجائے گاہک آنے لگے ہیں، شوکی نے سوچا۔ فقرے بازی فحش ہو گئی اور رقص واہیاتی رہ گیا۔ نگینہ کو ہی دیکھ لو، بے حیا، کیسے مٹک مٹک کر چلتی ہے۔ جسم کی نمائش یوں کرتی ہے جیسے سر بازار ننگا گوشت بکنے کو ٹنگا ہو۔ پھر باہر اسٹیج کے ٹکٹ کاؤنٹر کا منشی الگ دلال بنا سودے کرواتا ہے۔ اللہ کی پناہ، اب تو آئے روز چھاپے پڑ رہے تھے۔ تھیٹر میں جہاں کبھی سچا تماشا ہوا کرتا تھا، خود تماشا بن کر رہ گیا ہے۔ خود اسے انھی واہیاتیوں میں ناحق دو ایک بار حوالات کا مزہ چکھنا پڑا تھا۔

ابھی اس نے سگرٹ دوبارہ سلگایا ہی تھا کہ پروڈیوسر صاحب شبانہ کی ماں کو ساتھ لئے آتے دکھائی دیئے۔ اس نے سگرٹ پھر رگڑ دیا۔ سارے ایکسٹرا اور عملہ آگے بڑھ کر پروڈیوسر صاحب کو سلام کرتے اور ان کے لئے ہٹ کر راستہ چھوڑ دیتے۔ شبانہ ان کے ساتھ نہیں تھی جس سے شوکی کو الجھن سی ہونے لگی۔ کچھ ہی دیر میں اس کا سین جاری ہونا تھا اور یہ نہ جانے کہاں رہ گئی ہے۔ یہ دونوں ڈریسنگ روم کی جانب نکل گئے اور اس کی جانب دونوں میں سے ایک نے بھی توجہ نہیں دی۔

شوکی کا سین شروع ہوا تو سٹیج پر داخلہ سکرپٹ کی عین ضرورت کے مطابق نہ ہو پایا۔ شبانہ خاصی دیر تک سیٹھ صاحب کے ساتھ باہر دفتر میں بیٹھی رہی تھی، اور جب ڈریسنگ روم کی جانب آئی تو بال الجھے اور میک اپ جیسے بہتا ہوا لگ رہا تھا۔ اس کو سلجھاتے دیر ہو گئی اور سٹیج پر جاری سین میں فقرے بازی کو خواہ مخواہ طول دینا پڑ گیا۔ سٹیج کے پیچھے اسی سبب کچھ بدمزگی پیدا ہو گئی۔ سب شوکی پر برس رہے تھے اور یہ سب پر بھنایا ہوا کچھ کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔ اسی کشمکش میں جب اسٹیج پر اُترا تو ڈائیلاگ ایسے الجھے اور پھیکے انداز میں ادا کئے کہ سکرپٹ کے کرداروں سے پہلے بھرے ہال نے اس کے کھڑے کھڑے لتے لے لئے۔ سین کا تو ویسے بھی ستیاناس ہو چکا تھا، اداکاروں نے بھی اس موقع کا خوب فائدہ اٹھایا اور اگلے دس منٹ تک فقرے بازی میں اس کی وہ خبر لی کہ پٹتی تالیوں اور قہقہوں، سیٹیوں میں کان بہرے ہو رہے تھے۔ چونکہ یہ سٹیج پر آئے روز کا معاملہ تھا تو یہ اس کھینچ تان کے جواباً بس سٹیج پر یہاں وہاں چکر لگاتا اور بھرم رکھنے کو ہر فقرے پر خباثت سے

ہنس رہتا مگر بٹتی داد کے جوش میں ڈرامے کے ہیرو نے شوکی کی ماں بارے ایک فقرہ کس دیا۔ بھلے یہ معمولی سی بات تھی مگر فقرہ گویا پتھر پر بھاری ہتھوڑے کی طرح گرا اور اچھا خاصا شوکی اداس، بچوں کی طرح پھوٹ کر یوں رو دیا جیسے پہاڑ کی پتھریلی چٹان پر آخری ضرب پڑنے سے پانی کا فوارہ ابل پڑتا ہے۔ مجمع کو تو جیسے لقوہ مار گیا ہو، مگر جلد ہی دھیان پس منظر سے موسیقی کی لے بلند ہونے پر بٹ گیا اور یہ قمیص کی آستین آنکھوں پر ملتا، چھوٹے بوجھل قدموں سٹیج سے یوں اترا جیسے کوئی ناکام چلتا ہو۔

سٹیج پر اب شہر کی مشہور رقاصہ شب چوہدری جلوے دکھا رہی ہے، اسے اپنے بھائی شوکی کے برعکس سو یرتک آنسو بہانے کی فرصت ملنے والی نہیں تھی۔

◂◂ ● ▸▸

House # B-3, Ghazikot Township,
Mansehra- 21300 (Khayer Pakhtun Kha) Pakistan.

(صفحہ ۱۱۲ کا بقیہ) جب اس لڑکی نے کھانے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو میں نے دروازے کی چٹخنی چڑھا دی اور میری نیت بدل گئی کیوں کہ وہ انتہا درجے کا ایک آسان موقع تھا- جو میری دسترس میں تھا- جب میں نے دروازے کی چٹخنی چڑھائی تو اس لڑکی نے پلٹ کر دیکھا اور اس نے کہا کہ میں بہت مایوس اور قریب المرگ اور اس دنیا سے گزر جانے والی ہوں- اس نے مزید کہا- ''اے میرے پیارے بھائی! تو مجھے خدا کے نام پر چھوڑ دے۔'' وہ نوجوان کہنے لگا۔ میرے سر پر برائی کا بھوت سوار تھا- میں نے اس سے کہا کہ ایسا موقع مجھے کبھی نہیں ملے گا میں تمھیں نہیں چھوڑ سکتا- اس لڑکی نے مجھے کہا کہ ''میں تمھیں خدا اور اس کے رسول کے نام پر درخواست کرتی ہوں کہ میرے پاس سوائے میری عزت کے کچھ نہیں ہے اور ایسا نہ ہو کہ میری عزت بھی پامال ہو جائے اور میرے پاس کچھ بھی نہ بچے اور پھر اس حالت میں اگر میں زندہ بھی رہوں تو مردوں ہی کی طرح جیوں۔'' اس نوجوان نے بتایا کہ لڑکی کی یہ بات سن کر مجھ پر خدا جانے کیا اثر ہوا، میں نے دروازے کی چٹخنی کھولی اور دست بستہ اس کے سامنے کھڑا ہو گیا اور کہا کہ ''مجھے معاف کر دینا میرے اوپر ایک ایسی کیفیت گزری تھی جس میں میں نبرد آزما نہیں ہو سکا تھا لیکن اب وہ کیفیت دور ہو گئی ہے۔ تم شوق سے کھانا کھاؤ اور اب سے تم میری بہن ہو-'' یہ سن کر اس لڑکی نے کہا کہ ''اے اللہ! میرے اس بھائی پر دوزخ کی آگ حرام کر دے-'' یہ کہہ کر وہ رونے لگی اور اونچی آواز میں روتے ہوئی کہنے لگی کہ ''اے اللہ! نہ صرف دوزخ کی آگ حرام کر دے بلکہ اس پر ہر طرح کی آگ حرام کر دے-'' نوجوان نے بتایا کہ لڑکی یہ دعا دے کر چلی گئی- ایک دن میرے پاس زنبور (جمور) نہیں تھا اور میں دھونکنی چلا کر نعل گرم کر رہا تھا میں نے زنبور پکڑنے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو وہ دہکتے ہوئے کوئلوں میں چلا گیا لیکن میرے ہاتھ پر آگ کا کوئی اثر نہ ہوا- میں حیران ہوا اور پھر مجھے اس لڑکی کی وہ دعا یاد آئی اور تب سے لے کر اب تک میں اس دہکتی ہوئی آگ کو آگ نہیں سمجھتا ہوں بلکہ اس میں سے جو چاہے بغیر کسی ڈر کے نکال لیتا ہوں۔''

(اشفاق احمد، زاویہ صفحہ ۲۰۷/۲۰۸)

● ڈاکٹر افشاں ملک

یاجوج ماجوج

امینہ بین نے کئی دن کے بعد زبان کھولی تھی۔ جب سے وہ یہاں آئی تھی پتھر کی مورت کی طرح ساکت رہی۔ جب بھی کوئی اس سے یہ پوچھتا کہ تم پر اور تمھارے خاندان پر کیا گذری تو وہ ڈبڈبائی آنکھوں سے ایک ایک کی طرف دیکھتی اور خاموش ہو جاتی۔ جیسے لفظ اس کے جذبۂ اظہار کا ساتھ نہ دے رہے ہوں۔ امینہ بین احمد آباد کے فساد میں اپنے سب عزیزوں کو گنوا کر کسی طرح زندہ بچ نکلی تھی۔ وہ کسی نہ کسی طرح بچتی بچاتی ہمارے یہاں آ ٹھہری تھی۔ ہمیں امینہ بین کے بارے میں اب تک جو کچھ معلوم ہو سکا تھا اس سے ہم صرف یہ جان پائے تھے کہ امینہ بین کسی گرلس انٹر کالج میں دینیات کی لیکچرر تھی۔ یہاں آ کر وہ گھر گرہستی کے کاموں میں اس لئے نوکرانیوں کی طرح لگی رہتی تا کہ ہم لوگ اسے ان چاہا بوجھ نہ محسوس کریں۔ گھر کے سبھی لوگ کبھی کبھی یہ جاننے کے لئے متجسس ہو جاتے کہ فسادات میں اس پر کیا گذری اور اس کے خاندان میں کون کون تھا جو فسادیوں کے ہاتھوں مارا گیا۔

نصف مارچ کا سورج آسمان کے بیچوں بیچ چمک رہا تھا۔ ہم سب برآمدے میں امینہ بین کو گھیرے ہوئے بیٹھے تھے تبھی اچانک ہم لوگوں کے درمیان گجرات کے المناک قتلِ عام کا ذکر چھڑ گیا۔ امینہ بین کچھ دیر خاموش بیٹھی سب کچھ سنتی رہی اور پھر میرے بارہ سال کے بیٹے جاوید کو بانہہ سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے اپنے پہلو میں لٹا کر بولی۔

''بیٹے تم جانتے ہو کہ حضرت نوحؑ کے بیٹے 'کنعان' نے اپنے باپ کے دین سے بغاوت کی اور منکر ہو گیا۔ اس نے وہ راستہ اختیار کیا جو مفسدوں اور ظالموں کا راستہ ہے۔ تب قدرت نے اس کی نسل سے ایک ایسی قوم پیدا کی جسے ایک لازوال بھوک میں مبتلا کر دیا گیا تھا۔ یہ بھوک انسانی خون کی تھی۔ یاجوج ماجوج کا یہ قبیلہ اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھتا تھا جب تک انسانی خون اور لحم و پوست سے اپنی بھوک مٹا نہیں لیتا تھا۔ تب اس معاشرے کا نظام چلانے والے خیر پسند اصحاب اقتدار نے ایک مضبوط اور بہت چوڑی دیوار تعمیر کروائی اور اس دیوار کے اندر یاجوج ماجوج کے خونخوار قبیلے کو ہمیشہ کے لئے قید کر دیا۔''

میرا بیٹا حیرت کے ساتھ امینہ بین سے یہ کہانی سنتا رہا۔ اس نے پوچھا۔

''کیوں خالہ جان یہ واقعہ کب کا ہے؟''

امینہ بین جس کی آنکھیں ابھی تک آنسوؤں سے بھری تھیں رقت آمیز لہجے میں بولی۔

''قریب پانچ ہزار سال پہلے کا.....تب دنیا تہذیب کے اپنے پہلے سفر پر روانہ ہوئی تھی۔لوگ آپس میں مل جل کر محبت کے ساتھ رہنا شروع کر رہے تھے، بستیاں بسائی جا چکی تھیں اور نسل آدم کھیتی کرنا سیکھ چکی تھی۔''

امینہ بین نے اس قدیم قصے کو آگے بڑھاتے ہوئے جاوید سے کہا۔

''یاجوج ماجوج کی اس لازوال بھوک میں مبتلا نسل کے لوگ فصیل کی نہایت چوڑی دیوار کو اپنی زبانوں سے اس وقت چاٹنا شروع کر دیتے جب سورج غروب ہو چکا ہوتا۔وہ رات بھر پتھر کی اس دیوار کو چاٹتے رہتے یہاں تک کہ صبح ہونے تک دیوار پتّے کی طرح پتلی ہو جاتی۔لیکن جیسے ہی صبح کی پہلی کرن زمین پر پڑتی تو دیوار پھیل کر اتنی ہی چوڑی ہو جاتی جتنی کہ وہ پہلے تھی۔یاجوج ماجوج گلا پھاڑ کر چلاتے کیوں کہ ان کی رات بھر کی ساری محنت اکارت چلی گئی ہوتی۔صبح ہونے تک جب یہ دیوار کاغذ کی طرح پتلی رہ جاتی تو یاجوج ماجوج خوش ہوتے کہ اگلے کچھ ہی لمحوں میں وہ اس سنگین حصار سے باہر ہوں گے اور انسانی خون اور گوشت سے اپنی بھوک مٹائیں گے۔لیکن ان کی یہ آرزو پوری نہ ہوتی اور سورج کی پہلی کرن پتھر کی اس دیوار کو جسے یاجوج ماجوج چاٹ کر پتے کی طرح پتلا کر دیتے تھے اتنی دبیز بنا دیتی جتنی کہ وہ تھی۔''

جاوید ہی نہیں ہم سب اس قدیم قصے کو امینہ بین کی زبان سے حیرت کے ساتھ سن رہے تھے۔ اچانک ہم نے دیکھا کہ امینہ بین کی آنکھیں جواب تک کسی گہرے صدمے کے باعث نم تھیں غصّے اور اضطراب کے ملے جلے جذبے سے سرخ ہو گئیں۔اس نے کہا۔

''یہ سلسلہ پچھلے پانچ ہزار سال سے چل رہا تھا۔یاجوج ماجوج ہر رات اس دیوار کو چاٹ چاٹ کر کاغذ کے ورق کی طرح پتلا بنا دیتے، اور صبح ہوتے ہی وہ اتنی ہی موٹی ہو جاتی۔اس طرح قومیں ان کے ظلم اور بربریت سے محفوظ رہتیں!''

''یاجوج ماجوج کی خونخوار قوم اکیلے ایک دیش میں نہیں تھی۔یہاں تک کہ اس دیش میں بھی تھی جہاں ہم اور تم ہیں۔لیکن ہر دیش کے حاکموں نے انھیں محصور کئے رکھنے کے لئے ایسی ہی دیواریں تعمیر کرادی تھیں۔ہر جگہ یاجوج ماجوج اپنے پورے قبیلے کے ساتھ رات بھر ان دیواروں کو چاٹنے کی کوشش کرتے تاکہ وہ دیواروں کو توڑ کر باہر نکل سکیں اور ان بے ضرر انسانوں کو کھا کر اپنی بھوک مٹا سکیں جنھیں محفوظ رکھنے کے لئے یاجوج ماجوج اور اس کی نسل کو حصار میں ڈال دیا گیا تھا۔''

ہم سبھی توقع کر رہے تھے کہ امینہ بین اپنے ساتھ گزرے ہوئے ان واقعات کا تذکرہ کرے گی جن سے

جان بچا کر وہ یہاں آئی ہے لیکن اس نے فسادات کے تعلق سے کوئی بات نہیں کہی، قصّے کو آگے بڑھاتی ہوئی بولی۔

''پھر یوں ہوا بیٹے جاوید کہ ایک بہت طویل رات شروع ہو گئی۔سورج کو وقت پر طلوع کرنے والی طاقتوں نے اس گہری، کالی اور طویل رات کے علم برداروں سے خفیہ سمجھوتا کر لیا۔ادھر سورج غروب ہوتے ہی یاجوج ماجوج اور اس کی پوری نسل کے خونخوار لوگوں نے پتھر کی اس دیوار کو اپنی زبانوں سے چاٹنا شروع کیا۔صبح ہونے تک دیوار ہر بار کی طرح گھس کر کاغذ کی طرح پتلی ہو گئی۔ٹھیک یہی وہ وقت تھا جب سورج کی پہلی کرن کو نمودار ہو کر دیوار کو پھر اتنا ہی دبیز بنا دینا تھا۔لیکن اس دن سورج نہیں نکلا۔رات کی تاریکی جوں کی توں چھائی رہی۔یاجوج ماجوج کی تیز لپلپاتی زبانوں نے اور تیزی سے حصار کو چاٹا۔اگلے ہی پل دیوار ختم ہو گئی۔خونخوار یاجوج ماجوج نسل کے قبیلے والیسٹیوں میں جا گھسے۔ان کے دانت لوہے کے تھے اور وہ ہاتھوں میں نوکیلے ہتھیار لئے ہوئے تھے۔ان کے رنگ کالے تھے اور آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں انھوں نے بستیوں میں پھیل کر انسانی خون سے اپنی پیاس بجھائی لاشوں کی ہڈّیوں کو چبایا، عورتوں سے اپنی بھوک مٹائی۔انھیں آگ میں بھونا' کھایا۔بچوں کو تین برچھی والے ہتھیاروں پر ٹانگا' وحشی قہقہے لگائے۔ میں نے دیکھا سڑکوں پر خون اس طرح بہہ رہا تھا جیسے برسات کے پانی کا ریلا بہتا ہے۔بستیاں جلا دی گئی تھیں۔وہ لوگ خاموش تماشائی بت بنے کھڑے تھے جو اس خونخوار نسل کو دوبارہ اس دیوار کے پیچھے بند کر سکتے تھے جو دیر سے سورج نکلنے کے بعد دوبارہ پھیل کر دبیز ہو گئی تھی۔اب یہ حصار خالی تھا۔اس میں بند وہ خونخوار نسل آزاد ہو گئی تھی جس نے میرے چھوٹے سے گھر میں گھس کر پہلے میرے گھر میں لوٹ پاٹ کی، پھر میرے بیٹے اور شوہر کے سامنے میری بیٹی کی آبروریزی کی.....!

''میں یہ نہیں جانتی کہ یاجوج ماجوج کی یہ نسل اب تک کہاں کہاں پھیل چکی ہے' کیونکہ اسے واپس اس فصیل کے اندر بند کرنے کی کوئی تدبیر نہیں کی گئی ہے جس سے لوگ اپنی جان و مال کو محفوظ سمجھ سکتے ہوں۔''

ابھی امینہ بین یاجوج ماجوج کا یہ قصّہ جو قدیم سے لیکر آج کے عہد تک پھیل گیا تھا ختم بھی نہیں کر پائی تھی کہ باہر سے ہیبتناک شور میں لپٹی ہوئی 'مخصوص' نعروں کی آوازیں آئیں اور امینہ بین بولتے بولتے اچانک بیہوش ہو گئی۔شاید اسے لگا جیسے یاجوج ماجوج کی نسل اس شہر میں بھی داخل ہو گئی ہے جہاں وہ جان بچا کر پناہ گزین ہو گئی تھی۔

◂◂ ● ▸▸

S/4, Aazim Estate 2,
New SAr Syed Nagar Medical Road
Aligarh- 202002 (U.P)

● سبین علی

کینچوا

احمد ساری رات نہ سو سکا تھا، بے چینی اور تلخی سے کبھی پہلو بدلتا تو کبھی کھجلی شروع کر دیتا۔ اسی دوران رہی سہی کسر ٹونی نے بھونک بھونک کر پوری کر دی. ایک لمحے کے لئے بھی میرے بچے کو سکون کی نیند میسر نہ آئی تھی۔ ایسے میں بھلا ماں کو قرار کیسے آتا۔ آخر ہوا کیا اور کیوں؟ انہیں سوچوں میں غلطاں و پیچاں رہی، کبھی عجیب واہمے ستاتے، کہیں کسی کی نظر نہ لگ گئی ہو میرے لعل کو؟ کوئی نئی الرجی نہ ہو.....؟

محض دو سال کا ہی تو تھا، گورے رنگ میں ویسے ہی سکن انفیکشن کی مدافعت کم ہوتی ہے۔ اگر احمد کو مچھر بھی کاٹ لیتا تو کئی دنوں اس کا نشان نہ جاتا تھا۔ اس لئے میں ہمیشہ بہت احتیاط کرتی تھی۔ گھر کے کونوں کھدروں کی صفائی سے لے کر مچھر بھگانے والے سیال بھی تواتر سے لگائے رکھتی تھی۔

صبح ہوئی تو دیکھا کہ اس کی کہنیوں کے اندر ہلکے سفید اور سرخی مائل دانے بنے ہوئے تھے۔ میں ڈر گئی کہ کہیں خسرہ تو نہیں نکل رہا مگر پھر سوچا کہ ساتھ بخار تو ہے نہیں اس لئے یہ خسرہ نہیں ہو سکتا۔ جب سے پاکستان گئی تھی احمد سارا دن ٹونی کے ساتھ کھیلتا رہتا۔ کئی بار روکنے کی کوشش کی مگر بے سود، اور ہمارا پالتو کتا ٹونی بھی گویا مہینوں سے احمد کا ہی منتظر تھا۔ جب بھی احمد اس کے کینل کے قریب جاتا وہ دم ہلا ہلا کر خوشی کا اظہار کرتا۔ اگر کھلا ہوتا یا رسی لمبی ہوتی تو اس کے پاؤں چاٹنے سے بھی باز نہ آتا۔ تب مجھے سخت کوفت ہوتی اور فوراً نہلانے کے بعد اس کے کپڑے تبدیل کرتی۔ دل میں ایک اور خدشے نے سر اُبھارا..... کہیں ٹونی کی وجہ سے کوئی انفیکشن نہ ہو گیا ہو۔

جب صبح گھر والوں سے احمد کی نئی الرجی کا ذکر کیا تو اس کی دادی کہنے لگیں اتنے واہمے مت پالا کرو۔ بچوں کے سر پر چھوٹی موٹی تکلیفیں آتی رہتی ہیں۔ یہ کوئی ایسی خاص بات نہیں۔ خشکی کی وجہ سے خارش ہوئی ہو گی۔ اور فکر مت کرو۔ ٹونی کی ساری ویکسین کروائی ہوئی ہے۔ مگر میرا دل کہہ رہا تھا کہیں نا کہیں کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔

ہمارے گھر کے ساتھ ایک کمرے، برآمدے، چھوٹے سے باورچی خانے اور غسل خانے پر مشتمل کوارٹر بنا ہوا تھا، جسے میری ساس نے ایک مجبور عورت کو بغیر کرائے کے رہنے پر دیا ہوا تھا۔ بدلے میں وہ گھر کے کاموں میں ہاتھ بٹا دیتی تھی۔ وہ کوارٹر ہمارے گھر کے پچھلے صحن سے جڑا تھا اور بیچ میں کوئی دیوار نہ تھی۔ سارا دن ہمارے بچے ادھر سے ادھر دندناتے پھرتے۔ اس عورت فوزیہ کے تین بچے تھے جن

میں سے ایک بیٹا حارث معذور تھا۔ اس دن عرصے بعد جب کسی کام سے کوارٹر کا رخ کیا تو حارث کو دیکھ کر ٹھٹھک گئی. سانولے رنگ اور موٹی آنکھوں والا بچہ بہت خوبصورت تھا۔ اس کی کالی سیاہ سرمگیں آنکھیں تھیں جن کی سپیدی بہت نمایاں تھی۔ ان پر لمبی گھنی پلکیں سایہ فگن محسوس تھیں۔ سر پر چمکدار گھنے بال اور تیکھے نقوش تھے۔ وہ زمین پر رینگنے کی ناکام کوشش میں مصروف تھا۔ اس کا لباس اور پھر سارا وجود مٹی ہو رہا تھا۔ مگر مٹی اسے سمیٹنے میں ناکام نظر آ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں گفتگو کر رہیں تھیں اور ہونٹوں کے کناروں میں نرم تبسم رقصاں تھا، گویا مٹی کو دوستی کا پیغام دے کر کچھ پانا چاہتا ہو۔ مجھے ایسا محسوس ہوا گویا کسی نے میرا دل مٹھی میں لے کر بھینچ دیا ہو۔ میں نے فوزیہ سے پوچھا اسے کیا ہوا تھا؟

''باجی آپ کو نہیں پتا؟ اس کو پولیو ہوا تھا جی۔'' فوزیہ نے جواب دیا۔

''پولیو.....!''.. میں نے تاسف سے کہا۔

''کیوں اس کی ویکسین نہیں کرائی تھی؟ اور جب پولیو کا بخار ہوا تب ہسپتال میں داخل کرواتی۔ اگر اچھی دیکھ بھال ہو جاتی تو نقصان اتنا شدید نہ ہوتا۔''

''نائیں باجی! حفاظتی ٹیکے تو لگوائے تھے جی اس کو۔ اور جب کبھی قطرے پلانے والی آتی ہیں تو جی ہم ہر بار اس کو قطرے بھی پلواتے ہیں۔'' فوزیہ نے معصومیت سے جواب دیا۔

''مگر اب قطرے پلانے کا کیا فائدہ؟ قطرے پہلے پلانے تھے نا۔'' میں نے کہا۔

''باجی! بس جو ہونا تھا ہو گیا۔ اب تو بس سارا دن اس بیچارے کی دیکھ بھال میں گزر جاتا ہے، کیا کروں دوسرے بچوں کو دیکھنے کا بھی وقت نہیں ملتا۔ ابھی اسی مہینے کچھ دن اوپر ہوئے تھے کہ دوائی کھالی۔ یہ بیچارہ تو محتاج ہو گیا۔ اب اور کیا کرنے ہیں، اسے کون سنبھالے گا؟''

''اوہو! مجھے بے حد افسوس ہوا۔ اسی لئے اتنی کمزور لگ رہی ہو'' میں نے فوزیہ سے کہا۔ اسی دوران میرا بیٹا احمد کھیلتا ہوا اندر آ گیا۔ حارث کی آنکھوں میں جگنو چمکنے لگے۔ وہ بے زبان کینچوے کی مانند اپنے سوکھے ہوئے اعضاء زمین پر گھسٹنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں ایک پیغام اُبھرا..... اس کی احساسات کی ترسیل صرف آنکھیں ہی کر پا رہی تھیں۔ کینچوے کی خوراک، اوڑھنا بچھونا، پلنا، بڑھنا اور سمونا سب مٹی میں ہوتا ہے..... مگر مٹی ہمیشہ کینچوے کی پناہ نہیں دیتی۔ اگر مٹی میں نمک کی آمیزش کر دی جائے تو کینچوا کہاں پناہ پائے گا؟ کینچوے کی حرکت آگے بڑھنے کی بجائے محض مٹی میں لوٹنے اور پلٹیاں مارنے تک رہ جاتی ہے۔ اسے دیکھ کر مجھے نہ چاہتے ہوئے بھی ایسا ہی محسوس ہو رہا تھا۔ احمد اسے اپنی توتلی آوازیں دینے لگا۔

''حالث! حالث!! اِدل آؤ۔''

اور یہ سن کر کینچوے کی آنکھوں کی چمک کئی گنا بڑھ گئی۔ مٹی پر گھسٹتے ہوئے دو قدم جتنا بھی بڑھ نہ پایا تھا کہ فوزیہ نے اٹھا کر باہر صحن میں چارپائی پر لٹا دیا۔ میں نے تاسف سے اس کا ہاتھ پکڑا۔ سوکھے سڑے بازو زخم خوردہ تھے۔ جا بجا دانے دھبے اور پیپ کے نشان کچھ اور ہی کہانی بیان کر رہے تھے۔

شام کو احمد کے چیک آپ کے لئے ڈاکٹر کے پاس گئی تو میرا شک یقین میں بدل گیا۔ احمد کو سکیبیز کا انفیکشن ہوا تھا۔ ڈاکٹر نے دوا لکھ دی۔ احتیاطی تدابیر بتائیں۔ پھر حیرت سے پوچھا کہ آپ سکیبیز تک کیسے جا پہنچیں؟ میں نے جواب میں صرف مسکرانے پر اکتفا کیا۔ رات کو میں فوزیہ کے پاس گئی اور پوچھا کہ حارث کو خارش کب سے ہے؟ باقی بچوں کو بھی ہوئی ہوگی؟

فوزیہ نے جواب دیا۔

''باجی! ایک سال ہو گیا۔ باقی سب کو تو دوا سے آرام آ گیا تھا مگر اس کا پتا نہیں تھا۔ میں سمجھی بستر پر پڑے رہنے سے زخم بن رہے ہیں۔ یہ بیچارہ تو کھجلا بھی نہیں سکتا، باجی! ہم نے بڑی دوائیں لگائی ہیں اس کو پر آرام نہیں آتا۔''

میں نے اسے دوائیاں اور لوشن دیتے ہوئے کہا۔

'' دیکھو فوزیہ! تم سمجھدار ہو۔ اگر صفائی رکھو گی تو اس کا انفیکشن ٹھیک ہو گا۔ مگر صرف صفائی ہی نہیں، دوا کے ساتھ تین دن تک صبح شام اس کے کپڑے اور چادریں تبدیل کرو اور پھر انہیں ابلتے ہوئے پانی میں دھونا۔ ایک ہفتے میں سب زخم ٹھیک ہو جائیں گے۔''

دس پندرہ دن بعد کی بات ہے، صبح سویرے اخبار گیٹ کے نیچے سے نکال کر میں احمد کے پیچھے پیچھے فوزیہ کے کوارٹر تک جا پہنچی۔ احمد کو دیکھ کر حارث اسی طرح ہمکنے لگا۔ احمد ادھر ادھر پھدک رہا تھا اور حارث کی نظریں اس کا طواف کر رہی تھیں۔ پھر احمد اپنی تین پہیوں والی سائکل چلانے لگا۔ حارث نے اُٹھنے کی ناکام کوشش کی گویا سائکل پر بیٹھنا چاہ رہا ہو۔ فوزیہ حسرت سے اسے تک رہی تھی۔ جب میری نظر حارث پر پڑی تو وہ انتہائی محویت اور محبت بھری نظروں سے مجھے دیکھنے لگا، گویا میرا شکریہ ادا کر رہا ہو۔ اس کے سارے زخم مندمل ہو چکے تھے۔ اس پل دو معصوم بچوں کے درمیان ان کہی آفاقی محبت ہر شے پر بھاری پڑ رہی تھی۔

فوزیہ گیلی آنکھوں کے کناروں کو پونچھتے ہوئے کہنے لگی۔

''باجی! میں کیسے آپ کا شکریہ ادا کروں؟ آپ نے مجھ غریب پر اور اس بچے پر ایسا احسان کیا ہے کہ عمر بھر چکا نہیں پاؤں گی۔'' یہ سن کر میں مارے خفت و ندامت کے نظریں چرانے لگی۔ حارث کی آنکھوں کی چمک نے مجھے ضمیر کے کٹہرے میں لا کھڑا کیا تھا۔ میں نے اپنا شرمسار چہرہ اخبار میں چھپا لیا۔ آج کے اخبار

میں یہ خبر جلی حرفوں میں شایع ہوئی تھی کہ طالبان نے پولیو پلانے والے عملے کو گولیوں سے بھون ڈالا تھا۔
مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ مجھ سمیت سارا شہر ایک چمکیلی آنکھوں والے کینچوے کے سامنے نظر اٹھانے کے قابل نہیں رہا۔

◂◂ ● ▸▸

Al-Safa, Dist- Jeddah
Saudi Arabia (U.A.E)
Cell no : 00966564274322

آج سے پانچ برس پہلے کہنے کو ایک شاعر میرے ساتھ فیملی پلاننگ میں سروس کرتا تھا۔ میں بہت بانماز ہوتی تھی۔ گھر سے آفس تک کا راستہ بڑی مشکل سے یاد کیا تھا۔ لکھنے پڑھنے سے بالکل شوق نہیں تھا۔ اتنا ضرور پتہ تھا، شاعر لوگ بڑے ہوتے ہیں۔ ایک شام شاعر صاحب نے کہا مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔ پھر ایک روز ریستوراں میں ملاقات ہوئی۔ اُس نے کہا، شادی کرو گی؟ دوسری ملاقات میں شادی طے ہو گئی۔ اب قاضی کے لئے پیسے نہیں تھے۔ میں نے کہا۔ آدھی فیس تم قرض لے لو اور آدھی فیس میں قرض لیتی ہوں۔ چونکہ گھر والے شریک نہیں ہوں گے میری طرف کے گواہ بھی لیتے آنا۔ ایک دوست سے میں نے اُدھار کپڑے مانگے اور مقررہ جگہ پر پہنچی اور نکاح ہو گیا۔ قاضی صاحب نے فیس کے علاوہ مٹھائی کا ڈبہ بھی منگوا لیا تو ہمارے پاس چھ روپے بچے۔ باقی جھونپڑی پہنچتے پہنچتے دو روپے بچے۔ میں لالٹین کی روشنی میں گھونگھٹ کاڑھے بیٹھی تھی۔ شاعر نے کہا، دو روپے ہوں گے؟ باہر میرے دوست بغیر کرائے کے بیٹھے ہیں۔ میں نے دو روپے دے دیئے۔ پھر کہا! ہمارے ہاں بیوی نوکری نہیں کرتی۔ نوکری سے بھی ہاتھ دھوئے۔ گھر میں روز تعلیم یافتہ شاعر اور نقاد آتے اور ایلیٹ کی طرح بولتے۔ کم از کم میرے خمیر میں علم کی وحشت تو تھی ہی لیکن اس کے باوجود کبھی کبھی بھوک برداشت نہ ہوتی۔ روز گھر میں فلسفے پکتے اور ہم منطق کھاتے۔ ایک روز جھونپڑی سے بھی نکال دیئے گئے، یہ بھی پرائی تھی۔ ایک آدھا مکان کرائے پر لے لیا۔ میں چٹائی پر لیٹی دیواریں گِنا کرتی اور اپنے جہل کا اکثر شکار رہتی۔ مجھے ساتواں مہینہ ہوا۔ درد شدید تھا اور بان کا درد بھی شدید تھا۔ علم کے غرور میں وہ آنکھ جھپکے بغیر چلا گیا۔ جب اور درد شدید ہوا تو مالک مکان میری چیخیں سنتی ہوئی آئی اور مجھے ہسپتال چھوڑ آئی۔ میرے ہاتھ میں درد اور پانچ کڑکڑاتے ہوئے نوٹ تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد لڑکا پیدا ہوا۔ سردی شدید تھی اور ایک تولیہ بھی بچے کو لپیٹنے کے لئے نہیں تھا۔ ڈاکٹر نے میرے برابر اسٹریچر پر بچے کو لٹا دیا۔ پانچ منٹ کے لئے بچے نے آنکھیں کھولیں۔ اور کفن کمانے چل گیا..... جب سے میرے جسم میں آنکھیں بھری ہوئی ہیں۔ میں نے سسٹر سے کہا میں گھر جانا چاہتی ہوں..... میرے گھر میں کسی کو علم نہیں کہ میں کہاں ہوں۔ اس نے بے باکی سے مجھے دیکھا اور کہا، تمہارے جسم میں ویسے بھی زہر پھیلنے کا ڈر ہے۔ تم بستر پر رہو۔ لیکن اب آرام تو کہیں بھی نہیں تھا۔ میرے پاس مُردہ بچہ اور پانچ روپے تھے۔ میں نے اس سے کہا، میرے لئے اب مشکل ہے ہسپتال میں رہنا۔ میرے پاس فیس کے پیسے نہیں ہیں میں لے کر آتی ہوں، بھاگوں گی نہیں۔ تمہارے پاس میرا مُردہ بچہ امانت ہے، اور سیڑھیوں سے اُتر گئی۔ مجھے ۱۰۵ ڈگری بخار تھا۔ بس پر سوار ہوئی، گھر پہنچی۔ میرے پستانوں سے دودھ بہہ رہا تھا۔ میں نے دودھ گلاس میں بھر کر رکھ دیا۔ اتنے میں شاعر اور باقی منشی حضرات تشریف لائے۔ میں نے شاعر سے کہا، لڑکا پیدا ہوا تھا، مر گیا ہے۔ (بقیہ صفحہ ۱۴۳ پر)

● سیمیں کرن

طاہرہ.....سنو.....!

''سنو، میری بات سنو، لمس تو بس اِک احساس کا نام ہے۔ احساس کرو تو ہے ورنہ کچھ بھی نہیں۔ لمس اپنی ذات میں خود اِک زبان ہے۔ اِک بھاشا ہے۔ یہ بھاشا سمجھ میں آنے لگے، دل کے تاروں کو چھُو لے تو یہ ہے ورنہ کچھ بھی نہیں۔ اِس زبان کے اپنے قاعدے ہیں، اپنے اصول وضوابط، کوئی گورا، کالا، مرد، عورت، مشرقی، مغربی اِس سے انکار نہیں کرسکتا۔ اِس بولی کو جان لو، سمجھ لو، زندگی آسان ہوجائے گی۔ لمس تو صرف اِک احساس کا نام ہے۔ احساس زندہ، احساس موجود تو 'ہے' کے زمرے میں ورنہ کچھ بھی نہیں۔ کرخت سے کرخت لمس بھی احساس نہ ہو تو کچھ بھی تو نہیں۔ تم میری بات سمجھ رہی ہو؟ دیکھو میری بات کی گہرائی کو سمجھو، میں تمھیں کیا بتانا چاہ رہی ہوں؟''

رِدا علی نے اُس روتی بلکتی لڑکی کو دیکھا مگر وہ کہاں کچھ سمجھنے والی تھی، بس روئے چلی جارہی تھی۔ اس کے بلکنے میں ایک ہی فریاد تھی۔ خود پہ ہونے والے ظلم کی فریاد، المیہ بیان کرتی تھی اور اپنے مجروح اور کھلے ہوئے احساس پر ماتم کناں تھی۔ وہ اپنی روح پہ لگے زخموں کو ٹٹول رہی تھی۔ اپنا کتھارسس، اپنی کتھا، اپنا مجروح احساس یا پھر خود کو احساس سے ماورا کرنے کی داستان تھی!

''دیکھو! لمس ایک برقی ننگے تار کی مانند ہے۔ بہتا کرنٹ.....اس کا سوئچ اپنے ہاتھ میں رکھو۔ اس سوئچ کو آن آف کرنے کا ہنر ہر عورت کو آنا چاہیے ورنہ زندگی ہر لمحہ مجروح ہوگی، بے حرمت ہوگی.....تم سن رہی ہو نا، سمجھ رہی ہو، میں کیا کہہ رہی ہوں تم سے؟''

مگر طاہرہ کب سنتی تھی، کب کچھ سمجھتی تھی، وہ تو بس زار زار روتی تھی۔ ایک فریاد وآہ وفغاں تھی اُس کے لبوں پہ، اس کی آنکھوں میں۔ رِدا علی کچھ دیر کو خاموش ہوگئی اور بس آہستہ آہستہ اس کے ہاتھوں کو اپنے ملائم ہاتھوں میں لے کر تھپتھپانے لگی۔ اُس کے بالوں میں دھیرے دھیرے انگلیاں پھیرنے لگی۔ طاہرہ کے آنسو تھمنے لگے۔

رِدا دھیرے سے بولی۔

''دیکھا محسوس کیا لمس کی زبان کو، کتنی پرتاثیر ہوتی ہے یہ.....!''

طاہرہ جو کچھ پرسکون ہوگئی تھی، اِک دم تڑپ کر بولی۔

''ہاں محسوس ہوتی ہے، محسوس ہوئی لمس کے جبر کو سہا تازیانے کی طرح، زخم زخم ہوں میں اسی لئے تو روتی ہوں۔ اگر نہ سمجھتی، جانتی، نہ محسوس کرتی تو کیوں آتی آپ کے پاس.....؟''

رِدا علی کچھ دیر کو لاجواب سی ہوگئی۔ کچھ دیر خود کو مجتمع کرتی رہی۔ ہمت جٹاتی رہی بولنے کو۔ پھر گویا ہوئی۔

''ہاں! میں سمجھتی ہوں اور یہی تو تمہیں سمجھانا چاہ رہی ہوں کہ عورت کو یہ زبان اِس طرح جاننا چاہیے کہ اِس کا کنٹرول سوئچ اپنے ہاتھوں میں رکھے..... بالکل ویسے جیسے کوئی آواز نہ سننے کو جی چاہے تو کانوں میں روئی ٹھونس لی جاتی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ تمہیں اپنے زخم کھول کر دِکھانے پڑیں گے تبھی سمجھو گی۔ یوں بھلا کیسے جانو گی؟''

یہ کہہ کر رِدا نے یوں سر جھکا لیا جیسے سینے کے داغ خود کو گویا ہوں۔

''پہلی بار یہ سوئچ میرے ہاتھ تب لگا جب..... جب بہت چھوٹی تھی میں۔ میرا بڑا بھائی ایک وحشی جانور تھا۔ ہاں وہ مجھ پر جانوروں کی طرح ہی تشدد کرتا تھا۔ جانے مجھے جانور سمجھتا تھا۔ میں روز اُس سے مار کھاتی تھی اور روز جسم سے زیادہ روح زخمی ہوتی تھی۔ زار زار گھنٹوں روتی رہتی۔ ایک وقت آیا کہ وہ مجھے مارنے کو بڑھتا اور میں خوف سے پہلے رونا شروع کردیتی۔ حالانکہ چوٹ کی بدن کو عادت ہوگئی تھی مگر روح کو عادت نہیں ہو پا رہی تھی۔ ایک دن میں اپنی اس حالت پہ رو پڑی۔ اُس سے اگلے روز جب وہ مجھے مارنے کو بڑھا تو میں نے خود کو حالات وواقعات سے بے نیاز کرلیا جیسے یوگی خود کو کرلیتے ہیں۔ کسی خیال کسی سوچ کسی مراقبے میں چلے جاتے ہیں۔ یہ عجب مشق تھی۔ عجیب یوگا تھا۔ ایک مشقِ ستم تھا، اور ایک ستمگر۔ وہ کچھ دیر مجھے مارتا رہا مگر جب مار کو بے اثر دیکھا تو جیسے ہار سا گیا۔ کچھ دن کے بعد اُس نے مجھے مارنا چھوڑ دیا۔ تب پہلی بار یہ سوئچ میرے ہاتھ لگا۔ ایک جبر کو، لمسِ کرخت کو میں نے پہلی بار اِس سوئچ کی مدد سے شکست دی۔''

طاہرہ تڑپ کر بولی۔

''نہیں نہیں غلط مماثلت ہے۔ میرے بدن کے زخم میری روح کے زخموں سے گہرے نہیں ہیں۔ میری روح مجروح ہے، جو ظلم جو جبر میرے ساتھ ہوا وہ تو بدترین ہے۔ اس سے زیادہ کسی کی ہتک اور کیا ہوگی!''

بس اِس سے آگے اُس سے کچھ بولا نہ گیا۔ گلے میں آنسوؤں کا پھندہ لگ گیا۔ وہ پھر سے رونے لگی۔ روتی چلی گئی۔ کسی طرح اُس کی تشفی نہ ہوتی تھی اور بس وہ جب سے آئی تھی روئے ہی چلے جارہی تھی۔ اک ہی فریاد کئے جاتی تھی۔

''کیا کروں میں! بڑا ظلم ہوا میرے ساتھ۔ انصاف ملنے کے بعد بھی مجھے نہیں لگتا کہ میرے ساتھ انصاف ہوگیا، میری روح داغدار ہوگئی ہے، میلی ہوگئی ہے، اس کثافت کو کیسے دھوؤں؟''

رِدا علی اُسے پھر تھپکنے لگی۔ اُس کے ہاتھوں اور بالوں میں انگلیاں پھیرتے اُس کے آنسوؤں کو

پوروں پہ چنتے وہ پھر بولی۔

''یہی نکتہ تو سمجھانے کی کوشش کر رہی ہوں، تم کیوں نہیں سمجھ رہی۔ تم نے اِس سوئچ کو کیوں نہیں کھوجا؟ اس کو ہاتھ میں لے لیتی تو زندگی آسان ہو جاتی۔''

طاہرہ پھر بلکنے لگی۔

''رِدا بی بی! یہ سب کہنا آسان ہے۔ جو مجھ پر بیتی وہ میں ہی جانتی ہوں۔ کس جہنم میں جلی ہوں، اُس آگ میں سب سوئچ پگھل جاتے ہیں۔ آپ بھی نہیں جانتی نہیں سمجھ سکتیں۔''

رِدا اُس کی بات کی تلخی کو سمجھ بھی سکتی تھی اور اُس کی تشفی بھی کرنا چاہتی تھی۔ وہ خود بھی تو بہت سے دوزخ جھیل چکی تھی، آخر عورت تھی! وہ پھر بولی۔

''میں سمجھ سکتی ہوں، ایسے مت کہو، میں جانتی ہوں، میں سمجھ سکتی ہوں، ایک عورت، ایک حساس عورت کیسے ممکن ہے کہ لمس کے جبر کو نہ سمجھ سکے۔ ساری زندگی اِن دوزخوں ہی میں تو گزار دیتی ہے وہ!''

رِدا طاہرہ کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے کر بولی۔

''میری بات سنو، جان لو، میں نے اِس سوئچ کو اِک بار کھوج کر بار بار تب آن آف کیا جب مجھے اِس کی ضرورت پڑی۔ تبھی زندگی کو آسان کر پائی ہوں خود پہ!''

اور طاہرہ جیسے اِستفسار کرتی تھی کہ کب، کیسے؟ رِدا پھر جیسے خود کو مجتمع کرنے لگی۔

''بہت دفعہ، تب تب جب..... ایک بار ایک دوکان پر اپنی ماں کے ساتھ بیٹھی تھی..... اک نوعمر لڑکی تھی، نوخیز سی..... دوکان دار نے تھان کھول کر ہمارے زانوؤں پر کپڑا پھیلا دیا۔ کچھ دیر بعد مجھے محسوس ہوا کہ اُس نے تھان پھیلاتے اپنے ہاتھ میرے زانو پہ رکھ دیا۔ مجھے یوں لگا کہ پورے بدن میں ایک کرنٹ پھیل گیا ہو۔ ناگواری اور کراہیت سمٹ کر میرے چہرے کو لہو رنگ کر گئی۔ میں نے ہمت مجتمع کر کے اُس کے چہرے کی جانب دیکھا۔ وہاں بے حیائی اور معنی خیز غلیظ اشارے پھیلے تھے۔ میں نے ماں کی طرف اور دکان میں اِدھر اُدھر لوگوں کے رش کو دیکھا اور جانے کیسے انجانے میں میرا ہاتھ اسی سوئچ پہ جا پڑا۔ میں نے اپنے بدن کو سخت اور بے جان و بے حس کر لیا۔ اتنا سخت کہ اُس کی لذت کا بحر خشک ہو گیا اور کھسیانا سا ہو کر اُس نے اپنا ہاتھ ہٹا لیا۔ سناتم نے طاہرہ!''

طاہرہ پھر رو دی۔

''آپ یہ کہہ سکتی ہیں رِدا بی بی! کیونکہ آپ نے اُس جبر کو شکست دے دی۔ میں نہیں دے پائی۔ میرا بدن بھی تار تار ہوا اور وہ گھن میری روح کا داغ بن گئی۔ اب کیا کروں میں، گھن رچی ہے مجھ میں؟ کیسے خود کو پاک کروں، آپ کے پاس انصاف کے لئے آئی تھی۔ سوچا تھا، آپ سے مل کر میرے زخم مندمل ہو جائیں گے، مرہم مل

جائے گا، تشفی ہو جائے گی۔ مگر ہوا کیا؟ آپ کے پاس جو کچھ آپ کے بارے میں آپ کی نیک خصلت کے بارے میں سن کر آئی تھی وہ سب پورا ہوا۔ آپ کی مدد سے ظالموں کو سزا ہو گئی۔ مجھے انصاف بھی مل گیا..... مگر پھر میرے دل کی آگ کیوں سرد نہیں ہوتی؟ مجھے کیوں لگتا ہے کہ مجھ پہ لگی غلاظت اب کبھی نہیں دُھل سکتی؟؟ یہ غلاظت روح کا حصہ بن گئی ہے۔ اس کی تشفی، اس کی صفائی کیسے ہو گی؟ یہ سمجھ نہیں آتا، اس روح کے داغ کو کیسے دھوؤں؟''

رِدا پھر تحمل سے بولی۔

''یہی تو کتنی دیر سے سمجھا رہی ہوں کہ لمس کا جبر بدن کو تار تار تو کر سکتا ہے مگر روح کو نہیں۔ بس اس سوئچ کو اپنے ہاتھ میں لے لو۔ یہ ایک بڑا حادثہ تھا مگر اِس مردانہ غلیظ معاشرے میں جانے کہاں کہاں تمھیں ہر طرح کے جبر کا سامنا کرنا پڑے گا..... کوئی گندے غلیظ رینگتے ہاتھ..... کسی کی کہنی..... کوئی غلیظ نظریں..... کسی کی مکروہ انگلیاں.....'' وہ بولتے بولتے بھی جیسے ہانپ گئی.....

''تو، تو تم لمس کے کس کس جبر کو روح کا داغ بناؤ گی۔''

طاہرہ نے کرب کی شدت سے ایسے آنکھیں بند کر لیں جیسے ذبح کرنے کو کسی نے چھری گلے پہ رکھ دی ہو۔

''نہیں رِدا بی بی! آپ نہیں سمجھ سکتیں۔ آپ جو مثالیں دے رہی ہیں نہ ان میں کوئی مماثلت نہیں۔ بہت فرق ہے، بہت فرق۔ بالکل ویسے ہی جیسے اک چھالے اور پوری طرح جل کر کوئلہ ہو جانے والے میں ہو۔ ویسا فرق جیسا اک چھوٹا سا زخم آ جانے اور کسی کو ذبح کر دینے میں ہو۔ ویسا فرق جیسا ایک گندگی کے چھینٹے اور کسی کے غلاظت بھرے گٹر میں گر جانے میں ہے۔ ویسا فرق جیسا حلال و حرام میں ہو۔ ویسا فرق جیسا نمکین و نمک کی کان میں نمک ہو جانے میں ہو۔ رِدا بی بی! میں آپ کو اور.....''

یہ کہہ کر طاہرہ سے مزید بولا نہ گیا اور وہ پھر روتی چلی گئی۔ عجب لڑکی تھی..... بس روئے چلے جا رہی تھی۔

اب کے رِدا دُکھ، صدمے، رنجیدگی بھری خفگی سے بولی۔

''اور تم بھی نہیں سمجھ سکتی، جو زندگی میں نے گزاری تم بھی اُس کا تصور نہیں کر سکتی، تم تو ایک بار لمس کے اس جبر کے ہاتھوں مجروح ہوئی ہو اور میں تو ہر روز..... تمام عمر..... تم کیا جانو.....!''

یہ کہہ کر رِدا کی آنکھوں سے دو آنسو ایسے ٹپکے جیسے پورا سمندر اِن دو اَشکوں میں درد سمیت سمٹ آیا ہو۔ طاہرہ اپنا رونا بھول کر حیرت سے اُسے دیکھنے لگی۔

''کیا مطلب آپ کا رِدا بی بی! آپ یہ کیا کہہ رہی ہیں؟''

''ہاں سچ کہہ رہی ہوں میں۔'' رِدا شکست خوردہ لہجے میں بولی۔

''بالکل سچ کہہ رہی ہوں میں، تم کیا جانو، میں نے زندگی کس دوزخ میں گزار دی۔ میں سوختہ

جاں تھی تو تم جیسے لوگوں کا درد سمجھ سکی، سمجھ کر کچھ کر سکی، کوئلے سے ہیرا بننا بھی بہت دشوار گزار عمل ہے۔ مگر پہلے کوئلہ ہونا بھی آسان نہیں، تم سے بہتر کون جان سکتا ہے!''

طاہرہ کے سارے آنسو حیرت سے منجمد ہو گئے۔

''تو کیا آپ بھی! کیا آپ کے ساتھ بھی! کیا کچھ ایسا.....''

لفظ جیسے ٹوٹ ٹوٹ جاتے تھے اُس کے لبوں پہ.....

''نہیں، وہ تو نہیں جو تم سمجھ رہی ہو۔ مگر کیا بدن تار تار صرف اک صورت میں ہوتا ہے۔ کیا لمس کے جبر کی صرف اک وہی صورت ہے جو تم نے سہہ لی اپنی جان پہ؟ نہیں طاہرہ! یہ جبر تو احساس کا نام ہے، یہی تو سمجھنا چاہ رہی ہوں میں تمھیں.....!''

ایک خاموشی آن ٹھہری تھی بیچ میں.....

''دیکھو میں نے تمام عمر اُس شخص کے ساتھ گزار دی جس کے ساتھ ایک دن بھی میرا روح کا رِشتہ نہیں بنا، اور اُس کے بستر میں سو کر بھی میری روح کنواری اور پیاسی ہی رہی۔ اس کے وجود میں ضم ہو کر اُس کے وجود کو اپنے جسم کا حصہ بنا کر نئی زندگیوں کو جنم دے کر بھی مجھے ہر روز لگا کہ میں نے اپنے آپ کو کھو دیا، میرے دل میں کبھی آمادگی نے جنم نہیں لیا..... لمسِ لطیف میرے لئے لمس کا جبر و جہنم بن گیا۔ زندگی خستہ و سوختہ ہوتی رہی۔ ایسے میں ایک دن اچانک پھر میرا ہاتھ اِسی سوئچ پہ جا پڑا۔ میں نے اسے آف کر دیا۔''

رِدا یہ کہہ کر ہانپنے لگی۔

''اور پھر زندگی مجھ پہ آسان ہو گئی۔ اب صرف میرا جسم ہوتا ہے، روح الگ کھڑی نظارہ دیکھتی ہے اور بدن ساری شکنیں جھاڑ کر پھر کھڑا ہو جاتا ہے..... بلکہ طاہرہ! ایک بات کہوں، بعض اوقات تو یوں لگتا ہے کہ سوئچ اتنی سختی سے بند ہو جاتا ہے کہ میری کنواری روح بدن کو بھی ساتھ لے جاتی ہے اور اُس کے نیچے صرف خاک کا ڈھیر پڑا ہوتا ہے۔''

◂◂ ● ▸▸

44c-Gulberg ,Faisalabad
Pakistan
03016063900

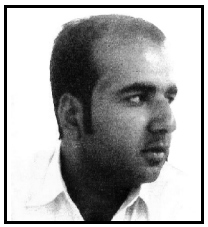

● علی مرزا

ذائقہ

جس قدر وہ غریب گھرانے میں پیدا ہوا تھا اتنا زیادہ ہی وہ حساس واقع ہوا تھا۔ چھوٹی سے چھوٹی چیز جس شکل میں بھی سامنے آتی اس کا وجود خود بخود اس کا اثر لینا شروع کر دیتا تھا کہیں آتے جاتے اٹھتے بیٹھتے درد سے کراہتے ہوئے کسی شخص کو اگر دیکھ لیتا تو وہی درد اسے اپنے اندر پوری شدت سے محسوس ہونے لگ جاتا تھا آج اسے شہر کے سرکاری ہسپتال میں ایڈمٹ اپنے آبائی گاؤں سے آئے ہوئے ایک شخص کی عیادت کرنے کے لئے جانا تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ خالی ہاتھ کیسے جا پائے گا۔ ہسپتال سے اسے ویسے بھی ہمیشہ اک عجیب سا خوف آتا تھا۔ وہاں پر مریضوں کی چیخ و پکار اور ادویات کی بو اس کے اعصاب کو شل کر دیتی تھی۔ دن کے دوسرے حصے میں تحصیل ہیڈ کوارٹر کا سائن بورڈ اس کے سامنے تھا۔ دل کڑا کر کے اور اپنا سر جھکا کر اس نے ہسپتال کے اندر قدم رکھ دیا۔ وارڈ بوائز سے پوچھتا پوچھتا وہ آخر اپنے مطلوبہ مریض کے بیڈ تک پہنچ گیا۔ مریض کی دیکھ بھال کے لئے مریض کی مفلوک الحال بیوی بھی وہاں موجود تھی جو اسے دیکھ کر خوشی سے کھل اٹھی۔ بیڈ کے ساتھ پڑے ہوئے لکڑی کے بنچ پر وہ بڑی آہستہ سے اور خاموشی کے ساتھ بیٹھ گیا۔ مریض کی ہسٹری شیٹ دیکھتے ہوئے اسے کچھ سمجھ تو نہ آئی مگر اتنا ضرور جان پایا کہ کوئی ایسی بیماری لاحق ہے کہ جسم پر ایک رسولی کا آپریشن ختم ہوتا ہے تو کچھ ہی دنوں بعد ایک اور نمودار ہونا شروع ہو جاتی ہے اور پچھلے دو سال سے یہی کیفیت ہے۔ مریض کی بیگم اس کے استفسار پر اپنے اوپر اور اپنے شوہر کے اوپر بیتے ہوئے ایک ایک پل کی نم آنکھوں کے ساتھ داستان سنانے لگی۔ آہ..... غربت اور مجبوریوں کے ستائے ہوئے لوگ جائیں بھی تو آخر کہاں جائیں..... وہ مریض کی عیادت کے لئے آ تو گیا تھا مگر سرہانے بیٹھے ہوئے اسے لگ رہا تھا کہ وہ بالکل تہی دامن ہے۔ اس کے پاس کہنے کے لئے حوصلہ دینے کے لئے کچھ بھی نہیں ہے۔ کچھ پل بیٹھے بیٹھے اور گزر گئے اسے اپنا وہاں بیٹھنا دشوار لگنے لگ گیا۔ اسے لگا اگر کچھ پل اور یہاں وہ رکا تو اس کی سانس رکنی شروع ہو جائے گی۔ سرکاری ہسپتال کے گھٹن زدہ ماحول میں..... ایک روپے کی پرچی پر ہونے والے علاج اور غریب مریض کی عیادت شاید اس کے لئے ممکن نہیں تھی۔ بس اب مجھے یہاں سے چلے جانا چاہیے۔ دل ہی دل میں اس نے اُٹھنے کا فیصلہ کیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ مریض کے اوپر

سفید چادر تھی۔ چہرہ تھوڑا سا ننگا تھا مگر وہ بھی سیاہی مائل ہو رہا تھا۔ اس نے دیکھا مریض جو اس کے آنے سے پہلے سو رہا تھا اب اپنی آنکھیں کھول کر اسے پہچاننے کی کوشش میں ہے.....اس کی سمت دیکھ رہا ہے..... اس کی آنکھوں میں حسرت و یاس کے جانے کتنے دیئے جلنے بجھنے لگ گئے۔ وہ آہستہ سے مریض کے چہرے کے پاس ہوا اور اسے لگا اس کے ہونٹ خود بخود وا ہو گئے ہیں۔

''آپ جلد ٹھیک ہو جائیں گے۔ آپ فکر مت کیجیے۔'' ساتھ ہی اس کا ہاتھ بھی خود بخود مریض کے سر پر جھک گیا، جیسے حوصلہ دینا چاہتا ہو، تشفی دینا چاہتا ہو اور آہستہ آہستہ سے بال سہلانے لگ گیا۔

''مجھے کہیں ضروری کام سے جانا ہے۔ دیر ہو رہی ہے.....آپ کی مجھے خبر ملی تھی ادھر سے گزر رہا تھا سوچا آپ سے ملتا چلوں .....مگر آپ خود کو تنہا مت سمجھئے گا۔ اب میں آپ کے پاس آتا جاتا رہوں گا۔'' آہستہ سے اس نے مریض کے کان میں پھر سرگوشی کی۔

''کیا اب مجھے جانے کی اجازت ہے؟'' اسے لگا اس کے مصنوعی اور کھوکھلے الفاظ نے بھی اپنا اثر کیا ہے۔ مریض کی آنکھوں میں چمک اور ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی اور اس نے آہستہ سے اپنا سر ہلا دیا جیسے کہہ رہا ہو.....ہاں! آپ کو جانے کی اجازت ہے اور آپ کے آنے کا بہت بہت شکریہ!

''اللہ آپ کو صحت و سلامتی دے۔'' اس کے دل سے خود بخود دعا نکلی اور مریض کی پیشانی پر بوسہ لینے کے ہونٹ نجانے کیسے جھک گئے۔

''آآآآخ تھو.....'' اسے اپنا تھوک روکنا محال ہو گیا۔ پورے حلق میں ناک میں بدبو ہی بدبو سی بھر گئی۔ دل جیسے اچھل کر حلق میں کہیں آ کر اٹک گیا۔ واش روم کی اسے خبر نہیں تھی کہ کس جانب ہے۔ بس منہ پر اپنے دونوں ہاتھ رکھے ہوئے کسی نہ کسی طرح اپنے آپ کو سنبھالے ہوئے ہسپتال سے نکلنے والے راستوں پر تقریباً وہ دوڑ پڑا تھا۔ ہسپتال کے اندر ہی ایک چھوٹے سے گراسی پلاٹ کو دیکھ کر اس کی ہمت جواب دے گئی ''آآآآخ تھو.....آآآخ تھو.....'' قے پر قے اسے آئے چلی جا رہی تھی۔ آنکھوں سے آنسو اور کپکپاتے ہونٹوں سے مریض کی پیشانی کا کریہہ ترین زائقہ اس کے پورے وجود میں اترتا چلا جا رہا تھا۔

◀◀ ● ▶▶

Mirza Shabbir Komani Maker
Near Genral Bus Stand Faisalabad Road
Samundri-37300(Pakistan)
00923336699579

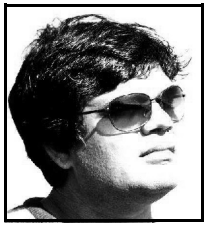

- **انشائیہ**
- **محمد نعیم دیپالپور**

شاعرِ لشکر

قبلہ میرے بہت اچھے دوست ہیں.....آپ کو پیار سے میں شاعرِ لشکر کہتا ہوں۔

وجہ؟

قبلہ Gregarious جانداروں کی طرح رہتے بھی شاعروں کے لشکر میں ہیں اور ان کا مزاج اور انداز بھی لشکری شاعروں ایسا ہی ہے، یعنی اپنے لشکر کی تعریفوں کے پل باندھتے رہنا خواہ وہ مائل بہ شکست ہی ہو اور مخالف لشکر کی ہجو کرتے رہنا خواہ وہ کشتوں کے پشتے ہی کیوں نہ لگا رہا ہو۔

ان کے لشکر میں شامل ہونے کی بنیادی اہلیت عورت ہونا ہے، لیکن اگر بدقسمتی سے فطرت آپ کو عورت بنانے میں ناکام رہی ہے تو بھی آپ کو پریشان ہونے کی چنداں ضرورت نہیں۔ آپ کے لئے بھی ان کے لشکر میں شامل ہونے کی گنجائش موجود ہے۔ ان کے لشکر میں شامل ہونے کے لیے آپ کا اچھا شاعر ہونا قطعاً ضروری نہیں، بس ان کی ہاں میں ہاں ملاتے جائیے، یہ خود ہی اپنے 'زورِ بازو' سے آپ کو اعلیٰ ترین شاعر منوالیں گے۔

اجی ٹھہریئے! رکیئے بھئی! سنئے تو! کہاں بھاگ لئے؟ آپ تو عظیم شاعر بننے کے جنون میں بغیر سوچے سمجھے، میری بات سنتے ہی اِن کے لشکر میں شامل ہونے بلکہ کودنے کا سوچنے لگے۔ پہلے میری پُوری بات تو سُن لیجئے۔ ذہن میں رکھئے کہ ان کے لشکر میں ہونا کوئی خالہ جی کے گھر میں ہونے جیسا معاملہ بھی نہیں ہے۔

لشکر کے Spirit کو برقرار رکھنے کے لئے قبلہ نے اس میں موجود رہنے کا معیار امریکہ کی طرح بڑا سخت رکھا ہوا ہے۔ یعنی "You are either with us or against us"۔ اس معیار کو جان لینے کے بعد بھی آپ کے ذہن پر راتوں رات عظیم شاعر بننے کا خناس چھایا ہوا ہے تو مجھے آپ سے بڑی ہمدردی ہے کیونکہ قبلہ کے لشکر میں آ چکنے کے بعد کبھی آپ بھولے سے بھی اِن کے مخالف لشکر کی تعریف کرنے کی حماقت کر بیٹھے تو آپ کے لیے قبلہ کے قہر سے بچنے کی دعا ہی کی جا سکتی ہے۔ لیکن میں جانتا ہوں

کہ یہ معجزہ ہوگا نہیں۔اب آپ پر طعن و تشنیع کے ایسے ایسے کوڑے برسیں گے کہ زمیں بھی آپ کو پناہ دینے سے مکرّر انکار کر دے گی۔فیس بک پہ آن لائن ہوتے ہی آپ پر وہ وہ تبرے برسیں گے کہ آپ کی حالت نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن والی ہو کے رہ جائے گی۔آپ بڑی خجالت محسوس کرتے، گڑگڑاتے، گھگھیاتے، دوڑے دوڑے واپس آئیں گے اور قبلہ کے پاؤں پڑ جائیں گے، لیکن تب تک آپ کو بہت دیر ہو چکی ہو گی۔قبلہ آپ کو اپنے لشکر میں واپس قبول نہیں کریں گے، کیونکہ 'گُر بہ کُشتن روزِ اوّل' آپ کا فلسفہ ہے۔آخر محاورے ہوتے کس لئے ہیں؟

اب تک آپ کی حالت بڑی قابل رحم ہو چکی ہوتی ہے کہ مخالف کیمپ بھی آپ کو تھالی کا بینگن سمجھتے ہوئے قبول نہیں کر رہا ہوتا۔آپ تو محض اپنے خوش ذوق اور ادب دوست ہونے کا مظاہرہ کر رہے تھے اور یہ کیا ہو گیا؟ نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم، نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے.....دیکھا قبلہ کا انتقام!

قبلہ کو عاجزی بہت پسند ہے.....لیکن صرف دوسروں میں۔آپ ان سے جتنی زیادہ عاجزی سے ملیں گے آپ کے شاعرانہ درجات بلند ہونے کے امکانات اُتنے ہی زیادہ روشن ہوں گے۔

آپ بھی سوچ رہے ہوں گے کہ یہ کب سے اُول جلول بک رہا ہے، لیکن اُس ذات والا صفات کا نام ابھی تک نہیں بتایا۔قبلہ کے متعلق اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ آپ 'اسم با مسمّیٰ' کی اپنے تئیں مکمل تعریف اور تفسیر ہیں اور ہمہ وقت شاعری کے اعلیٰ وارفع مقام پہ فائز رہتے ہیں۔اللہ کی صناعی میں سرِ مُو تبدیلی کو کفر گردانتے ہیں، لہٰذا اللہ نے فطرتاً جیسا پیدا کیا تھا اُس پہ راضی بہ رضا ہیں اور آج کے دن تک اُس میں ذرا بھر تبدیلی لانے کی کوشش نہیں کی۔ایک ملک 'ادبستان' ان کی مستقل آماجگاہ ہے۔آپ ادبستان، اس کے گردونواح اور فیس بک پہ بکثرت پائے جاتے ہیں۔

قبلہ بچپن ہی سے میرے اور کچھ اور دوستوں کے دوست ہیں۔بچپن کا حوالہ میں اس لئے نہیں دے رہا کہ ہم کوئی بچپن میں ایک ہی لنگوٹ پہن کے گھوما کرتے تھے، بلکہ بچپن کی دوستی کا حوالہ اس لئے دے رہا ہوں کہ یہ ہمارے دوست تو بیشک ہیں لیکن ان کے سامنے ہم سب پاؤں پاؤں چلتے بچے ہی ہیں۔ہم ان سے کوئی بھی بات کر لیں اور اُس بات کی سپورٹ میں چاہے جتنی بڑی معروضی، علمی یا عقلی دلیل پیش کر لیں یہ اُس کو بچوں جیسی بات کہہ کے ہمیں چُپ کرا دیتے ہیں۔ان کے اس بزرگانہ رویے نے ہم سب دوستوں پہ بڑے منفی اثرات ڈالے ہیں۔قبلہ کے اس رویے کا اثر مجھ پہ یوں ہوا ہے کہ میرا سارا اعتماد جاتا رہا ہے اور میں بات کرتے ہوئے اکثر ہکلا جاتا ہوں۔اور ایک دوست بیچارہ تو باقاعدہ تُتلانے پہ اتر آیا ہے۔اور تو اور وہ بیچارہ بے دھیانی میں انگوٹھا تک چوسنے لگتا ہے۔

دنیا میں گنجے دو قسم کے ہوتے ہیں۔ایک وہ کہ جب آ رہا ہو تو دور ہی پتہ چل جاتا ہے کہ گنجا آ رہا ہے اور دوسری قسم کا وہ کہ جب تک گزر نہ پائے پتہ ہی نہیں چلتا کہ گنجا ہے۔قبلہ پہلی قسم کے گنجے ہیں اور پہلی قسم کا گنجا ہونے پہ فطرت سے شاکی بھی رہتے ہیں کیونکہ اس 'گنج بے مایہ' کو آتے دیکھ کر بچے دور ہی سے شور مچانے لگتے ہیں.....گنجا آیا گنجا آیا!

ایک دن مجھ سے ملے تو بڑے اُکھڑے اُکھڑے سے بولے۔ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''حضور خیریت تو ہے؟'' بولے۔

''خاک خیریت ہے۔بیگم سے لڑائی ہو گئی ہے۔کہتی ہیں ہفتے بھر کا صابن لاتی ہوں اور تم تین چار روز میں ہی ختم کر دیتے ہو! تم ہی بتلاؤ اس میں بھلا ہمارا کیا قصور ہے؟ صبح منہ دھوتے ہوئے پتہ ہی نہیں چلتا کہ صابن کہاں تک لگائیں۔''

قبلہ ہر وقت ایک اضطراری کیفیت میں اپنے ناخنوں کو اپنے گنج سے گھستے رہتے ہیں۔'خدا گنجے کو ناخن نہ دے' والا محاورہ ان کے گنجے ہونے کے بعد ہی ایجاد ہوا تھا۔

قبلہ حجام کے پاس جاتے ہیں تو جانے کس دھن میں کہتے ہیں۔

''یار! آج بال ذرا سٹائلش کاٹنا، ایک مشاعرہ ہے۔(انتہائی چھچھورے انداز میں آنکھ مارتے ہوئے) اُس میں خواتین بھی ہوں گی۔ہم ایک تازہ غزل پڑھیں گے! حجام بھی ان کا دل رکھنے کو دائیں کنپٹی سے کچھ بال اُٹھا کر چندیا پر پھیلا دیتا ہے اور سوچنے لگتا ہے کہ یہ اگر اپنی غزل کے ساتھ 'تازہ' کا دم چھلا نہ بھی لگائیں تو میں تو کیا پورے محلے کو پتہ ہے کہ آپ ساری ساری رات بیٹھ کر غزلیں ہی بُنتے ہیں اور 'تازہ' ہی پڑھتے ہیں۔باسی غزلیں تو قبلہ صرف دوسروں کو سبق سکھانے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔

سنا ہے پورے خاندان میں قبلہ ہی ہیں جو پڑھے لکھے ہیں اور اس کی تصدیق کچھ قبلہ کی گفتار اور مزاج سے بھی ہوتی ہے۔ایک دفعہ ان کے ابا کے ایک دور کے دوست مری سے ملنے کے لئے آئے۔باتوں باتوں میں قبلہ کے بڑے بھائی کے متعلق پوچھنے لگے کہ کیا کام وام کرتے ہیں۔ان کے ابا فرمانے لگے۔

''بس یار کیا بتاؤں.....ابھی تک فارغ ہی ہے۔'' پھر قبلہ کا ذکر چھڑ گیا تو ان کے ابا فرمانے لگے۔

''چھوڑو یار! اس کی کیا پوچھتے ہو وہ بھی شاعر ہے!'' دوست بات سُن کے بڑے حیران ہوئے اور لگے پوچھنے کہ شاعر ہونا تو چلو سمجھ آنے والی بات ہے لیکن تم نے شاعر کے ساتھ 'بھی' کیوں استعمال کیا ہے؟ تو اِن کے ابّا بولے کہ 'بھی' اس لئے لگایا ہے کہ شاعر ہے تو اُسے بھی بیکار ہی سمجھو۔اِن کے ابّا کے دوست بولے کہ یار پڑھا لکھا ہے، کہیں نہ کہیں تو جڑ دیتے۔

سوئے اتفاق، اپنے ابا اور اُن کے دوست کے درمیان ہونے والی ساری گفتگو ساتھ والے کمرے میں بیٹھے قبلہ بھی سن رہے تھے۔ بس اُس دن کے بعد سے ان کو کچھ الفاظ مثلاً 'جڑا، کھڑا، پھر، پُھر، بھی، ہی، اور اس قبیل کے کئی اور الفاظ سے ایک خاص قسم کی چڑ ہوگئی ہے۔ اب تو یہ عالم ہے کہ کوئی بھی ان الفاظ کو اپنی کسی تحریر یا گفتگو میں استعمال کرے تو یہ فوراً بھڑک جاتے ہیں۔ قبلہ کو محسوس ہوتا ہے کہ ان کا مضحکہ اُڑانے کو یہ الفاظ جان بوجھ استعمال کئے جا رہے ہیں۔

قبلہ چوبیس گھنٹے ہی فارغ ہوتے ہی اور اس فراغت کو فیس بک پر نظر رکھنے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ ایک بڑا سا رجسٹر بنا رکھا ہے جس پر مختلف قسم کا ڈیٹا لیتے رہتے ہیں۔ امریکہ کے انسٹیٹیوٹ آف ریجنل سٹڈیز کی طرح فیس بک پر ہونے والی تمام تبدیلیوں کا جائزہ لیتے رہتے ہیں۔ مثلاً، کس خاتون کو کتنے پھول مل رہے ہیں؟ اور کون کون، کہاں کہاں سے، کب کب اور کس کس زبان میں کومنٹس بھیج رہا ہے، وغیرہ؟ آپ انھی سٹڈیز کی روشنی میں امریکہ ہی کی طرح مختلف قسم کی پالیسیاں وضع کرتے رہتے ہیں، اور پھر انھی پالیسیوں کی روشنی میں موقع، دوستی، دشمنی، صنف اور مختلف زبانوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے کومنٹس فرماتے رہتے ہیں۔ کس کو کس وقت کون سی اذیت، طعنہ یا دھمکی دینی ہے، یہ تمام تفصیلات قبلہ اپنی انہیں سٹڈیز کی روشنی میں وضع کرتے ہیں اور ان سٹڈیز پر عمل درآمد کے لیے ایک رجسٹر کاروائی الگ سے بنا رکھا ہے۔ القصّہ، اس کارِ مذموم کے لئے گھر پہ ہی ایک پورا محکمہ قائم کر رکھا ہے۔

قبلہ کو آج تک اچھی اور معقول بات کرتے نہیں دیکھا گیا، سوائے چند غزلوں کے۔ ستم ظریفی دیکھئے کہ بدنیتی پر مبنی ان کی انتہائی نامعقول کوششوں کے باوجود کچھ لوگوں کا پھر بھی فائدہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً، فیس بک پر آپ کو کوئی خاتون اچھی لگتیں ہیں، اور آپ اپنے اُسی جذبے سے مغلوب ہو کر اس خاتون کے کسی ادب پارے پر کوئی اچھا سا تبصرہ کرتے ہیں۔ اور وہ بیچاری کسی انتہائی نامعقول وجہ سے قبلہ کی معتوب ہونے کا شرف بھی رکھتی ہیں، تو قبلہ فوراً ہی آپ پر حملہ آور ہوں گے اور آپ کو اُن محترمہ کے عاشق ہونے کے اعزاز سے نوازیں گے۔ لیجئے صاحب، بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ آپ کے دل میں تو نہ جانے کن زمانوں سے کُھد بُد ہو رہی تھی کہ اُن محترمہ سے بات ہو تو کیونکر ہو، اور اُن تک اپنے دل کی بات کیونکر پہنچائی جائے؟ ایسے میں قبلہ کے یہ کومنٹس آپ کے لیے نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوتے ہیں۔ اب آپ کو اُن محترمہ کے ان باکس میں ذاتی پیغام بھیجنے کے تمام جملہ حقوق مل گئے ہیں۔ آپ اُن محترمہ کے پرسنل میسیج میں بظاہر تو قبلہ کے اُن مخرب اخلاق کومنٹس پر بُرا ہی منا رہے ہوں گے، لیکن اندر ہی اندر آپ خوش ہو رہے ہوں گے کہ چلو کسی بہانے ہی سہی ان محترمہ سے بات چیت شروع ہونے کی کچھ تو تقریب ہوئی کہ 'تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیے'۔

دیکھا جو کام آپ ہفتوں مہینوں سے نہیں کر پا رہے تھے قبلہ کے ایک کومنٹ نے چٹکیوں میں کر دکھایا۔ اِن کے اِس فیضان سے میں بھی سیراب ہو رہا ہوں، کُبڑے کو اِن کی لات خوب راس آئی ہے! بحمداللہ اب ناچیز کو بھی فیس بک پر تین چار بڑی نستعلیق قسم کی محبوبائیں میسر آ گئی ہیں۔ یہ بات الگ کہ سب ہی مجھ سے ہزار ہا میل کی دوری پر رہتی ہیں، لیکن صاحب اِن فاصلوں کی پرواکس کافر کو ہے بھلا!

قبلہ دشمن سازی میں بڑے خود کفیل ہیں۔ آپ دشمنی ٹالنے کی چاہے لاکھ کوشش کریں اور اِسی کوشش میں چاہے اِن کی جھوٹی اور بے تکی تعریف بھی کرتے چلے جائیں، بات کو اِدھر اُدھر گھمائیں، ہنس ہنس کے بات کریں لیکن 'بکرے کی ماں آخر کب تک خیر منائے گی' کے مصداق آپ سے کوئی نہ کوئی غلطی تو سرزد ہو گی ہی کہ انسان جو ٹھہرے۔ بس ہوگئی دشمنی شروع! آپ سے دشمنی ہو جانے کے بعد قبلہ بڑے خوش خوش پھریں گے۔ سیٹی پر محمد رفیع کے گیت 'میرے دشمن تو میری دوستی کو ترسے' کی بے سُری دُھن بجاتے پھریں گے۔ اپنے دوستوں کو اس نئی دشمنی کی بابت باریک سے باریک تفصیلات بڑے فخریہ انداز میں بتلائیں گے اور اُن سے نیا محاذ کھلنے کی مبارک باد وصول کرتے پھریں گے۔ الغرض، خوش ہونے کے جتنے بھونڈے طریقے جانتے ہیں اپنائیں گے۔ دوست بھی اِن کی اس نئی نویلی دشمنی پر اس لئے انتہائی خوشی کرتے محسوس کرتے ہیں کہ چلو سب کو شاعری کے علاوہ کچھ اور بھی کرنے کو ملا!

قبلہ بڑے فراخ دل واقع ہوئے ہیں اور ہر جاننے والے کو بلا تخصیص صنف، مذہب اور عمر زندگی میں کم از کم ایک دفعہ اپنے ساتھ دشمنی کا موقع ضرور عنائیت کرتے ہیں۔ اگر آپ کو ان سے دشمنی کی سعادت نصیب ہوگئی ہے تو اب آپ دشمنی کی بابت بالکل بے فکر ہو جائیے کہ دشمنی کے باقی لوازمات یہ خود ہی بہ اہتمام پورے کر لیں گے۔ اور اگر آپ ابھی تک قبلہ سے دشمنی کی سعادت سے محروم ہیں تو میری نیک تمنائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ مایوس مت ہوئیے، اللہ کے گھر میں دیر ہے اندھیر نہیں!

قبلہ نفرت کو بڑی محبت سے پالتے ہیں۔ دشمن کی تاک میں شست لگا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ نصیب کا مارا دشمن جونہی ان کی رینج میں آتا ہے، گردن سے جا دبوچتے ہیں اور خوب بھنبھوڑتے اور چچوڑتے ہیں۔ اس کی ایک تازہ مثال یہ ہے ایک صاحب جن سے حسب روایت قبلہ دشمنی کی پینگیں بڑھا چکے تھے اور ہر چہار جانب سے اُن پر حملہ آور ہو رہے تھے، خودکُشی کو خودکُشی لکھ بیٹھے، بس پھر کیا تھا پہلے تو اُن کو keyboard پر keys کی پوزیشن جتلائی تاکہ سند رہے۔ میں نے ممیاتے ہوئے عرض کیا۔

''قبلہ جانے دیں.....کل کا بچہ ہے، آپ کے سامنے بھلا کیا بیچتا ہے وہ بیچارہ! ایسی باتیں آپ کے شایان شان نہیں ہیں اور پھر ٹائپنگ کی ایسی غلطیاں تو ہر کوئی کرتا ہے، کبھی نہ کبھی آپ سے بھی سرزد ہو

جایا کرتیں ہیں بھلا.....!''

بات مکمل ہونے سے پہلے ہی جلال میں آ گئے۔

''لگتا ہے تو دشمن کے ساتھ مل گیا ہے۔ اگر ہم سے کوئی ایسی غلطی ہوتی ہے تو ہم تو ہم ہیں۔ آج تک کس کی جرات ہوئی کہ ہم پہ حرف دھرے! اور پھر تُو نے پنجابی کا وہ محاورہ نہیں سُنا۔ 'دشمن دا وِساہ نہ کریں بھانویں مٹی دا ہووے۔' محاورے کو بھی گولی مارو، ہمارا اپنا اصول بھی شروع ہی سے یہ ہے کہ ہم دشمن کے بابت کبھی رِسک نہیں لیتے! دشمن آخر دشمن ہے، کل کلاں کو اپنے کئے سے مکر جائے اور کہہ دے کہ ٹائپنگ کی غلطی تھی تو!.....سوچا ہے کبھی تم نے؟''

کسی زمانے میں بی جمالو کا کردار پڑھا تھا لیکن اس کردار کو قبلہ کی ذات میں مجسم دیکھ کر پہلی دفعہ سمجھ آئی کہ بی جمالو پن کیا ہوتا ہے اور کیسے ہوتا ہے۔ میں بچپن ہی سے ذہنی طور پر بہت پسماندہ رہا ہوں اور کئی باتیں صدہا کوششوں کے باوجود آج تک سمجھ نہ پایا۔ اِن سمجھ نہ آنے والی گتھیوں میں سے ایک بڑا مشہور محاورہ 'یہ حب علی نہیں، بغض معاویہ ہے' تو کبھی بھی پلّے نہیں پڑا اور اِس پر اساتذہ سے ہمیشہ ہی بحث کی اور جی بھر کر مار کھائی، لیکن قبلہ کی فیس بک پر کچھ لوگوں سے محبت کا اظہار دیکھ کر نہ صرف اس محاورے کی سمجھ آ گئی ہے بلکہ اور بھی بہت کچھ سمجھ آ چکا ہے۔ ان تمام دوراز فہم چیزوں کی تفہیم دینے پر میرا سر قبلہ کے آگے ہمیشہ خم رہے گا۔

قبلہ کے مختلف زبانوں پر عبور سے میں بہت مرعوب ہوں۔ خاص طور پر عربی کے تو عالم بے بدل ہیں۔ نہ جانے کب عربی بولنا پڑ جائے اس کے لئے احتیاطاً دائیں کھیسے میں ایک ٹوپی رکھتے ہیں۔ کہیں سے عربی کا ایک جملہ نہ کب سے میرے ذہن میں اٹکا ہوا تھا۔ ایک دن قبلہ کا موڈ اچھا دیکھا تو سوچا کیوں نہ آج وہی جملہ پُوچھ ڈالوں۔ ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''قبلہ!.....یہ 'ھل ترکیبَ دغ دغ' کا کیا مطلب ہے؟'' اتنا سننا تھا کہ ان کے چہرے پر ایک تشنجی سی کیفیت پیدا ہوئی۔ تیزی سے ٹوپی نکال سر پہ دھری۔ سازندوں کی سی پھرتی اور مہارت سے کنٹھ کو چٹکی میں لے کر نہ جانے تالُو کے کن گوشوں کی آوازوں سے حلق کی آواز ملا کے قلقلہ درست کیا (قبلہ عربی بولنے سے پہلے جب بھی قلقلہ tone up کریں تو جائئے آپ پر کوئی بہت بڑی آفت نازل ہونے والی ہے)۔ ٹیوننگ چیک کرنے کے بعد کچھ قلقلاتی ہوئی بے ہنگم آوازیں پیدا کیں اور پھر نہ جانے کیا کیا فرمانے لگے۔ مجھ پہ ایسا سہم طاری ہوا کہ کاٹو تو لہو نہیں۔ بس چُپکا بیٹھا رہا اور سوچتا رہا کہ یا اللہ مجھ سے قبلہ کی شان میں ایسی کیا گستاخی سرزد ہو گئی ہے کہ اِن کا جلال کم ہونے میں ہی نہیں آ رہا! اللہ اللہ کر کے غصہ

کچھ کم ہوا تو فرمانے لگے۔

''پاجی، لعنتی مارے، خبیث!!! یہ بات پوچھنے کو تجھے ہم ہی ملے تھے کیا! تمھارے گھر میں باپ یا کوئی بڑا بھائی نہیں ہے کیا؟'' میں خجالت کے مارے سر نہوڑائے بیٹھا رہا، لیکن یہ اندازہ ضرور ہو گیا کہ یقیناً یہ کوئی بہت ہی لذیذ بات ہے جو قبلہ بتانے سے احتراز فرما رہے ہیں۔

ہمارے ایک ڈکٹیٹر حکمران ایوب خان خود ساختہ یعنی self-appointed فیلڈ مارشل رہے ہیں۔ چونکہ مزاجاً قبلہ بھی ڈکٹیٹر واقع ہوئے ہیں لہذا انھوں نے بھی اپنے آپ کو نقاد کے عہدے پر خود ہی فائز کر لیا ہے اور تنقید کے ایک نئے سکول آف تھوٹ بُستی ہی بُستی (بے عزتی ہی بے عزتی) کی بنیاد ڈالی ہے۔ بڑی ادق قسم کی تنقید فرماتے ہیں۔ نقد و شرح کرتے ہوئے ایسی ایسی جدید اصطلاحات استعمال کرتے ہیں جو پہلے صرف طب اور طبیعات کی کتابوں میں ہی ملتی تھیں۔ مثلاً، نظم یا غزل کی نامیاتی، لحمیاتی، نشاستائی یا حیاتینی ترتیب وغیرہ، نظم یا غزل کا سفراوی، بلغمی، بادی، فشاری یا عضلاتی مزاج وغیرہ، نظم یا غزل کی آفاقی، افلاکی، ملکوتی سطح وغیرہ..... تجریدی، وریدی، عروقی یا نسائی لہجہ وغیرہ وغیرہ۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ قبلہ فاضل طب والجراحت گولڈ میڈلسٹ ہیں۔ طبیب حاذق ہیں اور ادبستان میں آ بسنے سے پہلے اپنے گاؤں میں مطب کیا کرتے تھے۔ تنقید میں جیسے طب کی اصطلاحات استعمال کرتے ہیں بعینہ مریض دیکھتے وقت شاعری کی اصطلاحات استعمال کرتے۔ مثلاً کوئی مریض آ کے کہتا کہ دمہ ہو رہا ہے تو فرماتے۔

''یوں کہئے نا کہ سانس نے قافیہ تنگ کر رکھا ہے۔''۔ مریض بیچارہ اِن کا منہ تکتا رہ جاتا۔ عربی اور فارسی سے قبلہ کی محبت جنون کو پہنچی ہوئی تھی کہ بیماریوں تک کے نام مفرس یا معرب کرنے کی کوشش کرتے۔ جیسے ایک دفعہ بخار اور نزلہ وزکام کا مارا ایک مریض قبلہ کی جناب میں حاضر ہوا۔ پہلے تو اُس کی نبض پہ ہاتھ رکھے رکھے گہرے مراقبے میں چلے گئے، کافی دیر انتظار کے بعد مریض کے جھنجھوڑنے پر مراقبے سے باہر آئے اور فرمایا۔

''میاں، آپ کو تو تپ خنزیر لگتا ہے۔'' مریض چونکا، گھبرایا، لاحول پڑھنے لگا اور انتہائی پریشان ہو کر کہنے لگا۔

''حضور قسم لے لیں جو میں نے کبھی خنزیر کی صورت بھی دیکھی ہو۔ یہ کونسا نیا مرض آن لگا ہے؟ تو مربیانہ سا قہقہ لگاتے آنکھوں کو ہلکا سا موندتے ہوئے فرمایا۔

''اماں! ہم سوائن فلو کی بات کر رہے ہیں۔''

تنقید کہ میرا ابھی پسندیدہ موضوع ہے۔ شومئی قسمت، اس خوش فہمی میں کہ تنقید کے کچھ نئے در وا

ہوں گے ایک دن قبلہ سے تنقید کی تعریف پوچھ بیٹھا۔ فوراً جلال میں آ گئے اور کسی جناتی سی زبان میں نہ جانے کیا فرمانے لگے۔ جب بھڑاس نکال چکے تو فرمانے لگے۔

''تو کافر ہو گیا ہے، کافر! یاد رکھ تعریف صرف اور صرف اللہ کی ہوتی ہے! اور ہم تمھارے ساتھ کچھ فری ہیں تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ تیرے دماغ میں جو بھی فتور آئے تُو اُس کا اظہار کرتا پھرے!''

قبلہ کی یہ واحد عادت ہے جو مجھے سخت ناپسند ہے۔ اِن کو جب بھی کسی بات کا پتہ نہ ہو تو بات کو فوراً مذہب کی طرف گھما دیتے ہیں تاکہ ڈر کے مارے کوئی دوبارہ پوچھنے کی جرات نہ کر سکے۔ جھڑکیاں کھا کے میں بھی چپ بیٹھ رہا۔

قبلہ بڑے سخت ناقد ہیں۔ (یہاں نقاد سے مراد وہی ہے جو قبلہ کے ذہن میں ہے) تنقید میں اِن کا ایک اپنا اصلوب (اسلوب) ہے اور اُسی اصلوب سے سب کو مصلوب کرتے رہتے ہیں۔ ان کی اجازت کے بغیر مجال ہے کہ آپ اپنے آپ پر کوئی کیفیت طاری کر سکیں۔ مثلاً، چاندنی رات میں آپ کے لئے پاگل ہونا منع ہے، ہاں ان کی طرح دن کے وقت پاگل رہنے میں اِن کو مطلق اعتراض نہیں ہے۔ آپ آزاد نظم نہیں کہہ سکتے کہ آزاد نظم کے وجود میں آنے کی وجہ اور تاریخ اِن کو معلوم نہیں۔ الغرض جو بات قبلہ کی سمجھ سے باہر ہو، اصول ہے کہ ادب میں اُس کا استعمال صریحاً حرام ہے۔

قبلہ پیار یوں فرماتے ہیں گویا غصہ فرما رہے ہوں۔ ان کے غصے اور پیار میں امتیاز کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ وجہ اُسکی یہ ہے کہ پیار آئے تو بھی گالیاں ہی ارشاد فرماتے ہیں۔ ایک دن جی کڑا کر کے میں نے پوچھ ہی لیا ہی کہ قبلہ آپ ہمہ وقت برہم کیوں رہتے ہیں اور کسی معمولی سے معمولی بات پہ بھی گالم گلوچ پہ کیوں اُتر آتے ہیں؟ آخر کچھ تو وجہ رہی ہوگی اس کی؟ اگر بتا دیں گے تو شاید اِس جاہل کُل کی فلاح کا کوئی پہلو نکل آئے۔ بات سن کے تھوڑی دیر خلاؤں میں گھورتے رہے، پھر میری طرف متوجہ ہوئے اور دائیں کاندھے کو تھپتھپاتے ہوئے بڑی متانت سے فرمایا۔

''مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی''۔ شاید 'تیغ' سے اُن کی مراد 'دلیل' تھی۔

قبلہ استعاروں اور کنایوں پر عبور رکھتے ہیں۔ جب بھی کسی کو گالیاں بخشنا مقصود ہو تو استعارے استعمال کریں گے، اور جب کسی کو کھلم کھلا گالیاں ارشاد فرما رہے ہوں تو جانئے کسی استعارے کی تشریح و توضیح فرما رہے ہیں۔

باتیں بہت گہری کرتے ہیں، اور کئی باتیں تو اتنی گہری ہوتی ہیں کہ کئی کئی دن کی کھدائی کے بعد جب آپ بات کی تہہ تک پہنچتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ اِس بات کا تو کوئی مطلب ہی نہیں ہے۔ قبلہ کی ارشاد کردہ ایک ایسی ہی گہری بات آپ کے گوش گزار کرتا ہوں۔ فیس بک پر موجود ایک دوست سے ایک دن

فرمانے لگے۔

''یار تم اتنی اچھی شاعری کرتے ہو کہ میں تمھارے حق میں شاعری چھوڑنے کا سوچ رہا ہوں''۔ قبلہ کا یہ اعلان سُن کر میں بہت خوش ہوا کہ چلو اب اِن کی بے دریغ شاعری سے جان چھٹ جائے گی! لیکن صاحب کہاں!!! جب کئی دنوں کے انتظار کے بعد میری امید دم توڑ گئی تو جی میں آئی کہ ہو نہ ہو یہ بھی میری کج عقلی کا ہی شاخسانہ ہے جو 'چھوڑنے' کو 'ترک' کرنے کے معنی میں لے رہا ہوں۔ اِس بات کا ذہن میں آنا تھا کہ میں ابّا کے زمانے کی ایک اردو لغات نکال کے بیٹھ گیا۔ اب جو چھوڑنا کے معنی دیکھے تو میرے اپنے پسینے چُھٹ گئے۔ پتہ چلا کہ قبلہ کا یہ 'چھوڑنا' محاوراتی چھوڑنا تھا۔ جیسے، ہاتھ چھوڑنا (ساتھ چھوڑنے والا نہیں)، کُتے چھوڑنا، سانس چھوڑنا، کُھلا چھوڑنا اور لمبی لمبی چھوڑنا وغیرہ۔ جبھی جس دن سے قبلہ نے شاعری چھوڑنے کا عندیہ دیا ہے اُس دن سے ہم بیچاروں پہ اپنی شاعری چھوڑ دی ہے اور بہت زیادہ غزلیں کہنے لگے ہیں! قبلہ کے ناچیز کو دئے گئے ایک اقبالی بیان کے مطابق ہر چوبیس گھنٹے میں اِن سے تین سے چار غزلیں سرزد ہو جاتی ہیں۔

جی کیا سمجھے! آپ اور میں سات جنموں تک بھی اتنی گہری بات کرنے کا تصور کر سکتے ہیں کیا!

میری پوری زندگی میں اِس طرح کے یہ دوسرے انسان ہیں۔ پہلے بھی یہی ہیں کہ اِن کو دوج گوارا نہیں ہے۔ فیس بک پر اِن کا طوطی بولتا ہے یا بولتی ہے۔ کسی کی موت آئی ہے جو اِن سے آنکھ ملا کے بات کر سکے۔ سب اِن کے آگے جاہل گنوار اور گدھے ہانکنے والے ہیں۔ البتہ دوستوں کے لئے بریشم ہیں اور اِن کے اکثر دوست ان کی اس کمزوری سے فائدہ اُٹھاتے ہیں اور اپنی شاعری اِن کے کاندھے پر رکھ کے چلاتے ہیں۔

قبلہ بڑے ہی حسن پرست واقع ہوئے ہیں۔ فیس بک پر کسی بھی خاتون کی تصویر، خواہ وہ بیس سال پرانی ہی ہو، دیکھیں گے تو فوراً فدا ہو جائیں گے۔ ہر حیلہ آزمانے کے بعد بھی اگر وہ خاتون چکنی مچھلی ثابت ہوئی تو پھر اُسے باجی کہنے سے بھی نہیں چوکیں گے۔ لیکن جب کوئی باجی اِن کی نیت بھانپتے ہوئے اِن کے لشکر سے بغاوت کر دے تو قبلہ اپنے تئیں اُس کا جینا حرام کر دیتے ہیں اور یہ بالکل بھول جاتے ہیں کہ اِن کے مدمقابل کون ہے اور ہم کس معاشرت سے تعلق رکھتے ہیں۔

◂◂ ● ▸▸

Gali N0: 4,Ziyauddin Colony,Deepalur,
Dist:Okara(Punjab)Pakistan-56180
Ph:0302-7087558

- علی گڑھ او علی گڑھ
- انجم قدوائی

میلا

''نمائش آ گئی!''علی گڑھ میں رہنے والوں کو کس قدر انتظار ہوتا ہے اس آواز کا۔اس آواز کا سحر میں کئی برسوں سے دیکھ رہی ہوں۔نمائش نہ ہوئی سچے خواب ہو گئے۔

ایک چھوٹا سا شہر.....گنتی کی بازار.....نام کے لئے مال بھی ہیں مگر جو لوگ ان نام نہاد مال میں گئے ہیں وہ اصلیت سے واقف ہیں۔یہاں اگر مسلم یونیورسٹی نہ ہوتی تو یہ شہر خالی ہاتھ ہوتا۔نمائش کے آجانے سے اس شہر کی رونقیں بڑھ جایا کرتی ہیں۔ہر ایک پر اُمید نظر آتا ہے.....خاص کر بچے۔ویسے تو خواہ خاتونِ خانہ ہوں یا گھر کے بزرگ حضرات سبھی کو نمائش سے دلچسپی ہوتی ہے۔کسی کو وہاں آنے والے میرٹھ کے جھنڈا ہوٹل نظیر ہوٹل کے کھانے کا انتظار ہوتا ہے تو کوئی حلوہ پراٹھا کھانے کے لئے بے چین۔کپڑوں اور کشمیری شالوں کا شوق رکھنے والی خواتین کئی کئی چکر لگاتی نظر آتی ہیں وہاں اور وہیں راجستھانی سوٹ کی دوکانوں پر بھی ویسی ہی بھیڑ نظر آتی ہے۔کوئی بدایوں کے پیڑے لینے کے لئے چکر لگا رہا ہے تو کسی کو وہاں کی نان خطائیاں کھینچ لاتی ہیں۔قالین پرانا ہو گیا ہو تو بدلنے کے لئے نمائش کا انتظار کرتی نظر آتی ہیں تو کوئی وہاں بیڈ شیٹ اور لکڑی کے سامان کے لئے چکر لگاتا نظر آتا ہے۔مراد آباد کی جگمگاتی ہوئی دکانیں تو بس دیکھنے کے لائق ہوتی ہیں۔آرٹی فیشل جولری کی دوکانیں دور سے چمکتی نظر آتی ہیں۔اور ان دکانوں پر لڑکیوں اور بچوں کا ہجوم دور سے نظر آتا ہے۔بچے ضد پر آتے ہیں تو کوئی تاویل نہیں سنتے۔آخر کار مجھے بھی تیار ہونا پڑا۔نمائش روانہ ہوئی تو پہلے اے۔ٹی۔ایم سے اچھی خاصی رقم بھی نکالنا پڑی۔اب پہلے والا زمانہ تو رہا نہیں کہ پچاس روپئے لے کر جاؤ اور دنیا بھر کا سامان خرید لاؤ۔کچھ یاد کر کے آپ ہی آپ مسکراہٹ آ گئی۔نمائش کی بھیڑ بھاڑ میں بھی یادوں نے پیچھا نہیں چھوڑا۔ذہن کہیں پیچھے چلا جا رہا تھا.....اور پیچھے.....اور پیچھے.....!

ایک چھوٹا سا گاؤں جہاں گومتی ندی بہتی ہے۔وہیں کنارے ایک پہاڑی ہے جس پر ستھّن کا میلا لگتا تھا۔ستھّن اس گاؤں کا نام ہے۔کیا بتائیں کیسی کیسی یادیں جڑی ہیں اس میلے سے۔جگمگاتی ہوئی

روشنیوں کی یادیں.....کھلکھلاتے ہوئے چہروں کی یادیں.....میٹھی میٹھی خوشبوؤں کی یادیں.....بھاگتے دوڑتے قدموں کی یادیں.....ستھّن کی اس پہاڑی پر ایک مزار ہے۔اسی مزار پر ہر برس عرس ہوتا ہے اور زبردست میلا لگتا ہے۔تمام دوکانیں بھی اونچی نیچی پہاڑیوں پر لگتی ہیں جن پر چڑھنے اترنے کا پنا ایک مزا ہے۔اور تب زندگی اتنی تھکی ہوئی نہیں تھی نا؟ کیسے مزے سے اُڑتے پھرتے تھے۔اپنے گھر میں سب سے زیادہ مجھے میلے کا انتظار رہتا تھا۔اور جب میلا لگ جاتا تو پھر جانے کی ضدیں شروع ہو جاتیں۔ابی سمجھاتے بھی۔

''ارے بٹیا! ٹھیک طرح سے لگ تو جائے.....پھر بھیج دینگے۔''مگر مجھے تو یہی ڈر رہتا کہ کہیں میرے بغیر گئے میلا چلا نہ جائے۔آخر وہ دن بھی آ جاتا جب بابا ہمیں میلا لے کر جاتے۔ہمیں خرچ کرنے کے لئے پانچ روپئے ملتے تھے۔صرف پانچ روپئے.....اور ان سے ہم ڈھیروں چیزیں خرید لیتے تھے۔کھانے پینے کی چیزیں لینا ہمیں سختی سے منع تھیں۔ابی کا کہنا تھا جو کھانا ہو ہمیں بتا دو ہم کسی معیاری دوکان سے منگوا دیں گے۔میلے کی دھول میں بکتی چیزیں صحت کے لئے سخت مضر تھیں۔ہم کھلونے لیتے..... رنگ برنگے کاغذ کے پھول.....چکریاں.....پلاسٹک کے ناشتے دان.....ننھے ننھے چائے کے برتن.....چھوٹی چھوٹی پلاسٹک کی پیالیاں جن پر پھول بنے ہوتے۔مختلف رنگوں کے کلپ.....ہم سب خرید لیتے مگر پیسے ختم نہیں ہوتے تھے۔بابا مٹھائی کی دوکان پر رک جاتے۔

''کھاؤ گی بٹیا؟''

''نہیں! ابی نے منع کیا ہے۔''میں دوسری طرف دیکھنے لگتی۔

''ارے انہیں کون بتائے گا؟ تم کھالو جو جی چاہے.....پیسے ہیں ہمارے پاس.....''وہ سخی ہوتے۔مگر دل نہ مانتا.....بس غصّہ اس بات پر آتا کہ یہ مٹھائیوں کی دوکانیں اتنی سجا کر کیوں رکھتے ہیں؟

مزار پر قوالیاں سننے کھڑی ہو جاتی۔

سہانی رات تھی اور پر سکوں زمانہ تھا — اثر میں ڈوبا ہوا جذبِ عاشقانہ تھا
ہوس تھی دید کی معراج کا بہانہ تھا — سرِ لامکاں سے طلب ہوئی
سوئے منتہا وہ چلے نبیؐ

اب تک یہ مصرعے بھول نہیں سکی ہوں۔

خیالوں کی دنیا سے باہر نکلی۔بچے سوفٹی کی دوکان پر تھے۔میرے ہاتھوں میں بھی ایک کین تھا۔کچھ دیر دیکھتی رہی۔پھر اسے سامنے کھڑے ایک لڑکے کو تھما دیا جو حسرت سے دکان دیکھ رہا تھا۔

''اوہ چورن تو رہ گیا۔''بچوں کو وہیں مصروف چھوڑ کر میں واپس فوارے والی لائین کی طرف

بھاگی جہاں چورن کی کئی دکانیں تھیں کیونکہ سال بھر یہ کہیں نہیں ملتا تھا۔ آلو بخارہ اور انار دانے کا چورن لے کر واپسی کے لئے چل پڑی اور پرس میں پیسے دیکھنے چاہے تو سارے پیسے ختم.....!

ایک کونے میں پانچ روپئے کا سکّہ جھانک رہا تھا۔ مطلب میں آرام سے ستّھن کے میلا جا سکتی ہوں؟ مجھے ہنسی آ گئی اور چال میں بچپن والی مستی اور بے فکری بھر گئی۔

◂◂ ● ▸▸

Flat No. 1 Zakariya Market,
Medical Road Aligarh - 202001 (U.P)
+91 9897202594

(صفحہ ۱۲۴ کا بقیہ) اس نے سرسری سنا اور نقادوں کو بتایا۔ کمرے میں دو منٹ خاموشی رہی اور تیسرے منٹ گفتگو شروع ہو گئی۔ 'فرائڈ کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ راں بو کیا کہتا ہے؟ سعدی نے کیا کہا ہے؟ اور وارث شاہ بہت بڑا آدمی تھا۔' یہ باتیں تو روز ہی سُنتی تھی لیکن آج لفظ کچھ زیادہ ہی سنائی دے رہے تھے۔ مجھے ایسا لگا جیسے یہ سارے بڑے لوگ تھوڑی دیر کے لئے میرے لہو میں رُکے ہوں، اور راں بو اور فرائڈ میرے رحم سے میرا بچہ نوچ رہے ہوں۔ اس روز علم میرے گھر پہلی بار آیا تھا اور میرے لہو میں قہقہے لگا رہا تھا۔ میرے بچے کا جنم دیکھو!!! چنانچہ ایک گھنٹے کی گفتگو رہی اور خاموشی آنکھ لٹکائے مجھے دیکھتی رہی۔ یہ لوگ علم کے نالے عبور کرتے کمرے سے جدا ہو گئے۔ میں سیڑھیوں سے ایک چیخ کی طرح اُتری۔ اب میرے ہاتھ میں تین روپئے تھے۔ میں ایک دوست کے ہاں پہنچی اور تین سو روپئے قرض مانگے۔ اس نے دے دیئے۔ پھر اس نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا تمھاری طبیعت خراب ہے؟'' میں نے کہا، بس مجھے ذرا بخار ہے، میں زیادہ دیر رک نہیں سکتی۔ پیسے کسی قرض خواہ کو دینے ہیں، وہ میرا انتظار کر رہا ہوگا۔ ہسپتال پہنچی۔ بل ۲۹۵/ روپئے بنا۔ اب میرے پاس پھر مردہ بچہ اور پانچ روپئے تھے۔ میں نے ڈاکٹر سے کہا۔ ''آپ لوگ چندہ اکٹھا کر کے بچے کو کفن دیں، اور اس کی قبر کہیں بھی بنا دیں۔ میں جا رہی ہوں۔'' بچے کی اصل قبر تو میرے دل میں بن چکی تھی۔ میں پھر دوہری چیخ کے ساتھ سیڑھیوں سے اُتری اور ننگے پیر سڑک پہ دوڑتی ہوئی بس میں سوار ہوئی۔ ڈاکٹر نے سمجھا شاید صدمے کی وجہ سے میں ذہنی توازن کھو بیٹھی ہوں۔ کنڈکٹر نے مجھ سے ٹکٹ نہیں مانگا اور لوگ بھی ایسے ہی دیکھ رہے تھے۔ میں بس سے اُتری، کنڈکٹر کے ہاتھ پر پانچ روپئے رکھتے ہوئے چل نکلی۔ گھر؟ گھر!! گھر پہنچی۔ گلاس میں دودھ رکھا ہوا تھا۔ کفن سے بھی زیادہ اُجلا۔ میں نے اپنے دودھ کی قسم کھائی۔ شعر میں لکھوں گی، شاعری میں کروں گی، میں شاعرہ کہلاؤں گی۔ اور دودھ باسی ہونے سے پہلے ہی میں نے ایک نظم لکھ لی تھی۔ لیکن تیسری بات جھوٹ ہے۔ میں شاعرہ نہیں ہوں۔ مجھے کوئی شاعرہ نہ کہے۔ شاید میں کبھی اپنے بچے کو کفن دے سکوں۔ آج چاروں طرف سے شاعرہ! شاعرہ! کی آوازیں آتی ہیں، لیکن ابھی تک کفن کے پیسے پورے نہیں ہوئے۔ (پہلا حرف، سارا شگفتہ کے شعری مجموعے 'آنکھیں' سے ماخوذ)

● علی گڑھ او علی گڑھ
● ڈاکٹر فریحہ سبین

ایک خط.....علی گڈھ سے

72,New Whidia
Abdullah Hall A.M.U
Aligarh
13.05.06

ممی، پاپا! السلام علیکم

میں یہاں خیریت سے ہوں۔ ہاسٹل میں بہت کم لڑکیاں بچی ہیں۔ امتحانات کے بعد زیادہ تر لڑکیاں اپنے گھر چلی گئی ہیں۔ ہم لوگ تو یہاں کو چنگ کرنے کے لئے رکے ہوئے ہیں۔ دن بھر لُو چلتی ہے لیکن میرا کمرہ ٹھنڈا ہے۔ یہاں ہم لوگ چار وقت نماز پڑھتے ہیں۔ فجر میں آنکھ نہیں کھل پاتی ہے۔ جمعہ کے روز سورہ کہف پڑھتے ہیں۔

میرے بال اب لمبے ہو گئے ہیں۔ آپ نے جو ائیر رنگ دی تھی، وہ یہاں سبھوں کو بہت پسند آیا۔ ہم لوگوں کے کامن روم کا افتتاح ہو گیا ہے، لیکن ابھی ٹی وی نہیں آئی ہے۔ افتتاح کے موقع پر میلاد ہوئی تھی۔ اس میں بہت اچھی اچھی باتیں بتائی گئیں۔

آج یہاں میڈیکل کے داخلے کے لئے ٹیسٹ تھا۔ اتنے سارے لوگ آئے تھے کہ لگ رہا تھا کہ عبداللہ ہال میں شادی ہے۔ ہما آپی اور شکیبہ آئی تھیں ملنے کے لئے۔ ہما آپی نے آپ کا بھیجا ہوا سامان دیا۔ تھینکس فار ایوری تھنگ۔ آج کل میں روز دہی جماتی ہوں .....آدھے پیکٹ دودھ کا جو یہاں ملتا ہے۔ روم نمبر ۶۹ میں ایک کلثوم آپا ہیں۔ انہوں نے ہی دہی کا جوڑن دیا تھا۔ چائے اور کُرکُرے بند۔ آج لبنیٰ آپا آئی تھیں۔ کہہ رہی تھیں، بال بہت اچھے لگ رہے ہیں اور کتنی گوری ہو گئی ہو۔

یہاں آم تو ملتا نہیں ہے۔ ہم لوگ مینگو شیک پیتے ہیں۔ آپ لوگ میرے لئے آم لے کر آیئے گا۔ جب ندا یہاں امتحان دینے آئے گی تو میرے ساتھ رہے گی، انشاء اللہ۔ ایک رات کا سو روپیہ لیتے ہیں۔ میں نے مہندی بھی خریدی ہے۔ جب یہاں ہم دونوں بہنیں ہونگی تو ہم لوگ مہندی لگائیں گے۔ میں نے پرسوں بھی مہندی لگائی تھی۔ اچھا رنگ آیا ہے.....ایک دم میرون۔

رات میں کبھی کبھی پندرہ بیس منٹ کے لئے بجلی گُل ہو جاتی ہے تو میں ٹیرس پر جا کر بیٹھ جاتی ہوں۔ چاند ہوتا ہے اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا۔ ایسا لگتا ہے جیسے اپنے گھر کی بالکونی میں بیٹھی ہوں۔ لیکن کم بخت مچھر سارا مزا کرکرا کر دیتے ہیں.....ڈنک مار مار کر۔

ایک لڑکی ہے.....سمیرہ.....روم نمبر ۶۸ میں۔ آج اس کی سالگرہ ہے۔ رات ہم لوگ ویمنس کالج گئے تھے.....پھول چوری کرنے.....سمیرا کے لئے۔ میں، طوسیہ اور بتول آپا۔ سر پہ دو پٹہ اوڑھ لیا۔ ایک پولیتھن لیا اور ایک قینچی۔ واچ مین بھائی نماز پڑھ رہے تھے۔ ہم لوگوں نے خوب سارے پھول توڑ لئے اور بھاگے بھاگے آ گئے.....گاتے ہوئے..... چوری میرا کام۔ لیکن پھولوں کی چوری کو چوری تھوڑے ہی کہیں گے؟

آپ لوگ جب آیئے گا تو میرے لئے ایک ساؤس پَین لیتے آیئے گا۔ میرے موبائل کا چارجر بھی خراب ہو گیا ہے۔ ایک لڑکی ہے فاطمہ.....اس کے چارجر سے چارج کرتی ہوں۔

ندا سے کہنا پڑھائی وڑھائی کرے۔ مونگیر میں پلس ٹو کرنے لائق کوئی اسکول نہیں ہے۔ اور یہاں تو میں بھی کچھ مدد کر دیا کروں گی۔ میں نے تو یہیں آ کر پڑھنا سیکھا ہے۔ لیکن جب سب لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہاں مارکس اچھے نہیں ملتے ہیں تو ڈر لگتا ہے۔۔ آپ لوگ میرے لئے دعا کیجئے گا۔ اللہ بہت بڑا ہے۔ اندھا یقین ہے مجھے اس کی ذات پر۔ اسی لئے شاید میں ہر بات میں کہیں نہ کہیں ایک چھوٹی سی خوشی ڈھونڈ لیتی ہوں۔ الحمدُ للہ۔

میری پیاری بہن ندا!

بھئی تم کو میں سلام ولام نہیں کروں گی۔ ہاں! تم سلام کرنا سیکھ لو۔ انشاء اللہ یہاں آؤ گی تو سینیئرس تم سے سلام کروا کروا کر تمھیں تھکا دیں گی۔ کہیں گی۔

'ہاتھ اُٹھا کر، نظریں جھکا کر ہر آپا کو کہو، السّلام علیکم آپا.....السّلام علیکم آپا۔'' دل لگا کر سیریئسلی پڑھائی کرو۔ کچھ بھی چھوڑنا مت۔ Try to grasp the base of everything. سمندر کے اوپر تیرنے سے موتی نہیں ملتے۔ اس کے لئے غوطہ لگانا پڑتا ہے۔ اس بات کو ہمیشہ یاد رکھنا۔ ٹی وی کم دیکھا کرو۔ یہاں تو ٹی وی ہے ہی نہیں۔ ایک روز ہم لوگ اولڈ وحید یہ گئے تھے.....'ہم ساتھ ساتھ ہیں' دیکھنے۔ ڈے اسکالرس سب کہہ رہی تھیں، ''گینگسٹر دیکھا؟ کیا فلم ہے یار! کرش کا پرومو دیکھا؟ رتیک کیسا لگتا ہے؟ چائنا ٹاؤن کے گانے سنے؟'' سن سن کر پاگل ہو گئے ہم لوگ۔ بھئی ہم لوگ ہوسٹلرز ہیں۔ ہمارے پاس کہاں ٹی وی اور وی سی آر۔

ندا! تم پڑھائی کرو۔ مجھے پتہ ہے تم جب جب محنت کرتی ہو تب تب اچھے نمبرات حاصل کرتی ہو. But the key of this lock is hard work۔ یاد کرو وہ دن جب میں رات کے دس بجتے بجتے سو جاتی تھی اور تم رات کے دو دو بجے تک پڑھتی رہتی تھی۔ وقت آ گیا ہے کہ تواریخ کو دہرایا جائے۔ چلو لگ جاؤ کام پر.....مشن علی گڈھ۔ دیکھو! نوٹرے ڈیم کا گیارہواں بارہواں کچھ بھی نہیں ہے۔ اور کالج کی تو بات ہی چھوڑ دو۔

یہاں اسکول میں ہم لوگوں نے ساری ٹیچرز کا Pet Name رکھ چھوڑا ہے۔ ایک ہیں ممتاز حسین میڈم۔ ان کو ہم لوگ حسینہ کہتے ہیں۔ ''ارے کس کا پیریئڈ چل رہا ہے؟ حسینہ بیگم کا؟؟'' دو بہنیں ہیں .....رخسانہ میڈم زولوجی کی اور شبانہ میڈم بائیلوجی کی۔ انہیں ہم لوگ رخشی اور شبّو میڈم کہتے ہیں۔ ایک ہما میڈم ہیں.....کم سِن ہیں اور بالوں میں چھوٹی چھوٹی فینسی بٹس لگاتی ہیں۔ انہیں ہم لوگ بے بی کلپ میڈم کہتے ہیں۔ ہماری وارڈن کا نام نور صبا میڈم ہے۔ ہم لوگوں نے اسے Modify کر کے نور جہاں بنا دیا ہے۔ لڑکیوں نے تو ہماری ہیڈ گرل عفّت آپا کو بھی نہیں چھوڑا۔ ان کا نام عفّت سے بدل کر آفت کر دیا گیا ہے۔

تمہارے لئے دو شعر عرض کرتی ہوں ؎

لمحہ لمحہ وقت گزر جائے گا — کچھ ہی دنوں میں اکزام آ جائے گا
اب بھی وقت ہے، دو چار لائن پڑھ لو — ورنہ پاس کیا مُنّا بھائی کرائے گا

میرے پیارے بھائی ثالث!

تمھاری بہت یاد آتی ہے۔ کیسے ہو اور تمہارے فرینڈس کیسے ہیں؟ اسکول میں تو اب چھٹی ہو گئی ہو گی۔ یاد ہے جب پچھلے سال میں تمھیں ہیری پوٹر کی کہانی سناتی تھی اور تم ندا اور ممّی بہت شوق سے سنتی تھیں۔ رات میں جب ہم لوگ بالکونی میں لیٹے رہتے تھے اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چلتی تھی۔ کتنا مزا آتا تھا۔ یہاں امتحان کے بعد ہم لوگ ہیری پوٹر سناتے تھے ایک دوسرے کو۔ اب تم خود سے پڑھا کرو۔ گرمی کی چھٹیوں میں پہلا حصہ پڑھ لینا۔ جب ندا یہاں آئے گی تو میرے نام ایک بہت بڑا سا خط لکھنا۔ اس میں سب کچھ لکھنا.....اپنے دوستوں کے بارے میں، کرکٹ کے بارے میں۔ تمھارے پاس اب تک کتنے اسٹیکرز جمع ہوئے ہیں؟ کیا کوئی نیا دوست بنا ہے؟ گرمی کی چھٹیوں کے لئے ہوم ورک ملا ہو گا۔ میں تو ابھی تمہاری مدد نہیں کر سکتی۔ تم دل لگا کر پڑھنا۔ اس بار تمہیں بہت اچھے نمبر لانے ہیں۔ اور کرکٹ میں بہت ساری سنچری بھی بنانی ہے۔ ٹی وی کم دیکھا کرو۔ آنکھ خراب ہو جاتی ہے اور پھر جسّی کی طرح موٹے موٹے چشمے لگ جاتے ہیں۔ لیٹ کر بھی پڑھائی مت کرو۔ بابو! گھر میں سب تم سے بہت پیار کرتے ہیں۔ تم اب

بڑے ہو گئے ہو۔لیکن پھر بھی گھر میں سب سے چھوٹے ہی رہو گے۔ پاپا،ممّی ،ندا آپی اور میں.....سب تمھیں بہت پیار کرتے ہیں۔ جب میں سوچتی ہوں کہ میرا چھوٹا سا بھائی نماز پڑھتا ہے اور قرآن بھی تو مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ممّی کہہ رہی تھیں کہ وہ ٹی شرٹ جو میں تمہارے لئے بنگلور سے لائی تھی ،تم پر بہت اچھی لگ رہی تھی۔ مجھے پتہ ہے کہ میرا بھائی ہے ہی اتنا اسمارٹ کہ اس پر ہر ڈریس اچھا لگتا ہے۔اور کھانا وانا ٹھیک سے کھاتے ہونا؟Love You,Miss You اور خط ضرور لکھنا۔اور پڑھائی بھی دل لگا کر کرنا۔ہم سب کے لئے دعا کرنا۔ندا اور میرے رزلٹ کے لئے بھی دعا کرنا اور ممّی پاپا کا خیال رکھنا۔

فقط

فریحہ سبین

◂◂ ● ▸▸

C/O - Masood Alam
Alam Villa Najmi Azeemabadi Lane
Noon ka Choraha Patna City 8

ایک مرتبہ مولانا حالی کے پاس مولوی وحیدالدین سلیم (لٹریری اسسٹنٹ سرسید احمد خان) بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک شخص آیا اور مولانا حالی سے پوچھنے لگا۔''حضرت، میں نے غصہ میں آکر اپنی بیوی سے کہہ دیا کہ تجھ پر تین طلاق ،لیکن بعد میں مجھے اپنے کئے پر افسوس ہوا، بیوی بھی راضی ہے مگر مولوی کہتے ہیں کہ طلاق پڑ گئی ،اب صلح کی کوئی شکل نہیں، خدا کے لئے میری مشکل آسان فرمائیں اور کوئی ایسی ترکیب بتائیں کہ میری بیوی گھر میں دوبارہ آباد ہو سکے۔''ابھی مولانا حالی کوئی جواب نہیں دینے پائے تھے کہ مولوی سلیم اس شخص سے کہنے لگے۔''بھئی یہ بتاؤ کہ تم طلاق 'ت' سے دی تھی یا 'ط' سے؟''اس شخص نے کہا۔''جی میں تو ان پڑھ اور جاہل آدمی ہوں، مجھے کیا پتہ کہ ت سے کیسی طلاق ہوتی ہے اور ط سے کیسی ہوتی ہے۔''مولوی صاحب نے اس سے کہا کہ''میاں یہ بتاؤ کہ تم نے قرأت کے ساتھ کھینچ کر کہا تھا کہ''تجھ پر تین طلاق''جس میں ط کی آواز پوری نکلتی ہے یا معمولی طریقہ پر کہا تھا جس میں ط کی آواز نہیں نکلتی بلکہ ت کی آواز نکلتی ہے۔''بیچارے غریب سوال کنندہ نے کہا۔''جی مولوی صاحب، میں نے معمولی طریقہ پر کہا تھا، قرأت سے کھینچ کر نہیں کہا تھا۔''یہ سننے کے بعد مولوی سلیم صاحب نے پورے اطمینان کے ساتھ اس سے کہا۔''ہاں بس معلوم ہو گیا کہ تو نے ت سے تلاق دی تھی اور ت سے کبھی طلاق پڑ ہی نہیں سکتی، ت سے تلاق کے معنی ہیں' آ محبت کے ساتھ مل بیٹھ'، تو بے فکر ہو کر اپنی بیوی کو گھر لے آ، اور اگر کوئی مولوی اعتراض کرے تو صاف کہہ دیجو کہ میں نے تو ت سے تلاق دی تھی ط سے ہرگز نہیں دی۔''

• ڈائری کا ایک ورق
• ظفر عالم

بدلہ

آج صبح دس بجے میں ڈاکٹر پی۔سی۔سنگھ کی کلینک میں تھا۔وہاں جانے کی وجہ یہ تھی کہ میرے ایک دانت میں دو دن سے کافی تکلیف تھی۔اور میں اسے نکلوانے گیا تھا۔کلینک کے شاندار صوفے پر ابھی میں بیٹھا ہی تھا کہ اچانک مجھے ایک آدمی کے چیخنے کی آواز سنائی دی۔میں نے جب پلٹ کر اس آدمی کی جانب دیکھا تو پایا کہ ایک نوجوان اپنے ضعیف باپ کو آج ڈاکٹر کے یہاں ہوئے خرچے جڑا رہا ہے اور باتوں باتوں میں پچھلے چار پانچ سال کے خرچ کو بھی ایک کئے ہوئے احسان کی طرح جتا رہا ہے۔وہ اسی طرح بکتے جھکتے اپنے خاموش بوڑھے باپ کو لے کر میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ان دونوں کے چلے جانے کے بعد میں نے وہاں پر رکھے ہوئے ایک رسالے کو اُٹھالیا اور اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔اسی اثنا میں میری دائیں جانب جہاں پر صرف ایک آدمی کے بیٹھنے کی جگہ بچی تھی ایک دوسرے نوجوان نے اپنے بوڑھے باپ کو لا کر بٹھا دیا۔پھر اس نے اپنے باپ سے پوچھا کہ کیا آپ اپنے دانت ابھی نکلوائیں گے یا شام میں؟ باپ نے جواب دیا کہ میں اس ڈاکٹر سے اپنا دانت نہیں نکلوانا چاہتا کیونکہ اس کی فیس بہت ہے جب کہ اور بہت سے دوسرے ڈاکٹر کم فیس میں یہی کام کرتے ہیں۔میری تکلیف زیادہ نہیں ہے۔میں دوا کھا لوں گا۔اس سے میری تکلیف کم ہو جائے گی۔اتنے پیسے خرچ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔اپنے باپ کی بات سن کر بیٹے نے کہا کہ اگر میں آپ کو یہاں لے کر آیا ہوں تو مجھے یہ بات معلوم ہے کہ یہاں کی فیس کتنی ہے۔آپ پیسے کی فکر نہ کریں اور اپنا دانت نکلوالیں۔اس سے آپ کو درد سے چھٹکارا مل جائے گا۔اور اس طرح اس نے اپنے باپ کو دانت نکلوانے کے لئے راضی کر لیا۔اس کے بعد وہ بالکونی میں چلا گیا۔مجھے اس کی یہ بات بہت اچھی لگی اور اس سے بات کرنے کے لئے میں بھی بالکونی میں چلا گیا۔میں نے اس سے کہا کہ مجھے تمھاری یہ بات بہت ہی اچھی لگی تو اس نے مجھے جواب دیا کہ یہ تو میرا فرض تھا اور میں نے صرف اپنا فرض نبھایا ہے۔اس کا جواب سن کر میں سوچنے لگا کہ فرض تو اس آدمی کا بھی تھا۔تو پھر اُس نے اپنا فرض کیوں نہیں نبھایا؟ تب میری سمجھ میں یہ آیا کہ ہم جیسا کرتے ہیں ویسا ہی ہمیں ملتا ہے۔ہو سکتا ہے کہ اُس باپ نے بھی اپنے بیٹے کی پرورش احسان جتا جتا کر کی ہو جس کا بدلہ اسے آج مل رہا ہے۔

◂◂ ● ▸▸

Alam Villa Najmi Azeemabadi Lane
Noon ka Choraha Patna City 8
Mob: +91 9905356581

عرفان ستار

راکھ کے ڈھیر پہ کیا شعلہ بیانی کرتے
ایک قصے کی بھلا کتنی کہانی کرتے

حسن اتنا تھا کہ ممکن ہی نہ تھی خود نگری
ہم کہاں تک ترے غم کی نگرانی کرتے

شعلہ جاں کو بجھاتے یونہی قطرہ قطرہ
خود کو ہم آگ بناتے تجھے پانی کرتے

پھول سا تجھ کو مہکتا ہوا رکھتے شب بھر
اپنے سانسوں سے تجھے رات کی رانی کرتے

ندیاں دیکھیں تو بس شرم سے پانی ہو جائیں
چشمِ خوں بستہ سے پیدا وہ روانی کرتے

سب سے کہتے کہ یہ قصہ ہے پرانا صاحب
آہ کی آنچ سے تصویر پرانی کرتے

درودیوار بدلنے میں کہاں کی مشکل
گھر جو ہوتا تو بھلا نقل مکانی کرتے؟

کوئی آجاتا کبھی یونہی اگر دل کے قریب
ہم ترا ذکر پئے یاد دہانی کرتے

سچ تو یہ ہے کہ ترے ہجر کا اب رنج نہیں
کیا دکھاوے کے لئے اشک فشانی کرتے؟

دل کو ہر لحظہ ہی دی عقل پہ ہم نے ترجیح
یارِ جانی کو کہاں دشمنِ جانی کرتے

شب اسی طرح بسر ہوتی ہے میری عرفانؔ
حرفِ خوش رنگ کو اندوہِ معانی کرتے

◀◀ ● ▶▶

عرفان ستار

خواب میں کوئی مجھ کو آس دلانے بیٹھا تھا
آنکھ کھلی تو میں اپنے ہی سرہانے بیٹھا تھا

یونہی رکا تھا دم لینے کو، تم نے کیا سمجھا؟
ہار نہیں مانی تھی بس ستانے بیٹھا تھا

خود بھی لہولہان ہوا دل، مجھے بھی زخم دیئے
میں بھی کیسے وحشی کو سمجھانے بیٹھا تھا

لاکھ جتن کرنے پر بھی کم ہوا نہ دل کا بوجھ
کیسا بھاری پتھر میں سرکانے بیٹھا تھا

تارے کرنوں کی رتھ پر لائے تھے اُس کی یاد
چاند بھی خوابوں کا چندن مہکانے بیٹھا تھا

نئے برس کی خوشیوں میں مشغول تھے سب، اور میں
گئے برس کی چوٹوں کو سہلانے بیٹھا تھا

وہ تو کل جھنکار سے پرکھ لیا اُس گیانی نے
میں تو پیتل کے سکے چمکانے بیٹھا تھا

دشمن جتنے آئے ان کے خطا ہوئے سب تیر
لیکن اپنوں کا ہر تیر نشانے بیٹھا تھا

دقصوں کو سچ ماننے والے، دیکھ لیا انجام؟
پاگل جھوٹ کی طاقت سے ٹکرانے بیٹھا تھا

میں ہی کوئی گھاگ ہوں ایسا، اُتر گیا دل میں
وہ تو صرف بہلنے اور بہلانے بیٹھا تھا

مت پوچھو کتنی شدت سے یاد آئی تھی ماں
آج میں جب چٹنی سے روٹی کھانے بیٹھا تھا

اپنا قصور سمجھ نہیں آیا جتنا غور کیا
میں تو سچے دل سے ہی پچھتانے بیٹھا تھا

عین اُسی دم ختم ہوئی تھی مہلت جب عرفانؔ
خود کو توڑ چکا تھا اور بنانے بیٹھا تھا

◀◀ ● ▶▶

عرفان ستار

یہ خبر ہے، مجھ میں کچھ میرے سِوا موجود ہے
اب تو بس معلوم کرنا ہے کہ کیا موجود ہے

ایک میں ہوں، جس کا ہونا ہو کے بھی ثابت نہیں
ایک وہ ہے جو نہ ہو کر جابجا موجود ہے

حل کبھی ہوتا نہیں یہ جسم سے چھوٹے بغیر
میں ابھی زندہ ہوں سو یہ مسئلہ موجود ہے

تاب آنکھیں لا سکیں اُس حسن کی، ممکن نہیں
میں تو حیراں ہوں کہ اب تک آئینہ موجود ہے

رات کٹتی ہے مزے میں چین سے ہوتی ہے صبح
چاندنی موجود ہے بادِ صبا موجود ہے

روشنی سی آ رہی ہے اِس طرف چھنتی ہوئی
اور وہ حدت بھی جو زیرِ قبا موجود ہے

ایک پل فرصت کہاں دیتے ہیں مجھ کو میرے غم
ایک کو بہلا دیا تو دوسرا موجود ہے

درد کی شدت میں بھی چلتی ہے میرے دل کے ساتھ
اک دھڑکتی روشنی جو ہر جگہ موجود ہے

معتبر تو قیس کا قصہ بھی ہے اس ضمن میں
اس حوالے سے مرا بھی واقعہ موجود ہے

خواب میں اک زخم دیکھا تھا بدن پر جس جگہ
صبح دیکھا تو وہاں اک داغ سا موجود ہے

ایک ہی شعلہ سے جلتے آ رہے ہیں یہ چراغ
میر سے مجھ تک وہی اک سلسلہ موجود ہے

یوں تو ہے عرفانؔ ہر احساس ہی محدود سا
اک کسک سی ہے کہ جو بے انتہا موجود ہے

◀◀ ● ▶▶

114-Jack Monkman Cres.
Markham,Ontario,L3S4T5,Canada

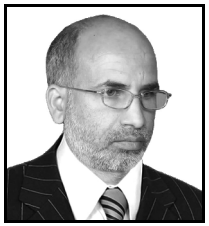

ذوالفقار نقوی

رنگ اپنا پھر دکھانے لگ گیا
حرفِ لا پھر سے پڑھانے لگ گیا

ہاتھ کیا میں نے بڑھایا اُس طرف
وہ مجھے اپنا بنانے لگ گیا

پھر ہوا کے دوش پر ہیں تلخیاں
پھر یہ موسم آزمانے لگ گیا

ایسا چمکا وہ چراغِ آرزو
آنکھ کی پتلی جلانے لگ گیا

صورتیں بنتی بھی ہیں، مٹتی بھی ہیں
خاک پر وہ گل کھلانے لگ گیا

شہر میں جو شخص تھا پہچان کا
دیکھتے ہی منہ چھپانے لگ گیا

وہ مری مٹی میں پنپا اِس قدر
میرے اندر گھر بنانے لگ گیا

◀◀ ● ▶▶

موج میری ذات کی قائل کہاں
میں کہاں ہوں اور وہ ساحل کہاں

وہ مری گلیوں سے گذرا ہی نہیں
میرے کرب و درد میں شامل کہاں

نرگسیت چھلنی چھلنی کر گئی
تیرا سینہ پیار کے قابل کہاں

اٹھ رہا ہے شور لفظوں سے بہم
بھاگتا ہے فکر کا قاتل کہاں

میرے حصے پر وہ قابض ہو گیا
اب میں اپنے آپ کا حامل کہاں

◀◀ ● ▶▶

C/o Ayub Shah,Police Transport Workshop,Police Lines Channi Himmat,Jammu-180015(J&K)

سلیم انصاری

ان گنت چہروں کی تابانی سے مرجاتے ہیں ہم
آئینہ خانوں میں حیرانی سے مرجاتے ہیں ہم

بےضمیری کا سمندر پار کرلینے کے بعد
اپنی آنکھوں میں بچے پانی سے مرجاتے ہیں ہم

عقل کرتی رہتی ہے تدبیر جینے کی مگر
وحشتِ دل تیری نادانی سے مرجاتے ہیں ہم

دھونڈھتے رہتے ہیں دن بھر اپنے ہونے کا جواز
شام ہوتے ہی پشیمانی سے مرجاتے ہیں ہم

دشت کو گلزار کرتے تھے مگر اب شہر میں
باغباں تیری نگہبانی سے مرجاتے ہیں ہم

سونپ دیتے ہیں ادھورے خواب بچوں کو سلیم
اور اسکے بعد آسانی سے مرجاتے ہیں ہم

◀◀ ● ▶▶

HIG-3 Anand Nagar
Jabalpur(M.P) 482004
Mob-+91 7762855355

اقبال حسن آزاد

خود سے باہر نکل کے دیکھتے ہیں
اپنا لہجہ بدل کے دیکھتے ہیں

نقش پا ہم کسی کا کیوں دیکھیں
اک نئی راہ چل کے دیکھتے ہیں

خوشبوؤں کی ہے زندگی کتنی
پتّیوں کو مسل کے دیکھتے ہیں

لغزشوں میں بھی لطف آتا ہے
اس لئے ہم پھسل کے دیکھتے ہیں

خوش گمانی بھی خوب ہی شے ہے
لوگ اس سے بہل کے دیکھتے ہیں

کس کے کاندھے پہ کتنے چہرے ہیں
ہم ذرا آنکھ مل کے دیکھتے ہیں

موم سے لوگ بھی یہاں اکثر
سنگ و آہن میں ڈھل کے دیکھتے ہیں

◀◀ ● ▶▶

اصغر شمیم

اُس نے پھر مجھکو پکارا کس لئے
چلتے چلتے میں بھی ٹھہرا کس لئے

مجھکو غواصی کا فن آتا نہیں
ڈھونڈتا ہے مجھکو دریا کس لئے

جب تعلق ہی نہیں مجھ سے کوئی
کر رہا ہے پھر اشارہ کس لئے

وہ کرے گا بے سہارا ایک دن
دے رہا ہے پھر سہارا کس لئے

ہے اندھیرا آج بھی گھر میں مرے
پھر چمکتا ہے ستارا کس لئے

ہیں سبھی بے چارگی کی قید میں
کہتے ہیں مجھکو بے چارہ کس لئے

ڈوبنا اصغؔر مقدر ہو گیا
ڈھونڈتا ہے تو کنارا کس لئے

◀◀ ● ▶▶

اڑتے اڑتے غبار آیا ہے
وہ جو ناقہ سوار آیا ہے

پھول دامن سے بھر لیا سب نے
میرے حصّے میں خار آیا ہے

میں تو ہوں پیکر وفا لیکن
کب انہیں اعتبار آیا ہے

آینہ دیکھ کر سنورنا کیا
دیکھ کر تم کو پیار آیا ہے

اس موبایل کے دور میں اصغر
آئی چٹھی نہ تا ر آیا ہے

◀◀ ● ▶▶

C/o Baitul Qasim
12/3H/1-Patwar Bagan
Lane,Kolkata-700009(W.B)

پرویز ساحرؔ

نیند میں گفتگو کئے جائیں
بس تری آرزو کئے جائیں

کھلتے جائیں گے خود بخود اسرار
دم بدم اللہ ھو کئے جائیں

یہی لا حاصلی تو حاصل ہے
عمر بھر جستجو کئے جائیں

ہائے کس درجہ بو الہوس ہیں لوگ
خود کو بے آبرو کئے جائیں

شوقِ آوارگی ہے اَور ہم ہیں
اک سفر چار سو کئے جائیں

ہم ہیں عاشق تو پھر یہ لازِم ہے
مدح آئینہ رُو کئے جائیں

چاند صورت یہ لڑکیاں ساحرؔ
چاندنی چار سو کئے جائیں

◀◀ ● ▶▶

کہنا نہ کچھ بھی منہ سے خبردار چپ رہو
سمجھیں گے لوگ تم کو گنہگار، چپ رہو

ایسا نہ ہو کہ سولی چڑھا دیں تمھیں یہ لوگ
بہتر یہی ہے بر سر دربار چپ رہو

خود اپنے آپ سے بھی نہ باتیں کیا کرو
رکھتے ہیں کان یہ در و دیوار چپ رہو

اک میں تھا فرط شوق میں بس بولتا رہا
کہتا رہا وہ مجھ سے بہ تکرار چپ رہو

گاہے لب سخن کو بھی تم وا کرو میاں
میں نے یہ کب کہا کہ لگاتار چپ رہو

ساحرؔ ! کچھ ایسے ٹوکا مجھے اس نے دفعتاً
یہ بزم غیر ہے ،سو مرے یار چپ رہو

◀◀ ● ▶▶

House No: 898/8
Mohalla Shahar Nawan
.Aibatabad,Pakistan

ڈاکٹر اصغر علی بلوچ

جاگتی رات، اونگھتے ہوئے دن
طاقِ نسیاں پہ رکھے ہوئے دن

کھینچ لائیں گے پوربی بادل
بادِ صرصر پہ یہ لدے ہوئے دن

استراحت کی جستجو میں ہیں
شام کے پار جھانکتے ہوئے دن

ہجر ہے ہجر کی مسافت ہے
رات کے قد سے بھی بڑے ہوئے دن

جانے اب کس کے انتظار میں ہیں
صف بہ صف راہ میں کھڑے ہوئے دن

مجھ کو کیا مجتمع کریں اصغرؔ
چار پہروں میں خود بٹے ہوئے دن

◀◀ ● ▶▶

نمازِ عشق پڑھیں گے ذرا وضو تو کرو
دل و نگاہ و جگر کو لہو لہو تو کرو
تمھارے دل میں بھی ممکن ہے آبسے باھو
تم اپنے خانۂ دل کی تہوں سے ھوُ تو کرو
بجا ہے فکرِ قیامت کا خوف بھی لیکن
غمِ زمانہ کے چہرے کو سرخرو تو کرو
تمھارے دل میں محبت کے پھول مہکیں گے
مگر یہ شرط ہے تزئینِ رنگ و بو تو کرو
یہ لازمی تو نہیں ہے سراب ہی نکلے
گلِ مراد کی صحرا میں جستجو تو کرو
تمھارے اشک ہیں حصہ کسی سمندر کا
تم ان کو زورِ تلاطم سے آب جو تو کرو
ہے تار تار بہت دامنِ وفا اصغرؔ
تمھارے بس میں ہے جتنا اسے رفو تو کرو

◀◀ ● ▶▶

Dept: of Urdu GC University
Faisalabad (Pakistan)
Mob: +92 3007908317

توقیر عباس

احساس تو ہر روز یہ ہوتا ہے کہ کچھ ہے
کیا جانئے کچھ ہونے کا کھٹکا ہے کہ کچھ ہے

کیا چیز ہے کھلتا نہیں کچھ بھید کسی پر
وحشت میں کوئی چیختا رہتا ہے کہ کچھ ہے

اپنا جسے معلوم نہیں نام و نسب بھی
وہ شخص بھی اب خود کو سمجھتا ہے وہ کچھ ہے

بے تابیٔ دل بڑھنے لگی ہے کہ کسی نے
کچھ ایسی نظر سے مجھے دیکھا ہے کہ کچھ ہے

یہ بات الگ ہے کہ بتاتے نہیں کچھ بھی
احباب کے چہروں سے تو لگتا ہے کہ کچھ ہے

اک روشنی رکھتی ہے سدا اپنے جلو میں
آنکھوں میں دیا آس کا جلتا ہے کہ کچھ ہے

نہ جانے آگ کیسی آئینوں میں سو رہی تھی
دھواں بھی اُٹھ رہا تھا، روشنی بھی ہو رہی تھی

لہو میری نسوں میں بھی کبھی کا جم چکا تھا
بدن پر برف کو اوڑھے ندی بھی سو رہی تھی

چمکتے برتنوں میں خون گارا ہو رہا تھا
مری آنکھوں میں بیٹھی کوئی خواہش رو رہی تھی

ہماری دوستی میں بھی دڑاریں پڑ رہی تھیں
اُجالے میں نمایاں تیرگی بھی ہو رہی تھی

دباؤ پانیوں کا ایک جانب بڑھ رہا تھا
نہ جانے ساحلوں پر کون کپڑے دھو رہی تھی

کسی کے لمس کا احساس پیہم ہو رہا تھا
کہ جیسے پھول پر معصوم تتلی سو رہی تھی

C/o Hamid Jibran,
Godown No.21 Chanab Mills,
Chanab Morr, Hanjarwal, Multan
Road, Lahore Pakistan
Ph: 03334419471

عمر فرحت

نہ جانے کون ہے کیا چاہتا ہے
مرے اندر سے کوئی جھانکتا ہے

خدا جانے اسے کیا راس آئے
مرا سایہ مرا قد ناپتا ہے

تڑپنا لازمی مقتول کا ہے
مگر قاتل بھلا کیوں کانپتا ہے

جسے آنکھیں نہیں پہچانتی اب
اسے صدیوں سے یہ دل جانتا ہے

میں ہوں اک قطرۂ ہستی اگرچہ
میرا ہر پل سمندر مانگتا ہے

جب بھی پیڑوں پہ ثمر جاگتا ہے
دل میں طوفان کا ڈر جاگتا ہے

صبح ہوتے ہی بجھے سارے چراغ
اک ستارہ سا مگر جاگتا ہے

خاک ہوجاتا ہے یہ دستِ دعا
تب دعاؤں میں اثر جاگتا ہے

شہر میں شور ہے نابینوں کا
کیا کوئی اہلِ نظر جاگتا ہے

لوٹ جاؤں گا کہ مری خاطر
دشت میں ایک شجر جاگتا ہے

Opp:ITI Road,W-No: 4,
Rajouri-185131(J&K)
Mob:+91 7298136987

کامران غنی صبا

غمِ حیات کو لکھا کتاب کی مانند
اور ایک نام کہ ہے انتساب کی مانند

نہ جانے کہہ دیا کس بے خودی میں ساقی نے
سرورِ تشنہ لبی ہے شراب کی مانند

مرا سوال کہ کس نے مجھے تباہ کیا
ترا سکوت مکمل جواب کی مانند

میں اپنی آنکھوں کو رکھتا ہوں باوضو ہردم
کہ تیرا ذکر مقدس کتاب کی مانند

مجھے عزیز ہیں خوابوں کی کرچیاں بھی صباؔ
کسی نگاہ میں ہوں گی عذاب کی مانند

Urdu Middle School,
ChakNaseer,Pateypur,
Dist:Vaishali(Bihar)

نثار احمد نثار

رشتۂ یاراں میں تھوڑی سی تو بے باکی بھی ہو
ایک نکتہ ہم سخن کے بیچ ادراکی بھی ہو

شفقتوں اور قربتوں کے مرحلے طے ہو گئے
اب ذرا سا احترامِ جذبۂ شاکی بھی ہو

زندگی کے معرکے میں اک جنوں کافی نہیں
خار چبھ جائیں گے تلووں میں کہ چالاکی بھی ہو

اس کا تھوڑا سا تعلق ہے مرے اظہار میں
اک توازن سے ذرا سا ذوقِ پوشاکی بھی ہو

گھر کوئی در اصل گھر ہو تو یہی تہذیب ہو
پھول،خوشبو،پیڑ،پتے،لمسِ خاشاکی بھی ہو

Begumpur,
Samastipur-848101
Mob:+91 9204386520

● ستیہ پال آنند

طفلِ سن رسیدہ

سو برس کا میں کب تھا، منشیِ وقت؟
کب نہیں تھے؟ ذرا بتاؤ تو
تم یقیناً کہو گے، بچپن میں
کھیلنے کودنے میں وقت کٹا
جب شباب آیا تو؟... کہو، ہاں کہو
کیا برومند، شیر مست ہوئے؟
کیا جفاکش تھے؟ بے جگر؟ کرّار؟
آمرِ وقت کو کوئی چیلنج؟
سرکشی تختِ مستبد کے خلاف؟
کیا رہے یار باش لوگوں کی
صحبتِ ناؤنوش میں مدہوش؟
جی نہیں، ایسی کوئی بات نہیں
تم رہے بند کتب خانوں میں
وہ کتابیں بھی چاٹ لیں تم نے
جن کو دیمک نے بدمزہ سمجھا
اس جوانی میں تم رہے مصروف
(جس میں سب لوگ عیش کرتے ہیں)
منطقی پخت و پز کی کاوش میں
لفظ بینی کی خشک عادت نے

موٹے چشمے سے ڈھانپ دیں آنکھیں
م نے سیکھے عجب ذہانت سے
اُتر میمانسا، سمکھیا، یوگ
نیائے، ویدانت اور گیتا گیان
فکر فی نفسہ، ارتسام وخیال
عینیت، مادیت، ورائے وجود
صوفیانہ مراقبہ، عرفان
..... یہ کہولت زدہ بزرگی کے
گرد آلود فلسفے ہیں، جنہیں
اپنی نوخاستہ جوانی میں
تم نے سر میں انڈیل کر سوچا
اب کلیسا، کلس، حرم، مینار
جامعات اور ان کا بحرِ علوم
میری جاگیر ہیں، مری املاک
میں ہوں ذی علم، جیدِ عالم
زیست کا نیم پختہ آدھا گیان
کلمۃ الحق سمجھ لیا تم نے
اور اک جست میں لڑکپن سے
ہو گئے پیرِ زال، شیخ البیت
منشیِ وقت نے کہا..... دیکھو
تم نے حدِ بلوغ سے پہلے
اپنی بے ریش کم سنی کے فقط
بیس برسوں میں جی لیا صد سال
اور اب طفلِ سن رسیدہ ہو

◀◀ ● ▶▶

● ستیہ پال آنند

تجا ہوا، بیکار، اکارت

(مایوس لمحے میں خلق ہوئی ایک نظم)
پوچھو مت یہ کیسا خلا ہے
ہم جس میں محبوس کھڑے ہیں
وقت کی ریت گھڑی سے کیسے
ذرّہ ذرّہ گرتے لمحے
ہم کو اکارت جان کے، یارو
تجا ہوا، بوسیدہ کپڑے کی اترن سا
چھوڑ گئے ہیں
رسّی، جس سے
عمر گریزاں کے موسم، اجلے کپڑوں سے
ٹنگے ہوئے جان بخش فضا میں جھوم رہے تھے
ادھڑی ادھڑی، مُڑی تُڑی سی
گدلی سرد ہوا میں پھانسی کے پھندے سی
جھول رہی ہے
کل کی سندر کنیائیں، جو
اپنی کلائیوں میں پھولوں کی قوس قزح کے گجرے پہنے
گلشن گلشن گھوم رہی تھیں
اب بوڑھی بیوائیں ہیں، جو
ٹنڈ منڈ پیڑوں سی سوکھی..... بال کھلے

گاڑھی مٹّی کی رنگت جیسے
رات رات بھر جاگ کے سینہ کوبی کرتیں
راکھ پہ بیٹھی سسک رہی ہیں
جلتے الاؤ بجھ سے گئے ہیں
کہر آلود فضا کی گدلی تاریکی میں
تارہ، جگنو، کچھ بھی نہیں ہے!
وقت کی ریت گھڑی سے کیسے
گرتے پل چھن
اے ہم عصر ساتھیو، ہم کو
تجا ہوا
بیکار، اکارت چھوڑ گئے ہیں!

◂◂ ● ▸▸

3055 Marcey Creek Road
HERNDON. VA. 20171. USA.
Contact No:703-481-0957

اقبال حسن آزاد کے

پہلے افسانوی مجموعہ

قطرہ قطرہ احساس

کا

دوسرا ایڈیشن

زیر طبع

● یوسف عزیز زاھد

دستک

عجب بے کیف موسم ہے
زمیں سے آسماں تک دھند میں لپٹے مناظر آنکھ میں نشتر چبھوتے ہیں
پرندے حیرتوں کا آئنہ اوڑھے اڑانیں بھول کر بارود چگتے ہیں
سنہری دھوپ کی کرنیں سلگتی برف میں پنہاں کسی رمز۔نہاں کو ڈھونڈتی ہیں.....
کوئی دروازہ نہیں کھلتا/کوئی دروا نہیں ہوتا
مسلسل جبر طاری ہے/طلسم خامشی صدیوں پہ بھاری ہے
مسافر! دستکیں شہر تمنا تک تو آ پہنچی
ہیں لیکن دستکوں کے ہاتھ خالی ہیں
دریچوں میں گڑی آنکھیں شکستہ آہٹوں کی منتظر ہیں.....
کوئی دروازہ نہیں کھلتا/کوئی دروا نہیں ہوتا
(مکانوں کے مکیں کیا سو گئے ہیں؟)
جستجو گمنام رستوں میں جنوں کی وحشتوں سے آگہی کے پھول چنتی ہے
ہوس کی گرد سے آلودہ خواہش سازشوں کے جال بنتی ہے/شعور آدمی.....
احساس کے زنداں میں قید با مشقت جھیلتی آوارگی کے استعارے یاد کرتا ہے
کف افسوس ملتا ہے/دعاؤں کے سبھی کشکول خالی ہیں
صداؤں کے دریچے بھی سوالی ہیں/مکانوں کے مکیں کیا سو گئے ہیں؟
کوئی دروازہ نہیں کھلتا

◂◂ ● ▸▸

● یوسف عزیز زاھد

ابھی حرف دعا لکھنے کا موسم نہیں آیا

کسے معلوم یہ موسم
پرندوں کی اڑانوں، شام کی دستک سے پہلے ہی گزر جائے
خزاں کے گھپ اندھیرے میں اتر جائے
کسے معلوم ہے کب آکسیجن کا یہ نیلا گنبدِ بے در
(جسے تم آخری امید کہتے ہو)
دریچوں ہی میں بٹ جائے
سیاہی اوڑھ کر آلودگی کے شہر کا آسیب کہلائے
کسے معلوم......
شہرِ عشق کے چہرے پہ حرفِ بے کسی لکھنے کی خواہش میں
رفیقانِ عزازیل آگ کے دریا سے توقیرِ قلم مانگیں
کسے معلوم......
کہ شہرِ عشق تسخیر و تعلق کے خدوخال آگہی کو سونپ آیا ہو
(بدلتے موسموں کا عکس پہلی رت کی چھایا ہو)
کسے معلوم ہے جاناں......!
طلسمِ خواب وتابِ زندگانی کو خس و خاشاک ہونا ہو
(حسابِ دوستاں بیباق ہونا ہو)
ورائے خواب اک تعبیر کو نمناک ہونا ہو
ابھی تو خواب کی تعبیر نے پروردگارِ حرف و معنی سے ہمارے عہد کو بے صوت کرنے
کی دعائیں بھی نہیں مانگیں

(ابھی حرفِ دعا لکھنے کا موسم ہی نہیں آیا)
ابھی تو راستوں کی گرد میں
گم گشتہ جنت کی تلاش ان معبدوں تک رہنمائی کا فریضہ بھی نبھائے گی
جہاں ابلیس آدم کو سوا نیزے پہ رکھے اک بجھے سورج کے پیچھے سے
(اشاروں میں، کنایوں میں)
رموزِ خواہش و آدابِ بیبا کی سکھاتا ہے
نہایت خوبصورت اور معنی خیز سجدوں سے لبھاتا ہے
ابھی حرفِ دعا لکھنے کا موسم ہی نہیں آیا

◀◀ ● ▶▶

Moon Cottage, Al-Khair Street
Javeed Town ,Lucky Dhiri Road
Gulbahar Colony No-4
Peshawar 25000 (Pakistan)
+92 3459103005

اقبال حسن آزاد
کا
تیسرا
افسانوی مجموعہ
پورٹریٹ
زیر طبع

● جمیل الرحمٰن

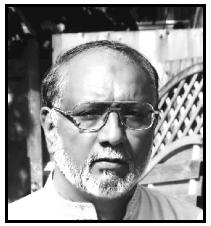

بارش کی دوسری بوند گرنے تک

قصّہ گو/جب تمہیں سرائے سے باہر
قتل کیا گیا/ لے پالک عبارتوں کی ہتھیلیوں پر
فربہ بدن لفظ اپنی پتلی اور لانبی ٹانگوں پر
اچھل اچھل کر تالیاں پیٹ رہے تھے! گلی کے کونے پر گڑے پتھر کی نوک پر
بارش کی پہلی بوند/آگ میں لپٹے گولے کی طرح جمی ہوئی تھی
اور دیواروں پر کندہ تیر کی علامت کا رخ بدل چکا تھا! تم داستان میں تحریف کرنے
کے مرتکب ہوئے
اور ہواؤں نے تمہارے کردار
تہہ خانوں سے بھرے شہر کو سونپ دئے
اب سرائے ہیولوں سے معمور ہے
اور روشن شمعوں کے گرد کسی آواز کا کوئی دائرہ نہیں!
میں تمہاری سرائے کے سامنے
اپنے کاندھوں پر تمہاری لاش اٹھائے/گلی کے موڑ پر
بارش کی دوسری بوند پڑنے کے انتظار میں کب سے کھڑا
فربہ بدن بالشتیوں کی تالیوں کا شور سُن رہا ہوں
کوئی کردار/کسی تہہ خانے سے ابھرنے کے لئے تیار نہیں
اور کونے کا پتھر
مجھے خشمگیں نظروں سے گھور رہا ہے!!!!!

◀◀ ● ▶▶

● جمیل الرحمٰن

مُوئے ریش سے لٹکے کلائیڈوسکوپ میں

سورج اور چاند بچ کر نکل جاتے ہیں
مگر اُن کی سمت اچھالی گئی کمندوں کے آنکڑے
زمین پر گرنے کی بجائے
اپنی نارسائی کا خراج
پچکی ہوئی کھوپڑیوں میں اٹک کر
وصول کرتے ہیں! سیاہ خوفناک مکوڑوں جیسی چیونٹیاں
ایک دائرے میں گھومنے لگتی ہیں
اور دائرے کے عین وسط میں
وہ کھوپڑیاں بکھر جاتی ہیں
جن کے سوراخوں سے اُبلتا خون
خطیبوں کو آگ اور مکوڑوں کو رزق فراہم کرتا ہے! سورج اور چاند مسکراتے ہوئے
اپنے محور میں گھومتے رہتے ہیں
نت نئے آنکڑے ایجاد ہوتے ہیں
کمندیں پھینکی جاتی ہیں/اور
چیونٹیاں دائرے بناتی رہتی ہیں!

◀◀ ● ▶▶

67-NORTHCOTE ROAD,
CROYDON CR0 2HYSURREY,
UNITED KINGDOM 00-44-7404366525

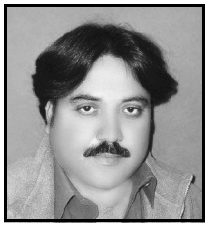

● خالد ندیم شانی

ڈاکٹر نگہت نسیم کے لئے ایک نظم

اگر مجھ سے کوئی پوچھے
کبھی تو نے سمندر کو
فلک چھونے کی خواہش میں
بہت بے چین دیکھا ہے؟
کبھی بارش کے پانی کو، کسی بادل کی بانہوں میں
برسنے سے ذرا پہلے، مچلتا اور تڑپتا تو نے دیکھا ہے؟
کبھی تو نے دعاؤں کی کوئی تصویر دیکھی ہے؟
کبھی تو نے محبت کو مجسم کر کے دیکھا ہے؟
کبھی ہوا کبھی سیتا کے لہجے میں
کسی کو بولتے تم نے سنا ہے کیا؟
کبھی جیون کے صحرا میں
گھنے برگد کی چھاؤں سا
کسی ہستی کو دیکھا ہے؟
اگر مجھ سے کوئی پوچھے
تو میں اس کی بصارت کو
تری تصویر دے دوں گا

◀◀ ● ▶▶

C/o Naveed Madical Store Main Bazar Fatehpoor
Teh. karood Laal eeson Distic Laiyah Punjab (Pakistan)
Postal Code 31050 Phone Number 00923003984898

● ہندی کویتائیں
● کیتکی بھارتیہ
● ترجمہ: اقبال حسن آزاد

بخار

تیرا پیار
ایک بخار ہی تو تھا
کل تک تھا
آج اُتر گیا
تم اور میں
کبھی بنے ہی نہ تھے
ایک دوجے کے لئے
تم، تم تھے
اور
میں، میں
جو کبھی ہم نہ بن پائے
تم، تم ہی رہ گئے
میں، میں ہی رہ گئی
تم پورب تھے
تو میں پچھّم
تم اُتّر تھے
تو میں دکھّن
اسی لئے تو محسوس ہوتا تھا
کہ ملے ہوئے ہیں

لیکن درحقیقت نہیں

ندی کے دو کناروں کی طرح
ساتھ ساتھ چلتے جانا
اجنبیوں کی طرح
شاید
یہی ہماری قسمت ہے
پُل چاہ کر بھی ہمیں ایک نہیں کر سکتے
اور میں چاہ کر بھی
کوئی نیا راستہ نہیں چُن سکتی

◀◀ ● ▶▶

بوجھ

ہاتھوں کی مہندی
آنکھوں کا کاجل
کلائیوں کی چوڑیاں
پیروں کی پائل
ماتھے کی بندیا
اور ہونٹوں کی مسکان
باندھ کر
دور پھینک آئی ہوں
من کا بوجھ
کافی ہلکا ہو گیا ہے

◀◀ ● ▶▶

Krishnapuri,Thakurgunj,Janpad,
Kishangunj-855116(Bihar)
+91 9412973390

● گوشہ لطف الرحمٰن

کوائف

☆ پیدائش: ۲؍فروری ۱۹۴۱ء بمقام بنیاپور، چھپرہ
☆ آبائی وطن: ریونڈھا، ضلع دربھنگہ
☆ والد: مولوی عبدالغفور
☆ والدہ: آمنہ خاتون
☆ تعلیم: میٹرک، شفیع مسلم ہائی اسکول، لہیریاسرائے، دربھنگہ (۱۹۵۷ء)
☆ انٹرمیڈیٹ: انوگرہ نارائن کالج، پٹنہ (۱۹۵۹ء)
☆ بی۔اے (اردو آنرس، گولڈ میڈلسٹ) ملت کالج، دربھنگہ ۱۹۶۱ء
☆ ایم۔اے (اردو، گولڈ میڈلسٹ) پٹنہ یونیورسیٹی، پٹنہ، ۱۹۶۳ء
☆ ایم۔اے (فارسی، گولڈ میڈلسٹ) پٹنہ یونیورسیٹی، ۱۹۶۴ء
☆ پی۔ایچ۔ڈی (راسخ عظیم آبادی بحیثیت غزل گو، زیرنگرانی ڈاکٹر مطیع الرحمٰن، پٹنہ یونیورسیٹی)
☆ ملازمت: اگست ۱۹۶۶ء بھاگلپور یونیورسیٹی، شعبۂ اردو میں بحیثیت لکچرار تقرری۔
☆ ملازمت سے سبکدوشی: ۲؍فروری ۲۰۰۱ء
☆ پہلی شادی: ہمراہ ماموں زاد بہن رابعہ خاتون بنت محمد مطیع الرحمٰن۔ ۱۹۶۸ء
☆ اولادیں: خورشیدہ زریں، ولی الرحمٰن
☆ دوسری شادی: ہمراہ تنویر سحر بنت محمد صدرالدین، بھاگلپور، ۱۹۷۵ء

تخلیقات:

☆ تازگیٔ برگ نوا (مجموعۂ غزل، ترتیب وتزئین: شبیر احمد، قمر اعظم ہاشمی) ۱۹۷۷ء
☆ بہاری (بچن سنگھ کی ہندی کتاب 'بہاری' کا اردو ترجمہ، ناشر: ساہتیہ اکادمی) ۱۹۹۰ء
☆ جدیدیت کی جمالیات (تنقید، مرتب: ڈاکٹر شاداب رضی) ۱۹۹۳ء

☆ داستان طلسمی سیارے کی (جاپانی مصنف شنجی تجیما کی کہانی کا ترجمہ) ۱۹۹۷ء
☆ راسخ عظیم آبادی (تحقیق، ناشر: ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی) ۱۹۹۷ء
☆ نقد نگاہ (تنقید، حرفے چند: مولانا محمد ولی رحمانی، ناشر: تخلیق کار پبلیکیشنز) ۲۰۰۰ء
☆ نثر کی شعریات (تنقید، پیش لفظ: ڈاکٹر قمر رئیس) ۲۰۰۶ء
☆ بوسۂ نم (شاعری، پیشکش: رحمانی فاؤنڈیشن، مونگیر) ۲۰۰۷ء
☆ صنم آشنا (نظمیں، مرتب: ڈاکٹر شیریں زباں خانم، پیش کش: رحمانی فاؤنڈیشن، مونگیر) ۲۰۰۸ء
☆ تنقیدی مکالمے (تنقید، ناشر: مصنف) ۲۰۰۸ء
☆ تعبیر و تقدیر (مقالات، ناشر: مصنف) ۲۰۰۸ء
☆ تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو (خطوط کا مجموعہ) ۲۰۰۸ء جلد دوم ۲۰۱۰ء
☆ دشت میں خیمۂ گل (غزلیں، پیش کش رحمانی فاؤنڈیشن، مونگیر) ۲۰۱۱ء
☆ تازگیٔ برگ نوا (اشاعت ثانی، ناشر محمد امتیاز رحمانی، مونگیر) ۲۰۱۱ء
☆ راگ براگ (نظمیں، ناشر محمد امتیاز رحمانی، مونگیر) ۲۰۱۲ء

غیر مطبوعہ:

☆ اردو فکشن کے سو سال.....دو جلدیں (تنقید)
☆ شہر وفا (خاکوں کا مجموعہ)
☆ تغزل، روایت در روایت (تنقید)
☆ کٹورے گلاب کے ('صنم آشنا' کا ہندی ترجمہ)
☆ خطوط کے مجموعے کی تیسری جلد

سیاسی زندگی:

☆ جنتا دل کے ٹکٹ پر اسمبلی کے لئے انتخاب اور کابینہ میں شمولیت ۱۹۹۵ء
☆ وزیر محکمہ اقلیتی فلاح اور پی ڈبلو ڈی، حکومت بہار ۱۹۹۷ء
☆ مدت وزارت کی تکمیل اور عملی سیاست سے علاحدگی ۲۰۰۰ء

انتقال: ☆ ۳۱/اگست ۲۰۱۳ء شب ساڑھے دس بجے بمقام بھیکن پور، بھاگلپور

تدفین: ☆ بمقام: بھیکن پور، بھاگلپور

◀◀ ● ▶▶

● لطف الرحمٰن

مختصر حالات

آبائی وطن دربھنگہ ضلع کا ایک گاؤں ہے۔ ۲/فروری ۱۹۴۱ء کو سارن (چھپرا) ضلع کے ایک دیہات بنیاپور میں پیدائش ہوئی۔ والد مرحوم و مغفور وہاں اسکول میں ملازم تھے۔ ۱۹۴۶ء کے فرقہ وارانہ فساد میں سارن ہمیشہ کے لئے چھوٹ گیا۔

میں نے ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں موضع ریوڑھا میں رشتے کے ایک بزرگ مولوی نورالحسن مرحوم مغفور سے حاصل کی۔ وہ ریٹائرڈ کانسٹبل تھے۔ بے حد جابر و قاہر اُستاد۔ ذرا سی غلطی پر سارا بدن لہولہان کر دیتے۔ اُردو، فارسی، ہندی، انگریزی اور حساب کی تعلیم ان سے حاصل کی۔ گلستاں مکمل اور بوستاں کا نصف ان سے پڑھا۔ ۵/سال کی عمر میں آمد نامہ اور فارسی قواعد پر اچھی خاصی مہارت حاصل کر لی تھی۔ میرے گاؤں میں پرائمری اسکول کھلا۔ اسکول مدرسہ ہی کی عمارت میں چل رہا تھا۔ مولوی صاحب مغفور نے میرا داخلہ چوتھے کلاس میں کرا دیا۔ مگر داخلہ برائے نام تھا۔ تعلیم انھیں سے حاصل کرتا رہا۔ محض ہندی، اسکول کے ایک گرو جی شری سورج دیو چودھری سے پڑھتا تھا اور کبھی کبھار حساب بھی۔ یہ گرو جی ان سے زیادہ جابر و قاہر نکلے۔ اس زمانے میں خلوص دل سے ان دونوں کی موت کی دعائیں کرتا تھا۔ آج مولوی نورالحسن صاحب نہیں رہے۔ مگر جب بھی گرو جی سے ملاقات ہو جاتی ہے، لگتا ہے ایک نعمت لازوال ملی۔ آج بھی ان کی شفیق دعائیں زندگی کا سب سے قیمتی سرمایہ ہیں۔ بستی سے اَپر پرائمری امتحان پاس کرنے کے بعد بستی سے دو میل دور موضع جالہ کے مڈل اسکول میں درجہ ششم میں داخلہ لیا۔ وہاں ہندی کے استاد ایک پرانے کانگریسی مسلمان تھے۔ وہاں سے مڈل کرنے کے بعد مسلم ہائی اسکول لہیریا سرائے دربھنگہ میں درجہ ہشتم میں داخلہ لیا۔ بائیلوجی کا طالب علم تھا۔ ۱۹۵۷ء میں میٹرک پاس کیا۔ آئی۔ ایس۔ سی کرنے کے بعد میڈیکل سائنس پڑھنے کا ارادہ تھا مگر قدرت کو منظور نہ تھا۔ میں نے ۱۹۶۱ء میں بہار یونیورسیٹی سے بی۔ اے۔ آنرس (اردو) میں طلائی تمغہ حاصل کیا اور پٹنہ یونیورسیٹی میں ایم۔ اے اردو میں داخلہ لیا۔ علیم اللہ حالی، ظفر اوگانوی، قمر اعظم ہاشمی، علی حیدر ملک، عصمت آرا اور عبدالغنی وغیرہ تیں طلبا و طالبات میں نمایاں حیثیت و اہمت رکھتے تھے۔ یہ سب کے سب بے حد ذہین اور محنتی لوگ تھے۔ ہم لوگ ایک دوسرے کے حریف بھی تھے اور حلیف بھی۔ اساتذہ کرام ڈاکٹر اختر اورینوی اور علامہ جمیل مظہری جیسی مشہور و معروف ہستیاں تھیں۔ بہر کیف! ۱۹۶۳ء میں اردو میں اور ۱۹۶۴ء میں ایم۔ اے فارسی میں میں نے طلائی تمغے حاصل کئے۔ ۶۶۔۱۹۶۴ء تقریباً دو سال یو۔ جی۔ سی جونئر

ریسرچ فیلو رہا۔ ۱۹۶۶ء میں ٹی۔این۔بی کالج میں اردو لکچرار کی حیثیت سے تقرری ہوئی۔ اس سال یعنی ۱۹۷۱ء کے ماہ ستمبر میں راسخ عظیم آبادی بحیثیت غزل گو کے موضوع پر پٹنہ یونیورسیٹی سے پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔

شعر گوئی سے دلچسپی کالج کے زمانے میں پیدا ہوئی۔ مگر باضابطہ طور پر اس کی ابتدا ۱۹۶۴ء میں ہوئی۔ اس کے پہلے کبھی کبھار شباب شمسی کے نام سے لکھتا تھا۔ اس دور میں بعض شعری تخلیقات اور چند نثری مضامین رسائل میں شائع بھی ہوئے۔ ۱۹۶۶ء میں اپنے نام (لطف الرحمٰن) سے لکھنا شروع کیا مگر ۶۷۔۱۹۶۶ء میں تقریباً چپ کے دیار میں رہا۔ بہت کم تحریر کر سکا۔ رسائل و جرائد میں کبھی کبھار ہی کوئی تخلیق شائع ہوتی۔ ۱۹۶۸ء سے باضابطہ طور پر یہ سلسلہ جاری ہے۔ گہ گہے فارسی میں بھی اشعار کہتا تھا۔ فارسی میں ایک طویل نظم بھی کہی تھی، مگر اب ہندوستان میں فارسی زبان دانی کا ذوق رکھنے والے کم ہی نہیں بہت کم رہ گئے ہیں۔ اس لئے فارسی شعر گوئی کی طرف ایک عرصے سے توجہ نہیں ہوئی۔ ویسے فارسی شعرا کا کلام زیر مطالعہ رہا ہے۔ فارسی شعرا میں حافظ کے بعد خیام و بیدل کا پرستار ہوں۔ فارسی کے غزل گو شعراء میں حافظ، سعدی، خسرو، عرفی، نظیری، فیضی اور غالب کو بھی بے حد پسند کرتا ہوں۔ اقبال کے فارسی کلام کا بھی رسیا ہوں۔ خصوصاً 'زبور عجم' کا۔ البتہ فارسی کے قصیدہ نگار شعراء نے کبھی اپیل نہیں کیا۔ حالانکہ انوری، خاقانی، اور ظہیر فاریابی کی عظمت کا معترف ہوں۔ مثنوی نگار شعراء میں فردوسی اور نظامی پسندیدہ شعراء ہیں۔ جدید فارسی شعراء کا مطالعہ کم کیا ہے۔ شاید اس لئے بھی کہ اس شہر میں کتابوں کا حصول مشکل ہی نہیں، ناممکن ہے۔

دوسری زبانوں میں چونکہ مختصراً انگریزی سے واقف ہوں اس لئے انگریزی کے واسطے سے مغربی ادبیات کو سمجھنے کی حتیٰ المقدور کوشش کرتا ہوں۔ قدیم اور جرمن زبانوں کے نہیں جاننے کا افسوس ہے۔ حقیقتاً گلدستہ اردو ادب کا لطف کچھ انھی زبانوں میں سے ہے۔ ان دنوں جدید مغربی ادب کے تقاضوں کو سمجھنے کی کوشش میں ہوں۔ فرنچ سیکھنے کی بھی کوشش کی تھی مگر میری غیر مستقل مزاجی اور کاہلیت سد راہ ہوئی۔

سیاست سے دور رہتا ہوں خواہ کسی قسم کی ہو۔ حالانکہ مطالعہ کے علاوہ شطرنج کھیلنا میری دوسری ہابی ہے۔ دوستی کم لوگوں سے ہے مگر جن سے ہے بے حد مخلصانہ۔

جدیدیت کو ایک رجحان سمجھتا ہوں اور وقت کا تقاضہ۔ یہ مغربی ملک سے اسمگل کی ہوئی کوئی چیز نہیں سو ہر صدی کے ساتھ ہر دہائی اپنے تمام فیوض و برکات اور اپنی تمام نعمتوں کے ساتھ حقیقتاً جدید ادب ہی میں منعکس ہو رہی ہے۔ جو لوگ اس کے مخالفین ہیں ان کے متعلق بس یہ رائے رکھتا ہوں.....ع

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو

مجھے یقین ہے کہ جب آٹھویں اور نویں دہائی اور اس کے بعد کا ادب ان کے سامنے آئے گا تو اس وقت جدید ادب کے ہی مخالفین آج کے ادب کو کلاسکس کا درجہ دیں گے۔ (بشکریہ ڈاکٹر ارشد رضا، مدیر اندیشہ، بھاگلپور)

◀◀ ● ▶▶

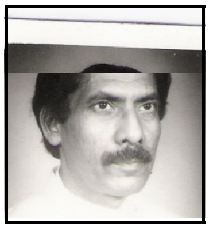

● ڈاکٹر منظر اعجاز

لطف الرحمٰن اور تازگی برگِ نوا کا فکری و معنوی تناظر

پروفیسر لطف الرحمٰن کی ادبی شخصیت کئی جہتوں پر مشتمل ہے۔ ان میں دو جہتیں بہت ہی نمایاں رہی ہیں۔ ان دو جہتوں میں ایک جہت نقاد کی اور دوسری شاعر کی ہے۔ شاعری میں بھی انھوں نے اپنی تخلیقی جولانیوں کو غزل کی تنگنائے تک محدود نہیں رکھا ہے۔ انھوں نے نظمیں بھی کہیں ہیں اور نظموں میں بھی انہماک اور خلوص سے کام لیا ہے، جو ان کی غزلوں کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔ میں یہاں ان کے مجموعۂ غزل 'تازگیٔ برگ نوا' کے حوالے سے مختصر سی گفتگو کروں گا۔ کیوں کہ ان کی غزلوں کے اور بھی مجموعے ہیں اور ان سبھوں پر بیک وقت نظر ڈالنا تنگ صفحات اور مختصر اوقات میں ممکن نہیں بلکہ میں تو یہ بھی سمجھتا ہوں کہ 'تازگیٔ برگ نوا' کا بھی بالاستیعاب مطالعہ اور تجزیہ ممکن نہیں کیوں کہ ان کے اشعار کی تہدار اور گہری معنویت اور فنی اقتدار کے اسرار و رموز سے عہدہ برآ ہونا اس قدر آسان نہیں جس قدر غزل کے عمومی رجحان کی تفہیم و تعبیر آسان ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر پہلے یہ تین شعر دیکھیں ؎

روتے روتے بھی تو تھک جاتا ہے انساں اک دن — بجھ ہی جاتے ہیں ستارے بھی سحر سے پہلے

کیا پتہ کس دشت کی تہہ میں ہو در یا موجزن — ہیں لبِ اظہار کے اپنے بھی پیرائے بہت

جن کی چوٹوں سے لہو رسنے لگے احساس کا — ہم پہ اس دنیا نے ایسے پھول برسائے بہت

یہ تینوں اشعار ایک فکری اور معنوی وحدت میں پروئے ہوئے ہیں اور اس فکری، معنوی وحدت کی تشکیل میں جس تصور نے اہم ترین کردار نبھایا ہے، وہ ہے 'پھول کی چوٹ' اور اپنے لفظیاتی اور ساختمانی لحاظ سے یہ تصور بھی بکھرا ہوا ہے۔ تیسرے شعر کے پہلے مصرع میں 'چوٹ' صیغۂ جمع ہے۔ 'چوٹوں' اور دوسرے مصرع میں 'پھول' کا لفظ آیا ہے یعنی پھول کی چوٹ بھی بہ لحاظ ترکیب بالترتیب نہیں ہے۔ اس سے پہلے شعر اسی غزل کا ہے۔ جب کہ ان تین شعروں کے سیٹ میں پہلا شعر کسی اور غزل کا ہے۔ یہاں میرا مفروضہ تصور 'پھول کی چوٹ' شاعر کا کلیدی تصور ہے۔ یہاں میں واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میرے قارئین یا خود شاعر میرے اس مفروضے سے متفق ہوں۔ یہ ضروری نہیں۔ میرے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ میں کوئی معقول جواز پیش کر سکوں۔

ہماری کلاسیکی روایت میں 'پھول کی چوٹ' اکثر پتھر سے زیادہ کاری ثابت ہوئی ہے۔اس کا احساس صاحب سیف کو بھلے ہی نہ ہو لیکن اہل دل کو شدید طور پر ہوتا رہا ہے۔اور شاعری میں تو احساس کی اپنی نزاکت اور جذبات کی شدت نے وہ وہ رنگ نکھارے ہیں، وہ وہ خوشبو بکھیری ہے جس سے مشامِ قلب وروح تک معطر ہوتے رہے ہیں اور یہی جمالیاتی کیف کی سحر طرازیوں کا سرچشمہ رہے ہیں۔مزید وضاحت کے لئے ایک واقعہ نقل کرنا چاہتا ہوں جو پروفیسر شکیل الرحمٰن کی کتاب 'رومی کی جمالیات' سے ماخوذ ہے۔شکیل صاحب رقم طراز ہیں:

''رقص کرتے ہوئے حسین ابن منصور الحاج سوئے دار جا رہے تھے، انہیں، انا الحق، کہنے کی سزا ملنے والی تھی۔جو لوگ وہاں کھڑے تھے وہ ان پر پتھر پھینک رہے تھے۔منصور لہولہان تھے، لہو کے پیکر بن گئے تھے۔'انا الحق' کی آواز ان کے رقص کا آہنگ .....دونوں ایک دوسرے میں جذب تھے، لہو کے چھینٹے اس آواز کے ساتھ ادھر ادھر بڑی تیزی سے پڑ رہے تھے 'انا الحق انا الحق' وہ ہنستے جا رہے تھے۔ان ہی لوگوں کے درمیان جو وہاں کھڑے پتھر پھینک رہے تھے، ایک شخص تھا جو منصور کو بخوبی جانتا تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔سوئے دار جاتے ہوئے وہ رقص کیوں کر رہے ہیں اور یہ بھی جانتا تھا کہ انا الحق' کی آواز کیوں گونج رہی ہے۔وہ جانتا تھا منصور بے قصور ہیں۔حسین ابن منصور الحاج وہاں ہیں کہاں، وہاں تو صرف اللہ، کی آواز ہے۔منصور کا رقص تو اس آواز کا مترنم تحرک ہے، اس آواز سے جو جو سرمستی پیدا ہوتی ہے اس کا متحرک نقش ہے۔وہ شخص جوان لوگوں کے درمیان کھڑا تھا.....جو پتھر پھینک رہے تھے۔آگے بڑھا اور اس نے آہستہ سے ایک خوبصورت پھول منصور کی جانب پھینک دیا۔اور گم ہو گیا لوگوں کے درمیان .....خوفزدہ تھا، کوئی دیکھ نہ لے پتھروں کی بارش میں پھول کس نے پھینکا ہے۔حسین ابن منصور الحاج جو سنگ باری کے درمیان لہولہان تھے۔جو رقص کرتے ہوئے اپنی زندگی کا سب سے خوبصورت جشن منا رہے تھے۔جو مسلسل ہنس رہے تھے۔ہنستے جا رہے تھے۔اچانک خاموش ہو گئے۔اور پھر ان کی آنکھوں سے آنسو کے قطرے ٹپکنے لگے۔''

مزید وضاحت سے بخوفِ طوالت احتراز کیا جاتا ہے لیکن اس امر کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ پتھر کی چوٹ سے لہولہان جسم عالم وجد میں رقص فرماتا ہے جب کہ 'پھول کی چوٹ' سے رقص حیات نہ صرف یہ کہ تھم جاتا ہے بلکہ آنکھوں سے آنسو کے قطرے ٹپکنے لگتے ہیں۔پاس کھڑے لوگوں میں سے کسی کے استفسار پر منصور بتاتے ہیں کہ پھول پھینکنے والا شخص جانتا ہے کہ منصور بے قصور ہے۔پھول پھینک کر اس نے اسی حقیقت کا اظہار کیا لیکن یہ حوصلہ نہ کر سکا کہ لوگوں سے کہے کہ منصور بے قصور ہے۔پتھر پھینکنے والے تو معصوم اور حقیقت حال سے بے خبر ہیں۔

اس معنوی تناظر میں شعر زیر بحث کی قرأت نہ صرف مکرر اور سہ کرر کی تحریک دیتی بلکہ وجد کی کیفیت بھی پیدا کر دیتی ہے۔دل کی سونی بستی خروشِ مستی سے جلوۂ طور اور معمورۂ نور بن جاتی ہے۔ہمدرد یوں کے تیر سے بھی ایسا ہی خروش پیدا ہوتا ہے۔زخم انگارہ نہیں پھول بن جاتا ہے اور اس کی خوشبو حیات ابد کا نشہ بن کر وجود پر چھا جاتی ہے شعر زیر بحث کے یہ معنوی تسلسل میں یہ شعر ملاحظہ ہو۔

ہمدردیوں کے تیر سے زخمی نہ کر مزید — ہم نے تو خود چنی تھیں یہ راہیں ببول کی

اسی غزل کے چند اشعار اور بھی دیکھیں:

اپنے لہو سے شام کو سیراب کر دیا — دن بھر کے انتظار کی قیمت وصول کی
بکھرا کچھ اس طرح ہے ہر اک ذرۂ وجود — صورت نہیں ہے کوئی بھی اپنے حصول کی
خوشبو کی طرح ہم ہیں خرابی میں دہر کی — یہ شاخِ گل پھلی تھی فضاؤں میں دھول کی

حیات اس کائناتِ رنگ و بو کے اُلجھیڑوں میں ہر لمحہ الجھی رہتی ہے گویا ارتقائے حیات کی راہ میں یہ کائنات اپنے تمام مظاہر و موجودات کے ساتھ مزاحم ہوتی ہے لیکن یہی حیات کی داخلی توانائی کو بھی ابھار دیتی ہے چنانچہ حیات جو مرتکز بالذات انا ہے، زحمت کسِ پیکار ہوتی ہے تا کہ راہ کی رکاوٹوں کو دور کر سکے یا ان رکاوٹوں پر قابو پا سکے۔قدر آزمائی کے مرحلے میں حیات متنوع تجربات اور بوقلموں کیفیات سے گذرتی ہے اور انہیں تجربات و کیفیات کا موثر اظہار شاعری ہے جس میں فتح کا جشن اور شکست کا ماتم بھی ایک ہی ساز کا مختلف اور متضاد آہنگ ہوتے ہوئے وجد آفریں وحدتِ تاثر کا حامل ہوتا ہے۔دھوپ اور چھاؤں کی آنکھ مچولی اہل نظر کے لئے زندگی کا استعارہ بن جاتی ہے۔اور رنج و راحت کی کشمکش زندگی کو لذت گیر بنا دیتی ہے۔حیات کے سفر میں یہ مقامات سرگرانی عبوری ہوتے ہیں کہ ایک ہی حالت پر ہمیشہ کوئی چیز قائم نہیں رہتی۔اگر ایسا ہو تو یکسانیت زندگی کے لئے ایک مسلسل عذاب بن جائے۔یہی احساس زندگی کے برگ و بار کو تازگی عطا کرتا ہے، نخلِ آرزو موسم خزاں سے گزرنے کے باوجود امید نو بہار سے دستبردار نہیں ہوتا۔یہی امید و یقین اور آرزومندی اس کائنات رنگ و بو میں حیات کو سرفرازی عطا کرتی ہے۔کیونکہ زندگی میں حرکت اور حرارت اسی کے دم سے ہے اور حرکت و حرارت ہی زندگی کی اصل ہے۔

دشت غربت میں بھی آرام سے رہنے نہ دیا — سر بلندی نے کہیں چین سے جینے نہ دیا
شرط رکھ دی کہ کوئی زخم کا ٹانکا نہ کھلے — اس نے ہنسنا تو کجا، ٹھیک سے رونے نہ دیا
کس نے شبنم مری راہوں میں بچھا دی ایسے — میرے دریا سے مجھے پار اترنے نہ دیا

اس طرح ایک تجاہل عارفانہ کے باوجود عرفان ذات اقدار حیات کی نمو پذیری کا ضامن بن

جاتا ہے۔رنج بھی راحت کا سامان فراہم کر دیتا ہے۔

نڈھال کر گئی ہم کو بھی یہ مسافتِ شب — لہو لہان ہوا صبح کا ستارہ بھی
ایک اک کر کے ببولوں کو بھی نیند آ ہی گئی — دشت بھی ڈوب گیا اپنی ہی ویرانی میں
دل کو طاؤسِ قناعت پہ بٹھا رکھا ہے — سربلندی تو ملی بے سر و سامانی بھی
اک سکوتِ رنگ ہے سیل صدا کی گود میں — ایک قصر خامشی ہے مرکز کہرام بھی

لطف الرحمٰن کی گہری نظر جدیدیت کی فلسفیانہ اساس پر بھی رہی ہے۔اس فلسفے کی تفہیم وتعبیر میں بھی انھوں نے اپنی انتقادی قوت وصلاحیت صرف کی ہے۔غالباً یہی وجہ ہے زندگی اور اس کے اسرار و رموز کی تعبیر وتفہیم میں بھی ان کا وزن قدرے مختلف رہا ہے جس سے اظہار کے پیرائے اور بیان کے اسلوب بھی متاثر رہے ہیں۔اس دور کے تخلیقی رجحان نے دل کی تاریک راہوں کی مسافت طے کی ہے اور حزنیہ حساس سے دامن خیال کو مزین کیا ہے۔لیکن مایہ دار فنکاروں نے اپنے میلانِ طبع کے مطابق اسی میں اپنی انفرادیت کے نقوش بھی اُبھارے ہیں۔چنانچہ داخلی رنگ اور عمومی آہنگ کے باوجود لطف الرحمٰن کے حزنیہ احساس کا ترنگ کچھ اور ہی منظر پیش کرتی ہے جو اپنے جذب وکشش میں بے مثال بھی ہے اور لازوال بھی۔

برف کی تہہ میں شرر کی جستجو کرتے رہے — ہم اسیر شب سحر کی آرزو کرتے رہے
کوئی کس دل سے پڑھے اپنے لہو کا لکھا — دے دیا کس نے مرا نامۂ اعمال مجھے
اپنے قدموں میں وہی خاک کی زنجیر رہی — لے تو آئے تھے خلاؤں میں پرو بال مجھے
اب اسی سے ہے بچھڑنے کی تمنا جس سے — ایک لمحے کی جدائی تھی کئی سال مجھے
تیز رو بھی تھے رہِ عام سے ہٹ کر بھی چلے — لڑکھرائے تو زمانے نے سنبھلنے نہ دیا
ہم بھی بے سمت ہواؤں کے گل وبرگ ہوئے — شاخ پہ ٹھہرے ذار دیر کو مہمانی کی
پڑھ کے تحریر ہوس آنکھوں میں وہ بھی تھے خموش — ہم بھی سادہ دل تھے ذکر رنگ وبو کرتے رہے

زندگی کے نو بہ نو تجربات اور متنوع کیفیات میں حزنیہ احساس نمایاں ہے جس میں ایک خاص ترنگ بھی ہے۔انفعالیت کے رنگ کے ساتھ ساتھ فعالیت کا آہنگ بھی ہے۔ظاہر ہے کہ زندگی کوئی جامد شئے نہیں، تحرک پذیر حقیقت ہے جس کے سفر میں مختلف النوع نشیب وفراز آتے ہیں اور حساس طبائع پر اس کے گہرے اثرات بھی مرتسم ہوتے ہیں جن سے شکست آرزو کا منظر نامہ بھی مرتب ہوتا ہے اور وہ حوصلہ شکن بھی ہوتا ہے۔اس صورتِ حال میں زندگی کرنے کا حوصلہ پیدا کر لینا، جینے کا ڈھب نکال لینا بڑی بات ہے۔زندگی کے سفر میں مصائب وآلام کا سلسلہ دراز ہو سکتا ہے، یہ بعید از امکان نہیں، تاہم شاعر حوصلہ شکن

نہیں ہوتا۔وہ زندگی کے مشکل مرحلوں سے گزرنے کے لئے خود کو ذہنی سطح پر آمادہ کرتا ہے۔وہ جذبۂ ترحم سے خود کو مغلوب نہیں ہونے دیتا۔ذہنی اور فکری لحاظ سے غالباً وہ اس تصور کا قائل ہے کہ جذبۂ ترحم اگر غالب آجائے تو غنیم کا پلڑا بھاری ہو جاتا ہے۔ایسی صورت میں زندگی کی جنگ بشاشت کے ساتھ نہیں لڑی جا سکتی۔اس لئے وہ کسی سہارے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کرتا نہ کسی سہارے کو خاطر میں لاتا ہے۔البتہ وہ اپنی ذاتی قوت اور انفرادی صلاحیت کی افزودگی کی طرف سے غافل نہیں ہوتا کیوں کہ بالآخر یہی چیزیں کام آئیں گی لیکن وہ ضبط وتحمل سے کام لیتا ہے۔

میری راہوں میں ستارے نہ بچھاؤ کہ مجھے — منزلیں چھوڑ گئیں راہ گزر سے پہلے
بند ہونٹوں میں یہی سوچ چھپی بیٹھی ہے — زخم چیخے نہ کوئی دیدۂ تر سے پہلے
پھر کڑے سورج کے صحرا سے گزرنا ہے ہمیں — یہ گھنا سایہ بھی اک سیل ہوا لے جائے گا
ایک بے معنی سفر میں وہ بہت خالی ہوا — اب جہاں جائے گا اندر کا خلا لے جائے گا

زندگی کی جدوجہد میں غنیم سے نبرد آزمائی کا مرحلہ اور بھی سخت ہو سکتا ہے۔یہ جنگ اور بھی شدت اختیار کر سکتی ہے چنانچہ مستقبل کے امکانات پر نظر رکھتے ہوئے شاعر کہتا ہے۔

دشتِ شب میں کام آئیں گے یہی اپنے چراغ — اپنی کرنوں کا یہ سورج قافلہ لے جائے گا

اس نے یہ حکمت عملی بھی اختیار کر رکھی ہے کہ۔

راکھ کے ڈھیر میں کرنوں کو چھپا رکھا ہے

اس لئے متیقن ہے کہ۔

آگ اٹھے گی کسی دن مرے گھر سے پہلے

میرے خیال میں یہ خیال تمام تر درست نہیں کہ جدیدیت کے رجحان نے معاشرتی اذہان کو مریضانہ کیفیت میں مبتلا کیا اور یاسیت وقنوطیت کی فضا تعمیر کی۔البتہ یہ ضرور ہوا کہ ردِعمل کا طریقۂ کار بدل گیا۔اسلوب اور لہجے میں تبدیلی آئی لیکن کارزار حیات سے فرار کا ایسا میلان یہ استثنائے چند، رونما نہیں ہوا جس کے لئے اس دور کے تمام شعرا اور ان کی شاعری کو رد کر دیا جائے۔مثال کے طور پر لطف الرحمٰن کے یہ اشعار دیکھے جا سکتے ہیں۔

میری آواز کے سورج کو بجھانے والو — اک لہوٹانک دے ہر صبح کی پیشانی میں
دن کا شہزادہ تو سویا شام کے تابوت میں — سرخ ہے سورج کا چہرہ زردئی انجام پر

علامتی پیرائے اور استعاراتی اسلوب میں جس معنیاتی فضا کی تشکیل وتعمیر کی گئی ہے اس میں ندرت

بھی ہے اور جدت بھی اور بھرپور توانائی بھی اس لئے یہ حسین بھی ہے اور پرتاثیر بھی۔ بعض اشعار کی تشبیہیں بھی خصوصی طور پر متوجہ کرتی ہیں۔ یہی نہیں یہ شاعر کی فنکاری یا فنی سلیقہ شعاری کا جواز بھی پیش کرتی ہیں ۔

پتے پتے کا لہو دور کا موسم پی گیا　　شاخِ گل تصویر ہے گویا کسی بیماری کی
کون شبنم کا بدن لے کے ادھر سے گذرا　　سینۂ گل پہ یہ قدموں کا نشاں کیسا ہے

ان اشعار میں تراکیب اور پیکر تراشی کا حسن جداگانہ اور فزوں تر ہے۔

لطف الرحمٰن کے شاعرانہ وجدان اور فنکارانہ بصیرت نے الفاظ کو صرف مشخص ہی نہیں کیا ہے بلکہ الفاظ کی شخصیت کو بھی بے نقاب کیا ہے اور یہ خود اپنی شخصیت کے اظہار کے لئے ضروری تھا۔ شخصیت وہ جو ایک منفرد شاعر کی شخصیت ہے، ایک ممتاز فنکار کی شخصیت ہے اور شاعری وہ آئینہ خانہ ہے جس میں اس کی شخصیت کے جلوۂ صد رنگ کا عکس ابھرتا ہے۔ شاعر کو شاعری کے فنی رموز و اسرار کا جہاں ادراک ہے، وہیں اپنی ذات اور کائنات کا بھی عرفان بدرجۂ اتم ہے ۔

شخصیت الفاظ کی جب سے ہوئی ہے بے نقاب　　کچھ کمی آئی ہے مجھ میں جرأت اظہار کی

اس لئے بیبا کی برہنہ گفتاری کی سرحد میں داخل نہیں ہوئی ہے۔ اس کے اظہار کے پیرائے نے ایما و اشارہ اور علامت و استعارہ کی زبان اختیار کر لی ہے۔

دستخط کر کے ہواؤں نے کہاں ڈال دیا　　دربدر اڑتا ہوا صفحۂ جاں کیسا ہے

کائنات میں حیات کی پریشانی اور بے سروسامانی کی نوحہ خوانی کوئی نیا موضوع نہیں ہے باوجود اس کے یہ ایک آفاق گیر مسئلہ رہا ہے اور اہل دانش و بینش مختلف انداز و اسلوب میں اس مسئلے پر اظہار خیال کرتے رہے ہیں۔ لیکن لطف الرحمٰن نے جس انداز و اسلوب میں اس آفاقی مسئلے کو فنی اظہار کا پیرایہ عطا کیا ہے، وہ اچھوتا اور ندرت و جدت کی منتہا کو چھوتا ہوا نظر آتا ہے۔ مشق کے نہ جانے کتنے مراحل سے گزرنے کے بعد ایسی فنی مہارت حاصل ہوتی ہے۔ اسے میں مرحلۂ شوق سے تعبیر کرتا ہوں لیکن یہ بھی ایک زاویۂ خیال ہے۔ ویسے لطف الرحمٰن صاحب کے نقطۂ خیال کا معاملہ برعکس نظر آتا ہے۔

فن بھی ہے دانستہ سانسوں کو گھٹا لینے کا نام　　جو بھی آئے گا یہاں اپنی سزا لے جائے گا

بہرحال جدید تر غزل کے منظرنامے میں لطف الرحمٰن صاحب کا شناس نامہ منفرد رنگ اور ممتاز آہنگ کا حامل نظر آتا ہے۔ یہاں صرف برگ نوا کی تازگی ہی نظر نہیں آتی اس سے گزرنے والے تازہ ہواؤں کے جھونکے کا فرحت بخش اور جانفزا لمس بھی محسوس ہوتا ہے۔

◀◀ ● ▶▶

Head, P.G.Department of Urdu A.N.College,Patna
Mob: +91 9431840245

● لطف الرحمٰن

ستیہ پال آنند کی نظم 'مخنث، بے نمود، لاولد دھرتی' کی عملی تنقید

مکرمی: آداب
پروفیسر ڈاکٹر لطف الرحمٰن خاص نمبر کے لئے مجھے اپنے ریکارڈ سے ان کا یہ عملی تنقید کا مضمون ملا۔ یہ مضمون موصوف نے دہلی ساہتیہ اکاڈمی کے سیمینار میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے گیسٹ ہاؤس میرے ساتھ ایک ملحقہ کمرے میں قیام کے دوران ایک رات میں قلمبند کیا تھا۔ ان کا تحریر کردہ نوٹ بھی شامل ہے۔
شاید آپ اسے ثالث میں مرحوم و مغفور دوست کی شان کے شایان سمجھتے ہوئے جگہ دے سکیں۔
شکریہ
ستیہ پال آنند (۱۷/مارچ ۲۰۱۴ء بذریعہ ای میل)

نوٹ:

ڈاکٹر ستیہ پال آنند صاحب اور یہ ناچیز دہلی میں ساہتیہ اکاڈمی کے منٹو سے متعلق سیمینار کے موقع پر جامعہ ملیہ کے نہرو گیسٹ ہاؤس میں آمنے سامنے کمروں میں ٹھہرے ہوئے تھے اور شام کو جب ان کے کمرے میں محفل جمتی تھی تو کچھ اور دوست بھی شامل ہو جاتے تھے۔ اردو شاعری کے بارے میں جب ایک بار اس موضوع پر بات چیت ہوئی کہ غزل سے نظم آج تک اپنا دامن بچا نہیں پائی۔ غزل کی طرح اس میں بھی ماضی ہی ماضی ہے۔ زمانۂ حال کبھی کبھی اپنی شکل دکھاتا ہے لیکن مستقبل تو بالکل ہی عنقا ہے، تب ڈاکٹر آنند نے اپنی یہ نظم سنائی اور کہا کہ مستقبل عموماً اطوپیا کی ممکنہ صورت ہی پیش کرے گا لیکن ان کی یہ نظم آلڈس ہکسلے Aldous Huxley کے مشہورِ زماں انگریزی ناول Brave New World کی طرح Anti-Utopia ہے۔ میں نے اسی وقت ان سے ''کتاب نما'' کا وہ شمارہ لے لیا، جس میں یہ نظم شامل تھی۔ اور وعدہ کیا کہ دہلی سے واپس امریکا جانے سے پیشتر اس پر لکھا ہوا عملی تنقید کا مضمون آپ کے ہاتھوں میں ہوگا۔ یہ مضمون اسی رات لکھا گیا اور دوسری صبح آنند صاحب کے لیپ ٹاپ پر ہی انسائکلو پیڈیا سے حوالہ جات چیک کرنے کے بعد ان کے ہاتھوں میں تھما دیا گیا۔

۔لطف الرحمٰن۔ (دہلی، نومبر 2012ء)

مخنث، بے نمو، لاولد دھرتی

نظر اوپر اٹھائیں، تو بھی دیکھیں کیا؟
کہ بادل کے تھنوں کی تھیلیوں میں
شیرِ مادر ایک قطرہ بھی نہیں/سوکھی ہوا ہے
خشک آہیں، امتلا، اکراہ کی اک گھن گرج سی ہے
منغض ناگواری ہے! /کڑکتی بجلیوں کی شعلہ سامانی
پریدہ رنگ ہے، ان کی کڑک جیسے
کسی گونگے کی ہکلاہٹ، گلوگیری سی رِیں رِیں ہے۔
کہاں سے پانی برسائیں، ''گھٹا گھنگھور'' کی آنکھوں میں کانٹے ہیں!
نظر نیچے جھکائیں تو بھی دیکھیں کیا؟
کہ اس تشنہ دہاں دھرتی کے جوف و جوع کے مابین اب کچھ بھی نہیں باقی
یہی لگتا ہے کوئی راکھ کے نیچے پھنسا ہو موت کے منہ میں
نفسِ واپسیں کی کھڑکھڑاتی ہچکیوں میں مر رہا ہو وقت سے پہلے
نمو سے سربسر عاری خرابہ/راکھ کے اڑتے بگولے
دور تک اک روہڑی، سنسان ویرانہ
مخنث، بے نمو، لاولد دھرتی، نسل کش ناکارگی.../اور میں!
یہ میری آنکھ ہے کیا جو/زمان و وقت کے جریان سے آگے پہنچ کر
نیچے اوپر دیکھتی ہے؟ راکھ کے اڑتے بگولے ارض پر
بادل کے بنجر بانجھ ٹکڑے آسماں میں...
ہاں، یہ میری آنکھ ہے جو پیش بیں ہے، غیب کے احوال کی واقف!
نہفتہ داں میں سب کچھ دیکھتا ہوں....
آنے والے دور میں کیا ہونے والا ہے/میں سب کچھ جانتا ہوں!! (2008ء)

اطوپیا (Utopia) اردو کے لئے نیا لفظ ہے۔ اس کا اردو نعم البدل نہیں ہے، کیونکہ یہ ایک ناول کا عنوان ہے جو 1516ء میں سر ٹامس مور Sir Thomas More نے تحریر کیا۔ اس میں ایک فرضی جزیرے کے سماجی، معاشی، معاشرتی نظام کا نقشہ کھینچا گیا ہے جو سیاسی اور سماجی مساوات پر مبنی ہے۔ یہ ایک ایسی فلاحی ریاست ہے، جہاں سب لوگ امن سے رہتے ہیں۔ اس کے بعد یورپ کی مختلف زبانوں میں کئی اور کتابیں ایسی لکھی گئیں، جن میں اسی موضوع پر مبنی خیالی مملکتوں کا نقشہ تھا۔ پہلی اور دوسری جنگِ عظیم کے وسطی برسوں میں البتہ Anti-Utopia کا تصور بھی پیش ہوا اور ہکسلے کے علاوہ جارج آرویل نے Animal Farm اور 1984، دو ناول لکھ کر اس صنف کو فروغ دیا۔

ڈاکٹر ستیہ پال آنند صاحب کی نظم مختصر ہے، لیکن اجزائے ترکیبی کے آپس میں مضبوطی سے جُڑے ہوئے ہونے کی وجہ سے compact جسامت رکھتی ہے۔ صرف ستائیس سطروں میں شاعر نے نہ صرف ایک منظر نامہ ترتیب دیا ہے، جو قاری کے سامنے ایک مکمل graphic تصویر پیش کرتا ہے، بلکہ نظم کے عین وسط میں گریز کی سطر تک پہنچتے ہی شاعر خود اعلانیہ بنفسِ نفیس جیسے نظم کے میدان میں کود کر وارد ہو جاتا ہے، اور اس دعویٰ کے ساتھ کہ شاعر ہونے کی وجہ سے وہ ''نہفتہ دان'' ہے اور مستقبل میں کیا ہونے والا ہے، پہلے ہی بتا سکتا ہے، اس تصویر میں مزید رنگ بھر دیتا ہے۔

نقشہ نویسی خطوط میں کی جاتی ہے، لیکن الفاظ میں عمل اقلیدس کا در آنا ایک ایسی تکنیک ہے، جس سے ستیہ پال آنند جیسا ہی کوئی ''لینڈ اسکیپ'' یا ٹیبلیو Tableau بنانے والا شاعر کامیابی سے عہدہ برا ہو سکتا ہے۔ پہلی کچھ سطروں میں 'زمین'، 'آسمان' اور اِن دو حدود کے درمیان 'ہوا' کی آؤٹ لائن ترتیب دی جاتی ہے، اسے تمثیلی اور ناقلانہ ماڈل میں تبدیل کیا جاتا ہے، اور پھر اس سے معانی اخذ کئے جاتے ہیں۔ شروع کا یہ ''بلیک اینڈ وہائٹ'' خاکہ ہر نئی سطر کے ساتھ elevation and projection کی تکنیک استعمال کرتے ہوئے کیمرے اور کیمکارڈر کی مدد سے تصویری بیانیہ میں ڈھلتا جاتا ہے، اور miniature (تصغیریہ) سے طائرانہ اسکایا گرافی panaoramic skiagraphy تک پہنچتے ہوئے ایک cosmic picture آفاقی تصویر پیش کرتا ہے۔

نظر نیچے جھکائیں تو بھی دیکھیں کیا؟
کہ اس تشنہ دہاں دھرتی کے جوف و جوع کے مابین اب کچھ بھی نہیں باقی
یہی لگتا ہے کوئی راکھ کے نیچے پھنسا ہو موت کے منہ میں
نفسِ واپسیں کی کھڑکھڑاتی ہچکیوں میں مر رہا ہو وقت سے پہلے

نمو سے سربسر عاری خرابہ
راکھ کے اڑتے بگولے
دور تک اک روہڑی، سنسان ویرانہ
مخنث، بے نمو، لاولد دھرتی، نسل کش ناکارگی...

یہ تو اس اُجاڑ خرابے کا ذکر ہے جس میں جوہری ہتھیاروں کی جنگ ہنستے بستے شہروں کو انہدام کی آخری حد تک پہنچا گئی ہے، جہاں نباتات اور حیوانات کا تخم تک مٹ گیا ہے۔ زندگی بیخ و بُن سے اکھڑ گئی ہے۔ نیستی اور فنا کا منظر نامہ ''روہڑی، سنسان ویرانہ'' سے تو ظاہر ہے ہی، لیکن تخم ریزی کے نام پر اس ویرانے کے پاس کیا ہے، اس کا مذکور ان الفاظ میں مستور ہے۔ ''مخنث، بے نمو، لاولد، نس کش، ناکارہ''... ایک وقت ایسا تھا جب زمین کی گود بھی حیوانی اور نباتاتی Life forms سے ایسے ہی آباد و شاداب تھی، جیسے کہ انسان کی، لیکن اس منظر نامے میں تو زمین ایک مخنث کی طرح ہے جو اولاد پیدا کرنے کے نا قابل ہو، لاولد ہے، اس میں نمو نہیں ہو سکتا۔ ہر طرف نسل کشی کا دور دورہ ہے۔

اس سے پہلے آفاقی منظر نامہ ہے۔ جیسے کہ پہلے کہا جا چکا ہے۔ شاعر کا کیمرہ (تصویر اور آواز۔ دونوں کو ریکارڈ کرتے ہوئے) elevation and projection کے زاویوں سے کام لیتا ہے، اور projection کا یہ زاویہ upward ہے، زمین سے آسمان کی جانب ہے۔

نظر اوپر اٹھائیں، تو بھی دیکھیں کیا؟
کہ بادل کے تھنوں کی تھیلیوں میں
شیر مادر ایک قطرہ بھی نہیں
سوکھی ہوا ہے
خشک آہیں، امتلا، اکراہ کی اک گھن گرج سی ہے
منغض ناگواری ہے!
کڑکتی بجلیوں کی شعلہ سامانی
پریدہ رنگ ہے، ان کی کڑک جیسے
کسی گونگے کی ہکلاہٹ، گلوگیری سی رِیں رِیں ہے۔

تین مظاہر قدرت ہیں، جن کا تعلق زمین و آسمان کے درمیانی 'علاقے' سے ہے۔ یہ ہیں بادل، ہوا، اور کڑکتی بجلیاں... بادل مینہ برساتا ہے، جو شیر مادر سا ہے۔ دھرتی کے لیے امرت ہے۔ زمین کی ساری

ہریالی اس کے دم سے ہے۔ لیکن بادل کو 'ماں' کے استعارے کے ساتھ منسلک کرتے ہی یہ کہہ دیا گیا کہ اس کے ''تھنوں کی تھیلیوں میں شیرِ مادر ایک قطرہ بھی نہیں۔'' تھنوں کی تھیلیاں'' کم از کم میری نگاہ سے دیکھیں تو اردو شاعری میں پہلی بار استعمال میں لایا گیا ہے۔ صوتی یک آہنگی، تصویری یگانگت (تھ، تھ کی صوتیات، اور تھن اور تھیلیاں کی ہم شکل تصویر) کے علاوہ ''شیرِ مادر کا ایک قطرہ'' تک نہ ہونا، اور سوکھی ہوا کا اُس کی کرخت، درشت۔ کھرکھرے پن کی کریہہ الصوت آوازوں سے یہ تصویر باصری اور سمعی دونوں سطحوں پر قاری کو گرفت میں لے لیتی ہے۔

خشک آہیں، امتلا، اکراہ کی اک گھن گرج سی ہے

تیسرا قدرتی عنصر 'کڑکتی بجلیاں' ہیں، لیکن 'کڑکتی' کہہ چکنے کے بعد شاعر فوراً اس بات کی تردید کر دیتا ہے، کہ بجلیوں کی 'شعلہ سامانی'' اور ''بجلیوں کی کڑک''، ''پریدہ رنگ'' ہوتے ہوتے صرف گونگے کی ہکلاہٹ اور رونے کی آواز (''ریں، ریں'') ہے۔ گویا وہی بجلی جو چمک کر اور کڑک کر دھرتی کے باسیوں کے دلوں میں خوف بھر دیتی تھی، اب خود خوف زدہ ہے، گونگے کی طرح ہکلا رہی ہے، بے بس بچے کی طرح ریں ریں کر رہی ہے۔

اس مرکزی نقطۂ ارتکاز تک پہنچنے کے بعد گریز کا وہ سلسلہ شروع ہوتا ہے جس کے بارے میں پہلے کہا جا چکا ہے کہ نظم کا واحد متکلم، بیان کنندہ یا شاعر یکدم اپنے first person pronoun ''مَیں'' کے ساتھ نظم میں وارد ہو جاتا ہے۔ یہ سینار یو اس قدر ڈرامائی ہے کہ دیکھتے ہی بن پڑتا ہے۔ صرف ایک نعرۂ مستانہ سا سنائی دیتا ہے اور میں!

یعنی بربادی اور تحس نحس کے اس منظر کو دیکھنے والا، یا اس کا تصور کرنے والا مَیں یعنی شاعر ہوں۔ پھر فوراً ہی اس بات کا اعلامیہ ہمارے سامنے آتا ہے کہ شاعر ہونے کی وجہ سے مَیں پیش بین ہوں، نہفتہ دان ہوں، غیب کے احوال کا واقف ہوں۔ اس لیے اکیلا مَیں ہی یہ احوال نامہ لکھ سکتا ہوں جو ابھی ظہور پذیر نہیں ہوا ہے، یعنی وہ سینار یو جو نیوکلائی یا جوہری بموں والی جنگ کے تیس برسوں کے بعد ہونے والا ہے۔ اس کا نقشہ صرف (اور صرف) میں ہی کھینچ سکتا ہوں۔ اس بند کے مخفی معانی یہ ہیں کہ دنیا کے سیاست دان شاید اس خطرے سے آگاہ نہیں ہیں، لیکن ایک شاعر ہونے کی حیثیت سے میرا یہ فرض ہے کہ انہیں اس سے آگاہ کروں۔

یہ میری آنکھ ہے کیا جو
زمان و وقت کے جریان سے آگے پہنچ کر
نیچے اوپر دیکھتی ہے؟ راکھ کے اڑتے بگولے ارض پر

بادل کے بنجر بانجھ ٹکڑے آسماں میں...
ہاں، یہ میری آنکھ ہے جو پیش بیں ہے، غیب کے احوال کی واقف!
نہفتہ داں میں سب کچھ دیکھتا ہوں....
آنے والے دور میں کیا ہونے والا ہے
میں سب کچھ جانتا ہوں!!

'نیچے، اوپر' دیکھ کر اس کی عکاسی کرنے والا شاعر 'زمان و وقت' کے 'جریان' کا ذکر کرتا ہے۔ ان دو اصطلاحات پر، خصوصی طور پر لفظ 'جریان' کے استعمال پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ زمان و وقت کا اشارہ براہ راست اس طرف ہے۔ زمان کے حوالے سے یہ کہا گیا ہے کہ ہر پانچ سات برس کے بعد، کبھی مشرق وسطیٰ میں، کبھی جنوبی ایشیا میں، کبھی جزیرہ نمائے کوریا میں، کبھی یورپ میں جوہری جنگ کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔

'جریان'، اشتہاری طبیبوں کی وجہ سے ایک خاص قسم کے مرض کا سکہ بند نام تسلیم کرلیا گیا ہے، لیکن اس کے معنی لغت میں یہ ہیں۔ (پانی کا رُک رُک کر بہاؤ، رواں ہونا عربی میں مستعمل ہے جبکہ منی کے خارج ہونے کے معنی یونانی طب سے وارد ہوئے ہیں) یہاں شاعر نے شاید ذوجہتی معنویت کو زیادہ جلا دینے کے لئے اردو تنقید کے لیے اس غیر مستعمل لفظ کا استعمال کیا ہے۔ (گستاخی نہ ہو، تو یہ عرض کردوں کہ ستیہ پال آنند سے الفاظ کے استعمال میں ذوجہتی، سہ جہتی، بسیار جہتی معانی.... کچھ بھی بعید نہیں ہے، کہ وہ کئی زبانوں کے عالم ہونے کے علاوہ مشرقی اور مغربی علوم کے ماہر ہیں)۔

یہ نظم، جیسے کہ میں پہلے تحریر کر چکا ہوں، anti-utopia کے قماش کی ہے اور اردو میں ایک نئی قسم کا باب کھولتی ہے۔

◀◀ ● ▶▶

- **ناول کا ایک باب**
- **لطف الرحمٰن**

زہرا کیلے موسم کا

شدید اور مسلسل برف باری سے محفوظ کمرے کو روشن ہیٹر کے خوش گوار گرم ماحول نے اندر ہی اندر کم سن جسموں کی تپک بخش دی تھی۔ اپنے نرم و گداز بستر کے بے لباس لمحوں کی مادر زاد برہنہ راہوں پر میں کچی لسی جیسی کلپنا کی خوبصورت نازک پہاڑیوں اور سبک ولطیف وادیوں کے تصور میں ڈوبا تھا۔ اس کی بے زبان تنہائی اور اکیلے اٹوٹ خالی پن کے بے ساختہ سلگتے ہوئے آنسوؤں کے گرداب میں ایک صدائے بازگشت تھی۔ ان ڈھڑکتے ہوئے دھنک رنگ لمحوں کی جو بیتی ہوئی رُتوں کا کرب بن کر نیم غنودہ رینگتی ہوئی شب کے ہمراہ اس کے اکیلے کمرے میں کسی ڈوبتی ہوئی آخری سانس کی طرح اُبھر رہے تھے اور چاروں طرف سے گہری اترتی ہوئی شام کے صحرا میں بجھتی ہوئی لکڑی کی طرح چیخ چیخ کر ان قافلوں کی کہانی لکھ رہے تھے جو وقت کی دھول میں گم ہو گئے تھے اور آخر کار بجھی ہوئی آگ کی راکھ صحرا کے زرد پھیلے ہوئے بے کنار دامن پر سرشار و خوش و خرام بے معنی لمحوں کی نشانی بن کر ثبت ہو گئے تھے۔

اب تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ زندگی اتنی دلدار کبھی نہیں ہوئی۔ وہ کبھی دوسرا موقع نہیں دیتی.....اور اب اسے سب کچھ اکیلے ہی جھیلنا تھا۔ تنہائی کے بے کراں لمحوں کا سارا عذاب، بے خواب طویل راتوں کے سلسلوں کی ساری تھکن، نا اُمیدی کے شدید تھپیڑوں کی ساری چوٹیں اور انتہائی بے زار ساعتوں کے کھنور میں ہاتھ چھڑاتے ہوئے تنکوں کے سہاروں کا سب دکھ.....اسے سب کچھ اکیلے ہی جھیلنا تھا کہ اب تو بہت دیر ہو چکی تھی۔

وہ شرمندہ ہوا تھا، اس مہربان دوست سے!.....کتنا پشیمان! پچھلے ہفتے بالآخر اس نے عذرا کی دعوت قبول کر لی تھی۔ کئی ماہ پہلے، کسی ہوائی سفر میں اس سے تعارف ہوا تھا۔ جہاز کسی تکنیکی خرابی کی وجہ سے ایک روز کے لئے سفر ملتوی کرنے پر مجبور ہوا تھا۔ مسافر قیمتی آرام دہ ہوٹلوں میں ٹھہرائے گئے تھے.....ڈنر ہال میں اس کی سجل سفید خوبصورت لمبی انگلیاں موسیقی کے مدھم سروں کے التزام و توازن کے ساتھ ایک بے حد پرکشش اور انوکھا ڈیزائن کاڑھنے میں مصروف تھیں.....کلپنا کو بھی نئے انوکھے اور خوبصورت ڈیزائن کا

ڑھنا بے حد پسند تھا۔

یہ کلپنا؟............

اس نے آہستہ سے اپنی مدافعت کی۔کلپنا تو کلپنا ہی ہے۔ پھر ڈنر کا بلاوا آ گیا تھا۔اپنی دلخراش تنہائی اور دلدوز اکیلے پن سے گریز اور نجات کی بس ایک صورت تھی۔خود کو زیادہ سے زیادہ مصروف رکھا جائے ،اپنے آپ کو دور رکھا جائے۔مگر کب تک؟ کہاں تک؟ اور بالآخر اس نے پچھلے ہفتے عذرا کی دعوت قبول کر لی تھی۔کمرے کی سبز مدھم روشنی میں لباسوں کے مصنوعی بوجھ سے آزاد،اُجلی گوری مٹی سے تراشے ہوئے دو سجل خوبصورت بدن اپنی رگوں کی وحشیانہ لپک سے ہم آہنگ ہو کر سرتا پا ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے لب بہ لب پیوستہ، جیسے دو مختلف بدن نہیں بلکہ دو مختلف سمتوں سے آئی ہوئی ایک دوسرے میں جذب ہوتی ہوئی پہاڑی پگڈنڈیاں تھیں جو پہاڑی کی خطرناک اونچی نوکیلی بلندیوں کی دہکتی ہوئی آرزوؤں میں ایک ہو گئی تھیں۔جیسے وہ دو مختلف بدن نہیں ایک ہی وجود کے دو مختلف روپ رنگ اور سائے ہوں۔

محویت ذات کی اس پناہ گم شدگی کے ارتقائی لمحوں میں اچانک زلزلے کا وہ شدید جھٹکا جیسے ساری کائنات زیروزبر ہو گئی ہو، ساری بلندیاں، ساری عمارتیں، تمام شہر وجود، سارا آسمان، سارخواب، چاند، سورج، ستارے سب کچھ ٹوٹ پھوٹ کر ریزہ ریزہ بکھر گئے ہوں۔زمین اپنے محور سے، کائنات اپنی گردش سے، دریا اپنی روانی سے، سمندر اپنی گہرائی سے اور ہوا جیسے اپنی بے آواز آہٹ سے محروم ہو گئی تھی۔ پھول اپنی خوشبو کھو چکے تھے۔تتلیاں اپنا والہانہ رقص بھول چکی تھیں۔ چڑیوں کے سہانے گیت ماتمی چیخوں میں بدل چکے تھے۔کمرہ کی پوری چھت، سبز مدھم روشنی میں نہائے ہوئے کمرے کی پوری چھت ٹوٹ کر فیصل کے سر پر آن گری تھی، اس کا پورا وجود لہولہان ہو چکا تھا۔

چند لمحوں بعد جب زلزلے کے جھٹکے ذرا تھمے تو عذرا اپنے خوبصورت گداز مہکتے ہوئے بانہوں میں سمیٹے ہوئے اسے تسلی دے رہی تھی ......نہیں،نہیں گھبرانے کی کوئی بات نہیں، ایسا کبھی کبھی ہو جاتا ہے، اور پھر......اور پھر سب کچھ ٹھیک ہو جاتا ہے۔

دوسرے لمحے شیر کی طرح وہاں سے اُٹھ کر وہ اپنی کار کی طرف بڑھا اور اس شدت سے کار اسٹارٹ کی جیسے اسے آسمانوں میں پرواز کرنا تھا۔عذرا اُسے آواز ہی دیتی رہ گئی۔راستے میں اس نے ایک تھری اسکوٹر کو شاید دانستہ سائیڈ ماری۔ایک موٹر سائیکل سوار عقبی شیشے میں موت کی وحشیانہ گرجتی ہوئی رفتار سے خائف ہو کر فٹ پاتھ پر جا چڑھا۔ٹریفک سگنل کی خلاف ورزی میں اگلے موڑ پر وہ خود ایک تیز رفتار ٹرک سے ٹکراتے ٹکراتے بچا اور آخر آخر ایک ویران پارک میں گاڑی کھڑا کر کے دیر تک پھوٹ پھوٹ کر رویا اور

دبی دبی گھٹی گھٹی سسکیوں میں بین کرتا رہا جیسے کوئی بوڑھی ماں اپنے بیٹے کی موت پر پوری کائنات کے سینے کو اپنی کراہتی ہوئی دردناک چیخ سے ریزہ ریزہ کر رہی ہو......اپنی زندہ موت پر۔نامعلوم غصے، پشیمانی، لاچار، شرمندگی اور بیچارگی کے گرم گرم اُبلتے ہوئے آنسو اس کے وجود کی کشتی کو بے رحم طوفانی تھپیڑوں کی زد پر لا معلوم گہرائیوں کی طرف بہائے لئے جا رہے تھے جسے اس کا شہر وجود منگولوں کی غارت گری کے بعد بازآباد کاری کے کسی بھی امکان سے محروم ہو چکا تھا۔

یہ احساس اسے آرے کی طرح کاٹے ڈال رہا تھا کہ وہ اپنی ذات میں ادھورا ہو کر رہ گیا ہے۔ اپنی تخلیقی حرارت و توانائی سے محروم ایک نامکمل آدمی......اور اس کی واحد وجہ کلپنا تھی۔

مفارقت کے باوجود کلپنا اس کی زندگی، اس کی شخصیت اور اس کے وجود کا لازمی حصہ رہی تھی۔ اس نے اگر کسی سے محبت کی تھی، سچی، بے ساختہ، ازلی محبت تو صرف کلپنا سے کی تھی۔ چاروں طرف ہر شے، ہر منظر، ہر راستہ، ہر سوچ، پر کلپنا کی کوئی نہ کوئی تصویر روشن تھی اور جب اچانک کلپنا اس سے دور ہو گئی تھی تو اس نے اپنی پوری ایمانداری سے محسوس کیا تھا کہ کلپنا کے بعد کسی بھی دوسری عورت سے خلوتوں کا شبنمی رشتہ کلپنا کے ساتھ بے وفائی ہے۔کلپنا کی مفارقت کی اتنی لمبی صدیوں میں اس خواہ مخواہ کے بیہودہ احساس نے اس سے اس کی پہچان چھین لی تھی۔ یہ زندگی کا پہلا حادثہ تھا، پہلی بار ایسا ہوا تھا اور نہایت سخت تباہ کن حادثہ تھا جس نے اسے آج بے حد شرمندہ اور مجبور کر دیا تھا۔اتنا مجبور تو وہ اپنی زندگی میں کبھی نہیں ہوا تھا...... اس وقت بھی نہیں جب ایک مورچے پر دشمن مشین گن کی بوچھار کی زد میں وہ تنہا غنیم کی چوکی پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔اس لئے کہ اس کے باقی سارے ساتھی مارے جا چکے تھے اور ادھر بھی دشمن کا تنہا مشین گن چلانے والا فوجی اس کے بینٹ کی زد میں آ چکا تھا۔اسے اپنی خنجر پر ہمیشہ بھروسہ رہا......مگر آج کے حادثے نے اسے کسی زخم خوردہ تنہا سپاہی کی طرح مورچے پر اکیلا تڑپتا ہوا چھوڑ دیا تھا۔اس جیسے آزمودہ کار سپاہی کے لئے یہ احساس زندہ موت سے کم نہیں تھا۔

پھر اسے وہ جاپانی لڑکی گلیشیا یاد آئی۔ جاپان کے سرکاری سفر میں گلیشیا اس کی ترجمان تھی۔ایک ہی دن پہلے وہ ایک ماہ کے بعد ہنی مون منا کر لوٹی تھی کہ اسے یہ غیر دلچسپ ذمہ داری سونپ دی گئی۔بے حد مصروف، بے انتہا اکتا دینے والے بے زار پانچ دنوں کے شب وروز انہماک کے بعد رات کے پچھلے پہر جب ذرا فرصت ملی تو وہ جاپانی گڑیا جو انگریزی سے جاپانی اور جاپانی سے انگریزی ترجمے کے مصنوعی فرض کی شدید بے کیفی سے نڈھال ہو چکی تھی، اچانک کسی مقناطیسی کشش کے زیر اثر لہو رنگ دھنوں پر گنگنانے لگی۔ عجیب لڑکی تھی وہ بھی، یعنی یوں کہ سبز موسم کی تازگی و شادابی نے اس پر کچھ زیادہ ہی نوازش کی

تھی۔ یوں کہ اس کی برجیوں پر بہار کی اولین مست و بیخود ہواؤں نے اس کی جوانی کی بیلوں کو بے شمار خوشنما پھولوں کے بوجھ سے دوہرا کر دیا تھا چنانچہ کبھی کبھی تو وہ اندر سے زیادہ باہر ہی نظر آنے لگتی تھی۔ ورنہ عام طور پر اس کے دلکش کیمونو کی قید میں بھی گردن سے ذرا نیچے سفید نرم جھیل میں تیرتے ہوئے آبی پرندوے ہر وقت پرواز کے لئے بے قرار نظر آتے.....!

مگر اس رات کے بعد، ہر رات کے آغاز کے ساتھ ہی اس کے ہاتھوں کی گرم حرارت اس کی سفید جھیل میں تیرتے ہوئے آبی پرندوں کو رقص آتشیں پر مجبور کر دیتی جس کے نتیجے میں جھیل کناروں تک آسودہ سب رولہروں سے منور جاتی، میں جس کے زیریں آبی محل کی خلوتوں میں صبح تک ہندی اور جاپانی موسیقی کے سر اور سرگم کی آہنگی سے نئی دھنوں کی ایجاد کی کوشش میں اپنی ٹوٹی ہوئی مضراب کا دکھ سہتار رہتا اور گلیشیا زخمی تاروں سے رستے ہوئے لہو کے ذائقے کی تال پر بے سدھ رقص کرتی رہتی۔

پھر اسے وولگا یاد آئی۔ جاپان سے ایسی ہی کوئی مصروفیت اسے روس لے گئی تھی، جہاں روسی سرکس میں جمناسٹک کے حیرت انگیز کمالات پیش کرنے والی ترشی ترشائی چمکتی دمکتی، حسن و شباب کی قیامت وقامت سے محور کر دینے والی لڑکیوں جیسی وولگا اس کی ترجمان تھی۔ مشہور روسی دریا وولگا کی طرح مسلسل رواں شفاف، نرم، شیریں اور فراخ دل لڑکی ہر لمحہ پہاڑی چشموں کی طرح اچھلتی رینگتی، اٹکتی، بل کھاتی اور سیراب کرتی ہوئی حرکت و حرارت کا پیکر کا کیشائی حسن کا دھڑکتا ہوا مجسمہ وولگا خاصی پڑھی لکھی معلوم ہوتی تھی۔ فرصت کی پہلی شام اس نے خاصے رعب گانٹھے۔

''تمھیں پتہ ہے کہ یہ کائنات ستاروں کے گرد و غبار سے وجود میں آئی ہے اور یہ کہ گلیکسی میں چار سو بلین ستارے ہیں۔ پتہ نہیں کہاں کہاں کیسی کیسی تہذیبیں اور نسلیں ارتقائی سفر طے کر رہی ہیں اور ہماری نگاہوں سے اوجھل ہیں۔ اگر ایک آدھ کا سراغ بھی مل جائے تو سمجھو کہ زندگی بے کار، بے معنی اور بے مصرف نہیں گئی۔''

''کیا تم طبیعات میں ریسرچ کر رہی ہو۔''

''ٹھیک! ہاں بالکل ٹھیک!۔ تم ذہین آدمی ہو، تم نے سمجھ لیا، تو ہندوستان میں بھی ذہین لوگ پائے جاتے ہیں۔''

''اگر گلاس نوست کے پہلے تم ملتیں تو اتنی باتیں کر سکتی تھیں؟''

''بالکل نہیں! یہ تو سامنے کی بات ہے۔''

''اچھا تمھیں اپنے ریسرچ میں کتنی کامیابی ملی۔''

''ابھی.....ابھی تو میں اپنے ریسرچ کے بالکل ابتدائی مرحلے میں ہوں۔''

''ہمارے یہاں پرانے لوگ صدیوں سے ستاروں کی رفتار و سمت کا مشاہدہ ننگی آنکھوں سے کرتے تھے کہ تب بینوکلر وغیرہ کی ایجاد نہیں ہوئی تھی۔''

''یہ تمھارے یہاں کی تخصیص تو نہیں ساری دنیا میں لوگوں نے اسی طرح آغاز کیا ہے۔''

''لیکن میری تخصیص یہ ہے کہ اب بھی، آج بھی ہمارے یہاں ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جو اپنی آنکھوں پر زیادہ اعتبار کرتے ہیں۔''

''یہ حماقت ہے۔ اس دور میں ایسی کوئی بھی کوشش حماقت ہے۔''

''ارے! ارے! تم اسے حماقت کہتی ہو۔ خود میں نے اپنی ان ننگی آنکھوں سے بعض ایسے ستاروں کا مشاہدہ کیا ہے کہ شاید تم لوگ بینوکلر سے بھی نہیں کر سکتے۔''

''اچھا، بہت اچھا۔'' وہ حد تمسخرانہ انداز میں ہنسی۔

''اگر تمھیں یقین نہیں آتا تو کہو میں ثابت کر دوں۔''

''بالکل یقین نہیں آتا۔ اور ہاں تم کیسے ثابت کرو گے۔ بھلا ثابت تو کرو۔''

''تو آؤ، جہاں پر سے آسمان صاف اور شفاف نظر آتا ہے وہاں چلتے ہیں۔''

وہ ہوٹل کے سوئمنگ پل کے قریب آئے جس کے ٹھہرے ہوئے پانی میں آدھے چاند کا پورا عکس روشن تھا۔ اس نے اُسے ٹھہرے ہوئے پانی میں جھک دیکھنے کا مشورہ دیا۔ جا بجا اکا دکا ستارے جھلملا رہے تھے۔ کچھ غور و فکر کے بعد اس نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

''یہ تو روزمرہ کے مشاہدے ہیں.....تم کیا دکھانے لائے تھے۔'' اس نے کہا۔

''پھر جھک کے دیکھو۔'' ٹھہرے ہوئے پانی کے آئینے پر اس کا عکس چمک اٹھا۔ اس نے پوچھا۔

''کچھ نظر آ رہا ہے؟''

''کہاں پر، کدھر، کیا ہے؟''

اس نے اس کے سنہری رخساروں پر انگلیاں رکھتے ہوئے کہا۔

''پورے آسمان میں ایک بھی اگر ایسا ستارہ ہو تو بتاؤ۔''

اور پھر دل کی گہرائیوں سے نکل کر اس کی ہنسی کی نقرئی آواز دور تک پھیلتی چلی گئی اور میرے پورے وجود میں گھل گئی۔

''تم روسیوں سے بہت اچھے ہو۔ تمھیں کم از کم لڑکیوں سے باتیں کرنے کا ہنر تو آتا ہے۔ جھوٹی

ہی سہی لیکن تم خوبصورت اور دل کو چھو دینے والی باتیں کرتے ہو۔''

اور پھر وہ بے تکلف ہوگئی اور ہوتی چلی گئی۔ اس نے اسے بہت سے جہانوں کی سیر کرائی۔ ہوٹل کے نیم تاریک کنج میں اس نے اُسے ایک چرچ دیکھنے کی دعوت دی۔ 'ابھی رات کے اس پہر'، اُس کی آنکھوں میں حیران کن سوال تھا۔

''آؤ تو سہی، چرچ اور چرچ ہی کیا ساری مذہبی عمارتیں تو فرائیڈ کے مطابق جنس کی علامت ہیں۔ ان کو دیکھنے کے لئے رات ہی کا وقت موزوں ہے۔''

اردگرد کے مناظر بے حد دلکش اور سحر انگیز تھے۔ آدھے چاند کی دھندلی سفید روشنی میں دو صحت مند مرمریں ستونوں کے اوپر نہایت ہی نرم اور گداز سنگ سفید سے تراشے ہوئے دو حسیں گلابی گنبد یقیناً فن تعمیر کا منفرد شاہکار تھے۔ مرمریں ستونوں کے درمیان وادیوں میں گرتی ہوئی آبشاروں کی تخلیق کرتی ہوئی پتلی پتلی نہروں جیسی ایک مختصر سوت سنہری گھاسوں سے ڈھکی ہوئی لیکن قربت کی آنچ میں گرم پانیوں کا قدرتی چشمہ..... فیاض، مہربان اور شفیق' وہ ایسے چشمے سے سیراب ہوتا رہا۔ سیرابی کے بعد وولگا اسے اپنے پر خلوص مرمریں بازوؤں میں کس لیتی۔ اس کے گداز دہکتے ہوئے ہونٹوں کی پگھلتی ہوئی سرخی اُس کے پورے وجود پر چھا جاتی..... اور یوں ہر تجربہ ایک نیا اور بالکل انوکھا اور روح پرور تجربہ ہوتا۔ اس کی رفاقت نے یہ بتایا کہ وولگا ایک ندی کا نام نہیں تھا..... اس میں ہزاروں لاکھوں ندیاں روپوش تھیں۔ اس کی ہر موج، ہر پل ایک نئی وولگا کو جنم دیتی ہے۔

''سوتم وولگا سے کبھی بھی مکمل طور پر آسودہ نہیں ہو سکتے۔ وولگا ہر پل ایک نئے دریا کا نام ہے۔ ٹھیک اسی طرح جیسے تم ایک ندی میں دو بار غسل نہیں کر سکتے۔ تم وولگا سے دوسری بار اس سطح پر نہیں مل سکتے۔ تمہیں پتہ ہے میں اپنے آپ میں ایک کائنات ہوں..... تہہ در تہہ ایک نئی دنیا۔ میں سمندر ہوں۔ سمندر احساس کمتری پیدا کر دیتا ہے۔ خوف زدہ کر دیتا ہے اور غرق ہو جاتا ہے آدمی! لیکن اگر تیرا ک حوصلہ مند ہو اور اس کے بازو کی مچھلیاں تیرنا جانتی ہوں اور وہ..... تمہاری طرح بے جگر بھی ہو تو سمندر دوست بن جاتا ہے۔ بہترین دوست..... اور میں تمہیں بتا دوں کہ زندگی کے کٹھن مرحلوں میں جب تم یکسر تنہا، بے یارو مددگار ہو جاؤ پھر مجھے یاد کر لینا۔''

پھر اسے سیما، رادھا، صنوبر، جولی، رتنا کور اور کئی دوسرے مہربان، ہمدرد، ہم نفس اور دوست چہروں کی بھولی بسری یادیں آتی چلی گئیں جو مختلف موقعوں پر اس کے خالی پن کے ویران کناروں کی تپتی ہوئی ریت کو اپنی نغمہ ریز، پرشور رموجوں کی بے ریا ہم نصیبی سے سیراب کر چکے تھے، آباد کر چکے تھے۔ اور آج

بھی وہ بے حد مہربان شفیق، جاں نثار چہرے کہیں نہ کہیں اس کے انتظار میں تھے۔ رگوں کے بپھرے ہوئے طوفانی سمندر کی بے سمت لہروں پر اس طلسمی سفر کی رفاقت کے انتظار میں جو گم نام ساحلوں کی ریشمی خنک ریت پر بیدار روحوں کی شبنمی شعلہ زا ہم آغوشوں کے مجسمے تخلیق کرتے چلے جاتے ہیں۔ انہیں انتظار تھا بیتی ہوئی رتوں کے ان سرسبز و شاداب اور سرشار لمحوں کی یکجائی و ہم آغوشی کی اولین کرنوں کا جو بتدریج بلند ہو کر اور پھیل کر تمام تر صحرا کے غبار کو، ستاروں کی اس گرد کو کبھی سبز، کبھی سرخ، کبھی اودی، کبھی نیلی شعاعوں سے منور کر دیتی ہیں اور تب نگاہوں میں دھنگ کے ساتوں رنگ الگ الگ رقص کرتے ہوئے رگوں میں بہتی ہوئے بے قرار چاندی کو طلائی نغموں کا نور بخش دیتی ہیں۔

گلشیا کا پہلا خط.....

'تمہارے بعد' تمہارے معیار پر پھر کوئی نہیں اترا، کاش! تم ایک بار پھر آ جاتے۔'

وولگا نے لکھا تھا.....

'دریائے والگا تمہارے انتظار میں ہے۔ جلد آؤ۔'

سیما.....

'میری چاندنی سیاہ پڑتی جا رہی ہے، اب آ بھی جاؤ۔'

رادھا.....

'بانسری کے بغیر تمہاری رادھا ادھوری ہے، جنم جنم کا انتظار.....'

صنوبر.....

'زعفران کی کلیاں بکھرنے ہی والی ہیں! تم کہاں ہو؟'

جیوتی.....

'آنکھوں میں انتظار کی لو مدھم ہوتی جا رہی ہے، کب تک آخر کب تک؟'

جولی.....

'انگوروں کے خوشے مرجھانے لگے ہیں، پام کے پیڑوں میں گھن لگ رہا ہے۔ دیر نہ ہو جائے کہیں۔'

رتنا کور.....

'سرسوں کے پھول سوکھ گئے، مکئی کی فصل ٹڈے چاٹ گئے۔ بڑی مشکلوں سے مکھن سنبھال کر رکھے ہوئی ہوں۔ اور دیر مت کرو!'

سدھا چڑ جی.....

'بن پانی مچھلیاں مر رہی ہیں، جلد آؤ۔ برستے ہوئے بادلوں کی طرح.....ساون بیت نہ جائے کہیں!'

اور ایسے بہت سے ٹھہرے ہوئے نوافشاں موسموں کے وارفتہ لمحے جو سینہ گل پہ شبنم کے لطیف قدموں کا عکس بن کر روشن رہے.....مگر لیزا کی صندلی رفاقت کی خود فراموشی کے بعد یہ سب کچھ، یہ سارے روشن لمحے غروب شام کے بجھتے ہوئے سورج کی سمٹی ہوئی کرنوں کی دھول بن گئے۔ یہ ساری یادیں بے آباد گمنام جزیروں کی سسکتی بلکتی، ڈوبتی ہوئی فریادوں کا نوحہ بن گئیں۔

لیزا حالات وروایات کی ساری زنجیروں کو توڑ کر ستاروں سے آگے جہانوں میں اس کی ہم سفری کا فیصلہ کر چکی تھی اور اس کی نگاہوں کے بادبان کے لطیف چھاؤں میں پتوار سے کھیلنے اور سرکش موجوں سے الجھنے کا حوصلہ افزا موسم کہیں پر بہت قریب آ گیا تھا کہ اچانک ایک پیس مشن کے تحت بدیس میں اس کا عارضی تبادلہ ہو گیا.....ذمہ داری کے گھنے جنگلوں میں کامیابی کی کرن کی تلاش ناممکن محسوس ہو رہی تھی۔ لیکن لیزا کے ساتھ نئے سفر کے آغاز کے خوشگوار خیالوں نے اسے دن رات ان دیکھے سایوں کی تلاش میں منہمک کر دیا۔ دو ہفتوں کے مسلسل کامیاب آپریشن کے بعد ایک دن واپسی میں اس کا جہاز حادثے کا شکار ہو گیا۔

ریڈ کراس کے ایک طبی مرکز میں آنکھ کھلی۔ ایثار وقربانی اور خدمت انسانی کی جذبۂ مجسم، سسٹر میریا نے بتایا کہ جب تم شدید زخمی حالت میں لائے گئے تھے تو اول اول تو ڈاکٹروں نے تمھاری موت کا اعلان کر دیا تھا۔ لیکن مقدس ماں مریم کا منشا کچھ اور تھا۔ چنانچہ معالجوں کے دست مسیحائی نے دن رات کی انتھک محنتوں کے بعد اسے موت کے منہ سے نکال لیا تھا۔ ایک ہفتے کی مسلسل بے ہوشی کے بعد ہوش آیا تو تھا لیکن حد سے زیادہ خون کے زیاں نے اس کی ساری توانائی چھین لی تھی۔ خبر نہیں کس کس کے خون کی خیرات سے میں دو ہفتے بعد اس قابل ہوا کہ لیزا سے فون پر رابطہ قائم کر سکے۔

اس کے نحیف مشکل سے ادا ہوتے ہوئے 'ہیلو' کے جواب میں لیزا کی مخصوص مترنم شہد جیسی شیریں 'ہیلو' اس کے بعد رابطہ ٹوٹ گیا۔

لیزا سے رابطے کی ہر کوشش ازلی سناٹوں کی بداندیش خاموشی بنتی رہی۔ اس بے رشتگی اور عدم تعلق نے اسے جینے کے بے پناہ حوصلوں سے مامور کر دیا اور اپنے معالجوں کی توقعات کے برعکس کم سے کم چھ ماہ کی بجائے اسے دو ماہ کے بعد ہی ہسپتال سے جانے کی اجازت مل گئی۔

سسٹر میریا نے ایک بند لفافہ اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا کہ،

''یہ مقدس ماں مریم کی طرف سے ہے۔ جب سارے ڈاکٹر تمھاری زندگی سے مایوس ہو گئے تھے تو مقدس ماں خود بہ نفس نفیس آئی تھیں اور انہوں نے تمھارے کانوں میں اور میں صرف تم سے یہ سب کہہ

رہی ہوں' کہیں مت دہرانا.....ہاں تو انہوں نے تمھارا نام لے کر پکارا تھا اور کہا تھا۔

'فیصل! تم نہیں مر سکتے۔ تمھیں جینا ہوگا۔ تم زندہ ہو گے۔ آنکھیں کھولو، آنکھیں کھولو! فیصل۔'

اور پھر سچ مچ ایک معجزہ ہوا۔ تم نے ایک پل کے لئے آنکھیں کھول دی تھیں۔ میں تنہا گواہ ہوں اس کی کہ یہ معجزہ میری آنکھوں کے سامنے ہوا تھا اور سچ تو یہی ہے کہ یہ تمہارا دوسرا جنم ہے۔ مقدس ماں نے جاتے ہوئے یہ سربہ مہر لفافہ میرے حوالے کیا تھا کہ مریض جب ہسپتال سے رخصت ہونے لگے تو اسے دے دینا۔ تمھاری زندگی مقدس ماں کی امانت ہے، سنبھال کر رکھنا۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنایا اور اپنے فرض میں منہمک ہو گئی۔ لفاف سے ایک مختصر تحریر برآمد ہوئی.....

''تم معصوم، بے زبان، بے قصور، مظلوم اور نہتے لوگوں کی آبادی پر نپام بم گراتے رہے۔ جھلسی ہوئی فصلوں اور سلگتے ہوئے جنگلوں کے بھیانک مناظر تمھاری بے رحم فوجی کاروائی کی سرخیوں کے ساتھ ہر ٹی وی چینل پر مسلسل دکھائی جاتی رہی۔ ہزاروں بے آسرا، بدنصیب جسموں کے اُڑتے ہوئے چیتھڑوں نے مجھ سے جیسے میری بینائی چھین لی ہے۔ عورتوں اور بچوں کی آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی دردناک چیخیں میری سماعت پر ازلی بوجھ بن گئی ہیں۔ تم سے زیادہ انسانیت تو حیوانوں میں ہوگی۔ کاش! تم میرے لئے اجنبی ہوتے۔

اپنی ذلیل آرزوؤں کا المیہ..... لیزا!''

تو سب کچھ لٹ چکا تھا۔ اب کہیں کچھ بھی نہیں تھا۔ کچھ بھی نہیں۔ کہیں نہیں۔

پہلی فرصت میں اس نے فوجی ذمہ داریوں سے فرصت حاصل کر لی۔ تین مہینوں کی مسلسل شراب نوشی نے اسے ہسپتال پہنچا دیا۔ لیکن ابھی اسے اپنے گناہوں کا عذاب جھیلنا تھا.....اپنی صلیب اُٹھا کر ذلت کی راہوں پر دور تک اکیلے جانا تھا۔

ایک مہینے کے بعد اسے ہسپتال سے رخصت کر دیا گیا.....اب نہ کہیں پر کچھ کرنے کو تھا نہ کہیں پر کچھ کر گذرنے کو تھا۔ گذرے ہوئے اور آئندہ زمانوں کے بیچ ایک طویل دھندلی سرنگ تھی، گھنے جنگل کے بے ضمیر اندھیروں میں بے سمت، بے راہ، بے نشان، جینے کا جواز تلاش کرنا، ایک ایسے سوال کے جواب کی تلاش سے عبارت تھی جو سوال ابھی پیدا ہی نہیں ہوا تھا۔ بالآخر اس نے تمام تاریخی تہذیبی اور مذہبی مرکزوں کی سیاحت کا فیصلہ کیا۔ اور اب دن رات کسی معنی کسی مفہوم کی تلاش میں پیہم سفر میں رہنے لگا۔ ایسے ہی ایک سفر میں عذرا سے ملاقات ہوئی۔

اور ابھی کچھ دنوں قبل جب عذرا کے یہاں سے پشیمانی وشرمندگی اور بے چارگی و بے بسی کی شدید ذلت کا بے کراں بوجھ اپنے بے اعتبار، بے سہارا کاندھوں پر اٹھائے دوہرا ہو کر میں واپس آیا تو پھر بنت عنب ہی نے سہارا دیا..... لیزا کا تصور کلپنا کا سپنا بن چکا تھا۔ کہانی انجام سے پہلے ختم ہو گئی تھی۔ کتاب

زیست نامکمل اور ادھوری تحریروں کا بوجھل معمہ بن گئی تھی۔

خبر نہیں کتنے دن، ہفتے، مہینے، برس یا صدیاں بیت گئیں۔ ایک دن آنکھ کھلی تو وسکی کے گلاس میں گلشیا مسکراتی ہوئی نظر آئی۔ حالات کے شدید بھنور میں تنکے کا سہارا بھی اس سے چھن گیا تھا۔ اب خیالوں میں ایک تنکا نظر آیا تو اس اسے دونوں ہاتھوں سے تھام لیا اور شدید نامعلوم ناامیدی اور ازلی خوف کے ڈر سے، سفر کے دائرے میں رقص کرتے ہوئے اس نے خیالوں کے اس تنکے کے چوم لیا، شاید بھرپور حیوانی جبلت کے ساتھ۔

معاً ایک چیخ اس کی سماعت سے ٹکرائی.....اور تب اس کی آنکھوں نے دیکھا وہ تو واقعی گلشیا ہی تھی۔ زندہ، توانا، ہری بھری، حسب دستور اندر کم باہر زیادہ، شاید بسنت رت اپنے شباب پر تھی۔

گلشیا نے پچھلی رفاقتوں اور بیتے ہوئے دنوں کا ہر قرض چکانے کی کوشش کی۔ وہ قدرے ہوش میں بسر کرنے لگا۔ اس کی بے لوث خدمت نے اسے اردگرد کے ماحول سے باردگر متعارف کرایا۔ خود فنگی و بے خبری کی بے معنی زندگی پھر کسی معنی، مفہوم کی ضرورت محسوس کرنے لگی۔ اس نے اپنے آپ کو گلشیا کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔

اس جوگن نے بڑی کٹھن تپسیائیں کیں۔ اس کے ہر زاویہ جسم کی پرستش کی۔ ہر شب اپنے مضطرب گرم گلابی ہونٹوں سے اسے سرتاپا غسل دیتی۔ اس کے وودھیا سینے کی سنہری لویں اس کی تاریک طاقتوں اور محرابوں کو روشن کرنے کی لاحاصل کوششیں کرتی رہیں۔ وہ اپنی گرم رسیلی زبان سے اس کے پتوار کو مسلسل چومتی رہی کہ شاید کبھی اس کے بادبان کو میں کوئی سمت عطا کر سکے۔ مگر اسے کہاں خبر تھی کہ اس کے پتوار کو اندر ہی اندر گھن لگ چکا تھا۔ اس کے زنگ آلود خنجر کی طرح جو نیام میں قید اپنے جوہر، اپنی نوکیلی رسائی اور اپنی کاٹ کی رفاقت سے ناآشنا ہو چکا تھا۔ بجھتی ہوئی آگ میں کہیں کوئی چنگاری نہیں تھی۔ وہ سراپا مسمار منظروں کی سرد راکھ بن چکا تھا.....

اب اسے وہ یہ کس دل سے بتلاتا کہ ہر لمحہ ہر پل بے زبان، بے قصور، مظلوم اور ننھے بچوں اور عورتوں اور مجبور لوگوں کی چیختی ہوئی کراہوں اور سسکتی ہوئی آہوں نے اس سے اس کا سب کچھ چھین لیا ہے۔ وحشی جانوروں میں بھی شاید اس سے زیادہ آدمیت پائی جاتی ہے۔ وہ اس سے اتنا ہی کہہ سکا کہ،

"گلشیا! جہاز کے حادثے میں میرے سارے اسلحے بکھر گئے۔ میں جانبر ہو گیا یہ تو کلپنا کا معجزہ ہے ورنہ تم جس کو زنگ آلود خنجر سمجھ کر اپنے ہونٹوں کے لعاب سے روشن کرنا چاہتی ہو وہ تو بس پچھلے موسموں کی ایک یادگار خالی نیام ہے۔ میں انسانیت کے خلاف اس صدی کی سب سے بڑی عالمگیر مجرمانہ سازشوں کا نوحہ ہوں.....تم لوٹ جاؤ! اپنی معصوم چھوٹی سی محفوظ دنیا کی طرف! کہ اب یہاں کچھ بھی نہیں، کچھ بھی نہیں.....! ڈوبتی چیخوں کے سوا! (بشکریہ: "ترجمان" اردو مرکز عظیم آباد، مرتبہ پروفیسر جابر حسین، شمارہ نمبر ۲، نومبر ۱۹۹۹ء)

◀◀ ● ▶▶

● غزلیں بخط شاعر / لطف الرحمٰن

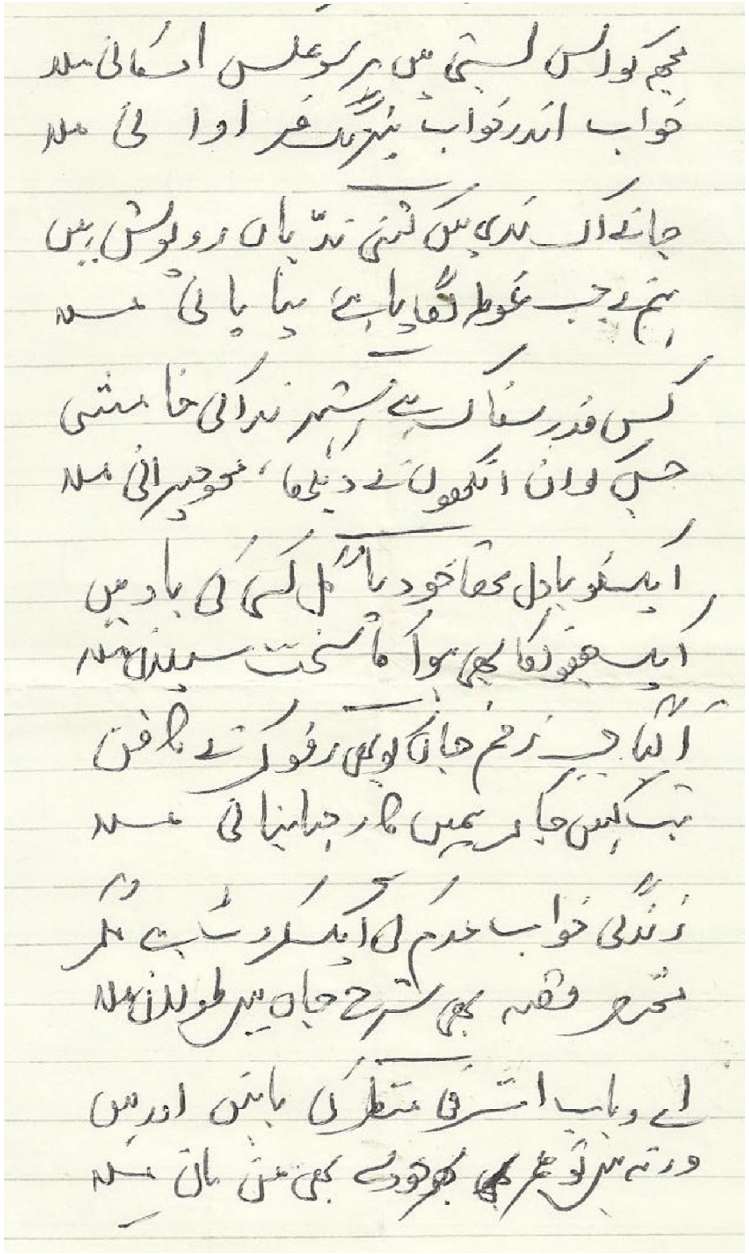

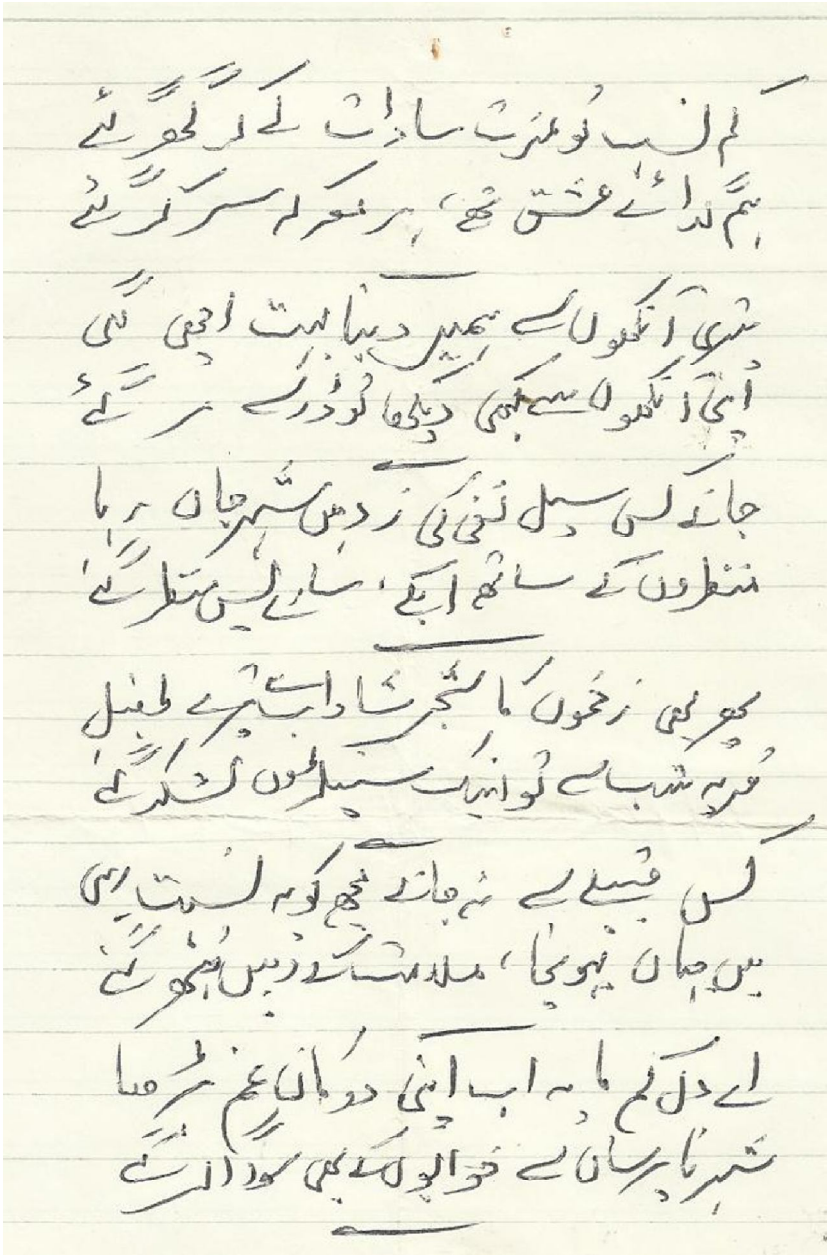

بشکریہ: ڈاکٹر ارشد رضا، مدیر 'اندیشہ' بھاگلپور

● غزلیں/انتخاب: اقبال حسن آزاد

لطف الرحمٰن

متاع عمر بھی تھی قرض دوستاں کی طرح
تمہاری یاد بھی ہے رنج رائیگاں کی طرح

ہوا ہے قتل مری طرح کون قسطوں میں
ہر ایک لمحہ رہا خنجر و سناں کی طرح

یہی ملا ہے مجھے اک عمر کی تلاش کے بعد
ترا یقین بھی آیا تو اک گماں کی طرح

یہی ہے مرکزی کردار اس فسانے کا
سنا رہا ہے جو اک شخص داستاں کی طرح

زمیں کے نیچے رسائی ہے دور تک جس کی
کھڑا ہوا ہے وہی پیڑ آسماں کی طرح

کوئی گیا تو ہے عجلت میں ہم سے آگے بھی
تنی ہے گرد جو راہوں میں سائباں کی طرح

◀◀ ● ▶▶

زور طوفان کا دریا کی روانی مانگے
حادثہ دل عجب طرز و معانی مانگے

ہر نئی صبح نئے درد کا عنوان بنے
رات ہر رات وہی یاد پرانی مانگے

دل کو ہے اب بھی تقاضائے محبت اس سے
پیڑ سوکھا ہوا موسم کی جوانی مانگے

عمر بھر لمحۂ برباد چُنا ہے میں نے
مجھ سے قصہ مرا آشفتہ بیانی مانگے

اب بھی نسبت ہے وہی دشت و بیاباں سے مجھے
زندگی مجھ سے تمہارا کوئی ثانی مانگے

◀◀ ● ▶▶

لطف الرحمٰن

غبار جاں تھا برابر کسی سفر میں رہا
وہاں صدا نہ لگا، میں کبھی نہ گھر میں رہا

ہر ایک شہر، ہر اک دشت میں پھرا برسوں
تری تلاش میں کس کس کی رہگذر میں رہا

نظر ٹھہر نہ سکی جم کے ایک منظر پر
ہمیشہ رنگ دگر، منظر دگر میں رہا

مرے زوال میں بھی ارتقا کی عظمت تھی
نئی سحر کی کرن چشم با خبر میں رہا

عجیب حادثۂ اتفاق ہوں میں بھی
کسی کا آب تھا، لیکن کسی گہر میں رہا

میں کٹ کے رہ گیا ہر اعتبار منظر سے
وہ اک اداس سا لمحہ مری نظر میں رہا

اُٹھا چکے ہیں عبادت میں جس کو اہل خدا
تپسّیا کا وہی دکھ مرے ہنر میں رہا

◀◀ ● ▶▶

نفس کی آمد و شد کا ہے سلسلہ باقی
ہے اب بھی راہ سے قدموں کا رابطہ باقی

تمام عمر سفر میں گذر گئی ہے مگر
وہی ہے اندر و باہر میں فاصلہ باقی

ہوا میں ہو گئی تحلیل خواہشوں کی دھمک
رگوں میں رہ گئی اک چیختی صدا باقی

تمام جسم کے رشتے بکھر گئے ہیں یوں
کہ خود سے بھی کوئی رشتہ نہیں مرا باقی

رتوں کے ساتھ روایت بدل گئی غم کی
بس اک لباسِ بدن کا ہے مرحلہ باقی

پڑا تھا منہ میں کبھی سیپ کا کسیلا بیج
زباں پہ اب بھی ہے وہ تلخیٔ مزا باقی

◀◀ ● ▶▶

لطف الرحمٰن

مدت پہ ہم ملے بھی تو اک فاصلہ رہا
وہ اپنا دکھ، میں اپنا کوئی سانحہ رہا

غم سے نباہ ہو تو گئی اب یہ سوچئے
ہم میں سے کون کس کے دکھوں کی صدا رہا

آگے بھی اک سکوت ہے پیچھے بھی اک سکوت
شہر صدا میں قافلہ اپنا رکا رہا

کس نام سے پکاریئے اس ایک شخص کو
پتھر کی بارشوں میں جو تنہا کھڑا رہا

وہ اعتبار کر نہ سکا، اعتبار پر
کس گم شدہ یقین کا نوحہ بنا رہا

آخر فصیل جسم بکھرتی چلی گئی
لمحوں کی زد پہ کون سلامت بچا رہا

◀◀ ● ▶▶

کسی بہانے سہی محو یاس ہونا تھا
ڈھلی ہے شام تو جی کو اداس ہونا تھا

میں تیرے پاس سے خود کو سمیٹ لایا ہوں
بس اس لئے کہ مجھے خود شناس ہونا تھا

یہ مجھ میں بولتی رہتی ہے، چھپ کے تیری ذات
مجھے تو تیری صدا کا لباس ہونا تھا

پکار آیا ہوں امکاں کی سرحدوں سے پرے
یہی کہ مجھ کو ترے آس پاس ہونا تھا

دیا تھا کس لئے پھر تو نے یہ لباس بدن
ترے حضور اگر بے لباس ہونا تھا

چلا ہوں لے کے وہی درد نا رسائی میں
مجھے بھی ساحل دریا کی پیاس ہونا تھا

◀◀ ● ▶▶

لطف الرحمٰن

سحر کی آنکھ میں شب کا خمار باقی ہے
رہا نہ شہر،مگر شہر یار باقی ہے

تری تلاش کا دکھ کتنے روپ بھرتا ہے
تو آ گیا ہے،ترا انتظار باقی ہے

میں بننے ہی سے بکھرنے لگا تھا لمحوں میں
ابھی تو اور مرا انتشار باقی ہے

تو جس کے سوگ میں خود گم شدہ رہا برسوں
گذر گئی ہے وہ رُت ،اب غبار باقی ہے

ابھی تو اپنی ہی ہستی کا بوجھ ڈھوتا ہوں
ابھی تقاضۂ لیل و نہار باقی ہے

عجیب کرب ہوں اظہار کی شکست کا میں
صدا تو ڈوب چکی ہے پکار باقی ہے

ابھی سے چھیڑ نہ بے حاصلی کے دکھ کی بات
ابھی تو راکھ میں پنہاں شرار باقی ہے

◀◀ ● ▶▶

سمندروں کو کہاں تک کھنگالتا جاؤں
میں خود میں ڈوب کے ہر شئے کو بھولتا جاؤں

تو کیا یہی مری پہچان رہ گئی ہے کہ اب
میں اپنے آپ کو ہر لمحہ ہارتا جاؤں

وہ تُل گیا ہے مجھے ریزہ ریزہ کرنے پر
میں اپنے آپ کو کتنا سمیٹتا جاؤں

یہ لوگ خواب ک سڑکوں پہ جا رہے ہیں کہاں
زباں سے کچھ نہ کہاں،صرف دیکھتا جاؤں

عجیب درد ہے یہ مجھ میں نا رسائی کا
میں تجھ کو پا کے بھی تجھ کو پکارتا جاؤں

یہ کیا ہوس ہے کہ ایسی بھی اک گھڑی آئے
تو ڈگمگائے میں تجھ کو سنبھالتا جاؤں

◀◀ ● ▶▶

لطف الرحمٰن

کسے خبر ہے کہ یہ سانحہ ہوا کیسے
میں اپنی ذات کا ڈر ہو کے رہ گیا کیسے

تمھارے بعد میں چپ کے حصار ہی میں رہا
تمھیں کہو کہ تمھیں پھر پکارتا کیسے

ترا کرم ہے کہ اظہار ہو گیا آساں
میں اپنے درد کا لہجہ سنوارتا کیسے

گیا نہ دل سے اداسی کا سخت سناٹا
تمہارے پاس بھی رہ کر ہوں ے صدا کیسے

میں سن رہا ہوں تری ڈوبتی پکار کی لَے
مگر مجھے یہ بتا ،تو ہوا رہا کیسے

◀◀ ● ▶▶

سطح سے بے تابیٔ دریا کا اندازہ نہ کر
میرا چہرہ دیکھنے والے مرے دل میں اُتر

جانے والا ایک لمحہ پھر نہ آیا لوٹ کر
منتظر ہوں آج تک میں وقت کی دہلیز پر

کتنی صدیوں سے کھڑی ہے سر پہ تیکھی دو پہر
کون سایہ دے گا،عریاں ہو گیا ہے ہر شجر

اس قدر غصے میں دریا آج تک بپھرا نہ تھا
کانپتے ہیں آج ساحل پر بنے ریتوں کے گھر

سنگ ہی بنیاد کا رکھا گیا تھا کج بہت
اب عمارت گر رہی ہے تو بہت حیرت نہ کر

◀◀ ● ▶▶

● عبدالوھاب قاسمی

رسالہ 'ثالث ۔۲'.....اور تخلیقی دھڑکنوں کی خوشبو

رسالہ 'ثالث' جنوری ۲۰۱۴ء تا مارچ ۲۰۱۴ء زندہ اور متحرک تخلیق کی تمام آہٹوں ،دھڑکنوں اور لہروں کا حسین استعارہ ہے.....!!

اس رسالے نے اپنی پہلی اُڑان سے ہی نگاہوں کو خیرہ کر کے اردو ادب کے کوچے میں ایک تہلکہ برپا کر دیا ہے۔اسکے پہلے شمارہ کو جتنی گواہیاں نصیب ہوئی ہیں ،شاید ہی کسی اور رسالہ کے پہلے شمارہ کو اتنی مقدر ہوئی ہوں گی۔یہ دراصل مدیران کی بیدار مغزی ،قلبی حساسیت ،حالات اور تقاضے اور ادب کے تئیں قاری کے رجحانات پر انکی گہری نظر کا عمدہ ثبوت ہیں۔

'ثالث ۔۲' پر نظر ڈالئے تو اس میں پہلے شمارہ میں پیش کئے گئے ادب کے ارتقاعی و ارتقائی زاویے روشن دکھائی دیتے ہیں اور ادب کی وہ بنیاد جو پہلے شمارہ میں رکھی گئی تھی (زندہ اور متحرک ادب کا ترجمان) تازہ شمارے میں بلند ہوتی ہوئی نظر آرہی ہے جو اس رسالہ کے خوش آئند کل کا حسین اشاریہ ہے۔

تازہ شمارہ میں ۱۱/افسانے شامل ہیں،اقبال حسن خاں،قاضی طاہر حیدر،قرب عباس،ابرار مجیب،سلمی جیلانی ،طلعت زہرا،زین سالک،ثناء غوری،امین بھایانی ،فرحین جمال،نوشابہ خاتون.....سبھوں کے افسانے عمدہ اور معیاری ہیں اور حالات،حادثات،المیے اور وقوعے کو آئینہ عطا کرتے ہیں۔ان میں تاثیری اور تقلیبی پہلو بھی روشن ہے اور عصری منظرناموں کو بڑے دلکش اور پرکشش طرز ادا کے ساتھ پیش کرنے کی سعی کی گئی ہے اور اس طرح نئے رجحانات اور نئے موضوعات سے قاری ادب کے بدلتے منظرناموں سے روشناس ہوتا ہے۔

مہمان اداریہ شفیق احمد شفیق کا ہے،انھوں نے ادب میں عصری آگہی اور ادیب کے عصری عرفان کی اہمیت کو مختلف تمثیلوں سے سپرد قلم کیا ہے۔انھوں نے جہاں ادیب کے حوالے سے یہ باتیں کہی ہیں۔

''یہاں یہ بات قابل لحاظ ہے کہ لمحۂ موجود کی صورت حال کے ردعمل میں قلمکار کا مجموعی رویہ کیا ہے،اس نے دنیا کے چھوٹے چھوٹے وقوعوں اور بڑے بڑے تغیرات کو کتنا اور کس قدر اپنے اندر جذب کیا ہے اور اس کا خارجی تجربہ اسکی داخلی دنیا سے ہم آہنگ ہو کر تخلیقی فعالیت کے کس منطقے پر نمود و ظہور کا باعث بنا

ہے؟'' وہیں ادب کے توسع پر ان خیالات کا اظہار کیا ہے۔

''ادب ماضی سے بھی کسب فیض کرتا ہے،تاریخ سے فائدہ اٹھاتا ہے،مگر ان پر کلی انحصار نہیں کرتا۔ادب سائنس اور تکنالوجی میں ہونے والی پیش رفت کو بھی نظر میں رکھتا ہے۔یہ سیاسی،تہذیبی،ثقافتی،علمی اور نفسیاتی عناصر و اقدار کو بھی جذب کرتا ہے۔ادب خارجی زندگی سے حاصل شدہ تجربات و مشاہدات کو فنی اور جمالیاتی انسلاک کے ساتھ ہمیں لوٹاتا بھی رہتا ہے''.....اور پھر عہد حاضر میں ادب نے جن چھوٹے بڑے وقوعوں اور ہر سطح پر رونما ہونیوالی تبدیلیوں کو مہمیز کیا ہے اس کی طرف مختصر اشارے بھی کئے ہیں مثلاً۔

''مذہبی تعصب اور بابری مسجد کا واقعہ،سیموئل ہن ٹنگ کے تہذیبی تصادم کا نظریہ،ایڈورڈ سعید کی مدافعانہ کوششیں ،نوم چسکی کا متوازن ناقدانہ رویہ،نیا عالمی نظام ،انفارمیشن ٹیکنالوجی میں آئے دن پیش رفتگی،گجرات کی خون آشام بربریت،۱۱/ستمبر کا سانحہ،ڈرون حملے اور اس کے بعد کے اثرات اور اس کے ردعمل میں امریکی رویہ،افغانستان کا منظرنامہ،عراق کی پسپائی اور بکھراؤ،پاکستان اور ہندوستان کے روابط،ثقافتی تھیسس اور انٹی تھیسس،ساختیات وغیرہ''۔آج کے ادبی منظرناموں کے حوالے سے یہ اداریہ کافی اہمیت کا حامل ہے۔

اس رسالہ میں تنقید اور خصوصی مطالعہ کے باب میں ۵/مضامین شامل ہیں،منظر اعجاز نے 'اردو شعراء کے انتقادی زاویے،الہام و اکتساب کے تناظر میں' بہت عمدہ اور شگفتہ مضمون قلم بند کیا ہے۔منظر اعجاز کو نئے نئے موضوعات سے بڑی دلچسپی ہے،اور یہ نئے موضوعات ان کے تنقیدی جدت کے بھی عکاس ہوتے ہیں۔انفرادی پہلو لئے ہوئے ان کا یہ مضمون شاعری کے حوالے سے شعراء کے اس نظریے کو آشکارا کرتا ہے کہ شاعری رشتۂ الہام سے مربوط ہے یا اکتساب سے.....انھوں نے نثری و شعری دونوں حوالوں سے اس رشتے کو نمایاں کرنے کی حسین جستجو کی ہے اور پورے مضمون کا ماحصل اپنے آخری پیرائے میں یوں پیش کر دیا ہے۔

''ان تصریحات و تفصیلات سے واضح ہے کہ شاعری الہام ہے لیکن اکتساب فن کے مشقت آمیز مرحلے سے گذرے بغیر شاعری مرتبۂ الہام تک نہیں پہونچ سکتی''۔نسیم سید کا مضمون 'مکان طاقت سے نجات کا تخلیقی منشور' پیغام آفاقی کے ناول 'مکان' کا حسین تجزیہ پیش کرتا ہے۔اس مضمون سے نسیم سید کے تنقیدی شعور کا عرفان ہوتا ہے۔وہ فن پارے کے باطن میں اتر کر اس میں موجزن لہروں پر گرفت کی قدرت رکھتی ہیں،پھر اس کے اظہار کی سلیقگی کا ادراک بھی۔ان کی نظر بین الاقوامی منظرناموں پر رہتی ہے،اسی لئے تو وہ اس ناول میں شمالی امریکہ کے مقامی باشندوں پر ٹوٹنے والی قیامت کی وحشتناکیوں کو دیکھ لیتی ہیں۔وہ لکھتی ہیں۔

''مکان کی داستان کو اگر ہم بین الاقوامی تناظر میں دیکھیں تو اسے دس ہزار سال قبل کے شمالی

امریکہ کے مقامی باشندوں کی اس داستان سے بھی جڑ پائیں گے جس میں اس زمین یا اس مکان کے اصل وارثوں کی مجبوری اور جدو جہد کی کہانی تفصیلا رقم ہے کہ کس طرح سفید نسل نے انہیں ان کے گھروں سے بے دخل کر کے ان کی زمین یعنی ان کے مکان پر قبضہ کرلیا''۔ابوفہد کا 'اسلامی افسانوی ادب' بے مقصدیت اور غیر اخلاقیت سے لبریز ادب کے خلاف ایک سنجیدہ احتجاج ہے۔انھوں نے ڈاکٹر محمد طارق ایوبی کو کامیاب مترجم کے طور پر پیش کرتے ہوئے بامقصد ادب پر ان کی خامہ فرسائی کے جذبے کو داد دی ہے۔

''ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی نے اس کتاب کا سلیس اور کسی قدر آزاد اردو ترجمہ کر کے اردو میں بھی اسلامی افسانوی ادب کی از سر نو بنا ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی نے بڑی اخاذ اور سیلانی طبیعت پائی ہے،ابھی تو ان کے قلم کی جولانیوں کی ابتداء ہے اور ابھی سے انہوں نے گراں قدر علمی، ادبی اور تحقیقی چیزیں پیش کر کے قارئین کو حیرت میں ڈال دیا ہے۔ان کا قلم جوش وجذبے سے بھرپور دکھائی دیتا ہے''۔یونس خاں نے مشرف عالم ذوقی کے ناول 'آتش رفتہ کا سراغ' کو نئے زاویے سے پیش کرتے ہوئے بین الاقوامی تاریخ سے اسکا انسلاک کیا ہے۔ڈاکٹر ریاض توحیدی 'متن اور تجزیہ' کے تحت پروفیسر حامد کاشمیری کے تنقیدی اجالوں کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے،مگر اختصار کے ساتھ صرف اقتباس پر اعتماد کیا ہے ،اس لئے اس کی اہمیت ذرا کم ہوگئی ہے اور پروفیسر حامدی کاشمیری کے تنقیدی زاویے پورے طور پر سامنے نہیں آسکے ہیں۔

ثالث ۔۲ میں ایک خاکہ 'رسیلے کٹیلے.....احمد عمر شریف' (ممتاز رفیق)، ناول کا ایک باب 'جسے میر کہتے ہیں صاحبو' (حبیب حق) اور ایک ناولٹ 'شریف زادی' (م۔ص۔ایمن) بھی شامل ہے۔خاکہ واقعی بڑا عمدہ اور جاندار ہے جو پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ناول کا ایک باب 'جسے میر کہتے ہو صاحبو!' مغربی تہذیب کی عریانیت کا کھلا باب ہے، جہاں محبت کے نام پر ہر گناہ کا جواز موجود ہے۔ناولٹ کو پڑھ کر م۔ص۔ایمن کے خلاقانہ ذہن کا احساس ہوتا ہے۔بڑی چابک دستی سے انھوں نے کہانی کی فضا کی تشکیل کی ہے۔ابتدائیہ پیرائے سے ہی قاری طلسماتی دنیا کا اسیر ہوجاتا ہے.....یہ ضرور ہے کہ یہاں کئی سوالات ذہن کو کریدتے ہیں کہ 'حلالہ' کی یہ صورت کیا واقعی زمینی ہے، یا محض تخیل کی بازیگری، یا پھر ایک نئے موضوع کی ہوس؟ اس لئے کہ ہر کہانی اپنے زیریں لہروں میں کسی نہ کسی زمینی وقوعے سے منسلک ہوتی ہے اور کہانی کار اپنے تخیل سے اس کے تانے بانے بنتا ہے۔م۔ص۔ایمن کی یہ کہانی بھی اپنے زیریں لہروں کے ساتھ سماج سے مربوط ہے۔انھوں نے 'حلالہ' جیسے اہم شرعی مسئلہ کو کہانی کا مرکزی روپ دے کر سماج کے کھوکھلے پن کو آئینہ عطا کیا ہے۔آج ذرا ذرا سی بات پر طلاق کا رجحان عام ہوتا جارہا ہے۔پھر بسا اوقات 'حلالہ'

تک کی نوبت آتی ہے،مگر حلالہ کا مرحلہ بڑا سنگین ہوتا ہے۔یہاں طلاق کے لئے شوہر ثانی کی رضا ضروری ہے۔اس پر کسی طرح کے جبر کا اختیار عورت کو نہیں۔اس لئے شوہر اول کے ساتھ رہنے کی خواہشمند طلاق شدہ عورتیں شوہر ثانی پر اپنی فدائیت وفنائیت کے جادو سے شوہر ثانی سے ہر شرط منواتی ہیں اور فریب کاری کے ذریعے ایک بار پھر طلاق شدہ ہوکر شوہر اول کے پاس لوٹ جاتی ہیں۔اس کہانی میں شریف زادی کا کردار انہیں خامیوں کو لئے سامنے آتا ہے۔اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ یہ ناولٹ زمینی بھی ہے،تخیلی بھی اور موضوعی اعتبار سے عام روشوں سے الگ بھی۔

غزلوں کی کہکشاں میں سید انور جاوید ہاشمی،سجاد ہاشمی،افتخار حیدر،عزیز نبیل،طارق متین،راشد طراز،،عارف شفیق،فہیم جوگاپوری،ظفر صدیقی،فوزیہ اختر،رفیق راز،نذیر آزاد اور علمدار عدم جیسے اہم نام شامل ہیں.....اور نظموں کا گوشہ صبا اکرام،ثروت زہرا،پرویز شہریار،ایس۔ایم۔عباس اور نوشی قیصر کی تخلیقات سے منور ہے۔پرویز اختر کے دوہے بھی شامل رسالہ ہے،انھوں نے آج کی سچائیوں اور صداقتوں کو دوہے کا لباس پہنایا ہے۔یہ اشعار دیکھیں ؎

کیا تجھ کو معلوم ہے ،لالچ کا اتہاس — تنہا ہر اک آدمی ،کون کسی کے ساتھ
بڑا بول مت بولیو ،سمے بڑا بلوان — دو،دو کوڑی میں بکا سب کا سوا بھیمان
سرمایہ جتنے بڑھے ،بڑھتی جائے پیاس — سولہ آنے سچ کہے ،پرویز اختر بات

اس شمارے میں ایک انٹرویو اور کچھ تبصرے بھی شامل ہیں،یہ انٹرویو راشد اشرف سے فرزانہ اعجاز کا لیا ہوا ہے،جو محض رسمی نہیں بلکہ بہت سی معلومات کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔

رسالے کے مدیران اقبال حسن آزاد اور ثالث آفاق صالح بجا طور پر مستحق مبارکباد ہیں کہ انھوں نے اس رسالہ کے ذریعے ادب کو نئی تازگی اور نئی توانائی عطا کرنے کا حوصلہ کیا ہے۔یہ رسالہ شاہ کالونی شاہ زبیر روڈ مونگیر بہار سے حاصل کیا جاسکتا ہے،مزید تفصیلات کے لئے اس نمبر پر رابطہ بھی کیا جاسکتا ہے

09430667003

◂◂ ● ▸▸

تبصرہ

نام کتاب: اردولسانیات
مصنف: علی رفادفتیحی
صفحات: 252
قیمت-/98 روپے
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردوزبان،نئی دہلی
مبصر:محمد نہال الدین ،پروجیکٹ فیلو ڈی۔آر۔ایس ، ایس ۔اے۔پی۔II شعبہ لسانیات ، اے۔ایم۔یو، علی گڑھ

پروفیسرعلی رفادفتیحی کا نام کسی تعارف کا مہتاج نہیں۔اپنے علمی ولسانی کارناموں کے سبب ان کا شمارعلمی دنیا کے بڑے ناموں میں ہوتا ہے۔انھوں نے لسانیات کے موضوع کو اپنے عمیق مطالعے اور بر سہابرس کے تدریسی تجربے سے فکری تنوع عطا کیا ہے۔

'اردولسانیات'۲۵۲صفحات اور۱۳ابواب پر مشتمل ہے۔ابتدائی سات ابواب میں اردوزبان اوراس کے صوتی،صرفی،نحوی اور معنیاتی متعلقات پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔بعد کے چھ ابواب میں اردوزبان کی تاریخ اور لسانی رشتوں کا قدرے تفصیل سے جائزہ پیش کیا گیا ہے۔طلبہ کی آسانی کے لئے ہر باب کے آخر میں اس کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے۔ہر بحث کی بہتر تفہیم کے لئے کئی کئی مثالیں دی گئی ہیں.....مثالیں ایسی کہ جو سامنے کی ہوں تا کہ ذہن مشکلات سے دوچار نہ ہو،انداز ایسا دلکش اور تحریر ایسی شگفتہ کہ دماغ سے دل میں اتر جائے۔

پہلے باب کا عنوان ہے علم صوتیات جس کے تحت صوتیاتی مطالعے کی غرض و غایت،صوتیات اوراس کی شاخیں تلفظی صوتیات، سمعی صوتیات،سمعیاتی صوتیات زیر بحث آئی ہیں۔مصمتے کے ذیل میں مخرج،طریقہ تلفظ یعنی آوازوں کی ادائیگی کے طریقوں بندشی طریقۂ تلفظ،انفی طریقۂ تلفظ،صفیری طریقۂ تلفظ، پہلوئی طریقۂ تلفظ،ارتعاشی طریقۂ تلفظ اور تھپک دار طریقۂ تلفظ پر ماہرانہ گفتگو کی گئی ہے۔

دوسرا باب اصول فونیمیات کے نام سے موسوم ہے جس میں فونیمیات کے جامع تعارف کے

ساتھ ساتھ فونیمیات کی اصطلاحات یعنی صوتیہ، تکمیلی تقسیم،تخالفی اصوات مشتبہ جوڑا،اقلّی جوڑا،ذیلی اقلّی جوڑا، ملتے جلتے ماحول،باہمی اخراجی ماحول،باہمی شمولی ماحول وغیرہ کی وضاحت پیش کی گئی ہے۔ساتھ ہی صوتی چارٹ،اصوات کے مشتبہ جوڑوں اور غیر مشتبہ اصوات کی فہرست بھی شامل کی گئی ہے۔

تیسرا باب اردوفونیمیات کے سلسلے میں ہے جس میں اردو کے مصوّتی فونیم،اردو کے مصوتی ذیلی فونیم،اردو کے نیم مصوّتی فونیم، اردو مصمّتے ، اردورکن،اردو کے دوہرے مصوّتے،اردو میں مصوّتی تسلسل،مصمتی خوشے،درمیانی مصمّتی خوشے،آخری مصمّتی خوشے،فوق قطعی فونیم،اتصال،سرلہر وغیرہ پر مدّلل اظہار خیال کیا گیا ہے۔

چوتھے باب میں اردوحروف تہجی اوراس کے ذیلی عنوانات حروف کی درجہ بندی،اعراب،اردو مصمتوں کی فونیمی ہجائی مطابقت،ہائے مختفی،واوِمعدولہ،واوِعطف،اضافت،اضافتِ زیر،اضافتِ ہمزہ،اضافتِ لام، اردو کے ہندی الاصل مصمتے،ہم صوت حروف،نیم مصوّتے،اردورسم الخط اور کمپوٹر وغیرہ زیر مطالعہ آئے ہیں۔

اردوصرف پانچویں باب کا عنوان ہے۔جس میں صرف اور اشتقاق کی تعریف پیش کرتے ہوئے اشتقاقی سابقے، لاحقے،وسطیے، مبادلے،مقلوب اشتقاقی،لفظی تکرار،تراکیب لفظی، مرکب عطفی واضافی،ترکیب بالہمزہ،یائے مخلوط اور ترکیبوں کی مختلف صورتوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ساتھ ہی زبان کی ترسیل اور الفاظ کی تشکیل میں ان کے مرکزی رول کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔

چھٹے باب میں اردونحو کی تعریف، جملے کی ساخت اور اسکے اجزاء یعنی شمول،قریبی شمول اور آخری شمول وغیرہ کی وضاحت پیش کی گئی ہے۔

ساتواں باب اردومعینات، کے سلسلے میں ہے جس میں لفظ ومعنی کے درمیان رشتے،لفظوں کے انتخاب،تقدیم وتاخیر،ترتیب وتنظیم، ماحول،حوالے،محلّ وقوع اور سیاق کی تبدیلی سے مفہوم میں رونما ہونے والی تبدیلیوں اور صحافتی وادبی زبان کے مابین فرق کی وضاحت پیش کی گئی ہے۔

آٹھواں باب ہندوستان کے لسانی پس منظر،نواں ہندوستان کی لسانی تہذیبی روایت، دسواں ہندآریائی زبانوں کی لسانی خصوصیات،گیارہواں اردوزبان کے ارتقائی سفر اور قدیم اردو کی لسانی،صوتی، صرفی،نحوی،حرفی،لغوی اورادبی خصوصیات کے سلسلے میں ہے۔

بارہویں باب میں اردو کے آغاز واتقا کے نظریات پر تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے جبکہ تیرہویں اور آخری باب میں دکنی اردو کی لسانی وعلاقائی خصوصیات زیر بحث آئی ہیں۔

ہر باب کے آخر میں باب کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے تا کہ طلبہ آسانی سے بحث کو ذہن نشیں کرلیں

بطور مثال پانچویں باب کا خلاصہ پیش ہے۔

☆ 'صرف' لفظ کی ساخت کا مطالعہ پیش کرتا ہے۔

☆ لفظوں کا مارفیمی تجزیہ تصریفی (Inflectional) اور اشتقاقی (Derivational) اصولوں پر ہوتا ہے۔

☆ سابقے الفاظ کے وہ روپ ہیں جو اصل (Stem) کی ابتدا میں ملحق کئے جاتے ہیں۔

☆ لاحقے، سابقوں کی طرح ہی بالعموم پابند روپ ہوتے ہیں لیکن بعض لاحقے آزادانہ طور پر استعمال ہونے کی بھی صلاحیت رکھتے ہیں۔ لاحقے لفظ کے آخر میں آتے ہیں۔

☆ اشتقاق کی ایک صورت یہ بھی ہوتی ہے کہ اصل لفظ کے وسط میں بھی کسی مصوتے کا اضافہ کر کے معنی و مفہوم میں حسب ضرورت تبدیلیاں کر لیتے ہیں، انھیں وسطیہ کہتے ہیں۔

☆ اصل لفظ میں مصوتوں کی تبدیلی سے نئے الفاظ وضع کر لیے جاتے ہیں۔ اس عمل کو اشتقاقی مبادلہ کہتے ہیں۔

☆ کسی لفظ کو مکرر لا کر ایک نئے لفظ یا ترکیب کو وضع کرنا لفظی تکرار کہلاتا ہے۔

☆ مرکب الفاظ یا ترکیب لفظی دو آزاد الفاظ کی ترتیب سے تشکیل دیے جاتے ہیں۔

☆ مخلوط اشتقاقی ایسی ترکیبوں کو کہتے ہیں جن کا ایک لفظ اردو کا ہو جب کہ دوسرا لفظ کسی دوسری زبان کا۔ ایسی ترکیبیں مخلوط ترکیبیں یا Hybridized کہلاتی ہیں۔ ان معروضات کی روشنی میں تین باتیں بڑے وثوق سے کہی جا سکتی ہیں۔ ۱۔ یہ کتاب لسانیات کے موضوع پر اردو میں اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔ اس لیے اس موضوع پر آئندہ لکھی جانے والی کتابوں کے لیے مستند حوالے کا درجہ رکھے گی۔

۲۔ U.P.S.C ۔ U.G.C اور دیگر مقابلہ جاتی امتحانات میں بے حد مفید ثابت ہوگی۔

۳۔ موضوع کی اہمیت، معلومات کی یکجائی اور اسلوب کی انفرادیت کے سبب یہ کتاب مقبول خاص و عام ہوگی۔

مختصر یہ کہ کتاب مواد اور پیشکش دونوں اعتبار سے عمدہ ہے۔ میری رائے میں اگر اس میں بعض مباحث جیسے (۱) لسانیات: تعارف، اہمیت و ضرورت (۲) زبان: ماہیت، اقسام، زبان و بولی میں فرق کا اضافہ کر لیا جاتا تو کتاب کی قدر و قیمت اور بڑھ جاتی۔ بہر کیف اس تصنیف پر مصنف قابل مبارک باد ہیں۔

◀◀ ● ▶▶

مکتوبات

● آپ نے کتابی سلسلہ 'ثالث' کا پہلا شمارہ بھیجا۔ اس کے لیے ممنون ہوں۔ میں ملک سے غیر حاضر تھا۔ پاکستان کا دورہ تین ہفتوں کے لئے اور پھر یورپ کا دورہ دو ہفتوں کے لئے۔ مجھے یاد نہیں ہے کہ میں نے آپ کو اس کی رسیدگی کی اطلاع بھی دی تھی یا نہیں۔ اگر نہ دی ہو، تو معافی چاہتا ہوں۔ ایک نظم حاضرِ خدمت کر رہا ہوں۔ اسی صفحے پر موجود ہے۔ شاملِ اشاعت کریں۔

ستیہ پال آنند (امریکہ)

● آپ کے ثالث کے لئے افسانہ ٹاؤن کمیٹیؔ حاضر ہے۔ امید ہے پسند آئے گا۔ فیصل آباد سے میں نے سیمی کرن صاحبہ کو بہ طور خاص ثالث کے لئے افسانہ بھیجنے کے لئے کہا۔ ان کے افسانے 'طاہرہ..... سنو' کو میں نے نہ صرف دیکھا ہے بلکہ جہاں ضروری سمجھا اس کے سقم دور کر دیئے ہیں..... سیمیں صاحبہ کی اجازت سے۔ اتنا عمدہ اور کاٹ دار افسانہ ہے کہ خواہش ہوئی کہ اپنے ثالث میں شایع ہو۔ امید ہے آپ کو پسند آئے گا۔ یہ غیر مطبوعہ ہے۔ پاک و ہند کے کسی ادبی جریدے میں شایع نہیں ہوا۔

محمد حامد سراج (میانوالی، پاکستان)

● آج جمعرات اور جنوری کی ۲۲ تاریخ ہے۔ کل دن کے دو بجے ڈاکیہ نے زندہ اور متحرک ادب کا ترجمان اردو سہ ماہی 'ثالث' کا کتابی سلسلہ نمبر ۲ دے گیا۔ رسالے کے موصول ہونے سے پہلے تک مجھ پر گہری اداسی چھائی ہوئی تھی۔ بات یہ ہے کہ ۱۷ جنوری کو میرے بھانجی داماد کا انتقال ہو گیا۔ بھانجی عین جوانی میں بیوہ ہو گئی ہے۔ اس کے دو بیٹی اور دو بیٹے ہیں۔ ابھی چوتھا دن بھی نہیں گزرا تھا کہ میری خالہ دنیا سے گزر گئیں۔ صدمے پہ صدمہ..... کہاں سے برداشت کی قوت لاؤں۔ ایسی حالت میں 'ثالث'' نے پہنچ کر کسی حد تک غمگساری کا فریضہ ادا کیا۔ جب تک یہ مطالعہ میں رہا احساس زیاں کچھ کم رہا۔ آپ حضرات کا بے حد شکر گزار ہوں کہ سلسلہ ہائے نوازش 'ثالث' کی صورت میں جاری رکھا ہے۔ آپ نے میرے مقالے کو پسند کیا اور اسے 'مہمان اداریہ' کے طور پر شائع کیا ہے۔ یہ آپ کی ذرہ نوازی ہے اور ادب و تنقید شناسی کا ایک مستحسن حوالہ بھی پیش کیا ہے۔ اگر

اس اقدام پر آپ کی توصیف نہ کی جائے تو حد درجہ بداخلاقی اور ناانصافی ہوگی۔لہذا میں تہہ دل سے آپ حضرات کی سچی قدردانی کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ ہر اچھے لکھنے والوں کی اسی طرح پذیرائی کا سلسلہ جاری رکھیں گے۔اداریہ اظہار حقیقت کی مثالیہ ہے۔میں نے اپنے ایک مضمون میں یہی کچھ لکھا تھا، ملاحظہ کریں۔

'تمام اہلِ علم اور اہل ادب جانتے ہیں کہ اردو میں ادبی رسالہ نکالنے والا کسی معالج کی سند کے بغیر پاگل تسلیم کیا جاتا ہے کہ ادبی رسالہ نکالنا سراسر گھاٹے کا سودا ہے۔اور یہ گھاٹے کا سودا وہی کرتا ہے جس پر جنون طاری ہوتا ہے۔یعنی قیس وفرہاد ہوتا ہے اور شوق اور جنوں سود وزیاں سے بے پروا ہوتا ہے۔اس لئے اپنی جیب اور گھر کے خرچ سے ادبی جریدہ شائع کرتا ہے۔یہ لیلائے اشتہار کے لئے کبھی تجارتی اداروں کے دشت میں مارا مارا پھرتا ہے اور کبھی کوہ تجار سے جوئے شیر نکالنے کی سعیٔ ناکام کرتا ہے اور اپنا سا منہ لے کر رہ جاتا ہے.....صہبا لکھنوی صاحب (تاریخ ساز ماہنامہ 'افکار' کے مدیر) مفت میں کسی کو رسالہ کم ہی دیتے تھے۔انھوں نے رسالے کے حوالے سے دو بہت ہی خوب صورت اصطلاحات کی اختراع کی تھیں اور اب وہ سکہ رائج الوقت کی طرح چل پڑی ہیں۔سالانہ خریداری اور سالانہ خریدار کے لئے 'زرِ رفاقت' اور 'رفیق افکار' کی اصطلاحات علی الترتیب وضع کیں۔ان اصطلاحات کی وساطت سے انھوں نے بڑے سے بڑے اور چھوٹے سے چھوٹے قلم کاروں سے 'زرِ رفاقت' وصول کیا اور ان کو 'رفیق افکار' بنایا اور وہ بخوشی بنتے رہے.....سوال یہ ہے کہ صہبا لکھنوی کیوں مفت رسالے تقسیم کرتے یا بانٹتے۔ذرا غور کریں ہم کھانا کھاتے ہیں اس پر خرچ کرتے ہیں، بیمار ہوتے ہیں تو علاج کراتے ہیں، اپنی پسند کے اپنی حیثیت کے مطابق کپڑے خریدتے ہیں، سلائی دیتے ہیں، تقریبات میں جاتے ہیں تو تحائف بھی دیتے ہیں، چھٹیوں میں گھومتے پھرتے ہیں اپنی پسند کی چائے کافی، برگر، کباب، پراٹھے خرید کر کھاتے ہیں، بس اور مکان کا کرایہ دیتے ہیں، مہمان کی خاطر تواضع کرتے ہیں.....غرض ہر کام کے لئے آپ پیسے خرچ کرتے ہیں مگر سو دو سو روپے کا رسالہ نہیں خرید سکتے۔کیا مدیر کو کمپوز کے پیسے نہیں دینے پڑتے، پیسٹنگ کا معاوضہ اسے نہیں دینا پڑتا، کیا کاغذ بازار سے مفت مل جاتا ہے اور پریس والا، جلد ساز، لیمونیشن والے اور دیگر متعلقہ لوگ بغیر قیمت اور اُجرت کے رسالہ چھاپ کر جلد سازی اور لیمنیشن کے بعد مدیر کو بطور تحفہ ہر تین ماہ پر دے دیتے ہیں۔میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ شوقین حضرات شکوہ تو کرتے ہیں مگر شوق کی تکمیل کے لئے ان کے پاس پیسہ نہیں ہوتا جب کہ شوق اور جنوں میں تو سود وزیاں کی

کوئی گنجائش ہی نہیں۔اس سے یہ بات واضح ہے کہ شوقین حضرات کا شوق وجنوں خام ہے اور وہ بخالت کی حد تک مفت میں رسالہ لینا چاہتے ہیں۔ایک رسالے کے شائع کرنے میں اتنے سارے روپے خرچ ہوتے ہیں اگر یہ روپیہ واپس نہیں آئے تو اگلے شمارے کی اشاعت کیسے ممکن ہوگی۔''

میں آپ کی ہمنوائی کرتے ہوئے ہر اردو داں سے جو رسائل پڑھتے ہیں ادب کے ساتھ التماس کرتا ہوں کہ ؎

اوروں کی طرف پھینکو ہو گل بلکہ ثمر بھی　　اے خانہ بر انداز چمن کچھ تو ادھر بھی

ہر ضرورت کی تکمیل کے لئے جہاں پیسے خرچ کئے جاتے ہیں وہاں کچھ پیسے علم، ادب اور زبان کے لئے بھی خرچ کر دیئے جائیں تو کوئی برائی نہیں۔بس جذبے اور احساس ذمہ داری کی بات ہے۔

ع

قطرہ قطرہ موج دریا می شود

دو دنوں میں تو پورا رسالہ پڑھ نہیں پایا ہوں تاہم جو چیزیں پڑھیں اچھی اور معیاری لگیں۔سعید رحمانی صاحب کی حمد اور عزیز فیصل کی نعت اظہار عقیدت ومحبت کے پاکیزہ فن پارے ہیں۔سعید رحمانی صاحب کا یہ شعر خاص طور سے پسند آیا ؎

دے کے محبوب کے ہاتھوں میں ہدایت کی کتاب　　آدمی سے ہمیں انسان بنایا تو نے

ڈاکٹر منظر اعجاز کا مقالہ 'اردو شعراء کے انتقادی زاویئے' محنت وتحقیق کا نمونہ ہے۔انھوں نے الہام واکتساب کے حوالے سے بڑی عرق ریزی سے کام لیتے ہوئے تحقیق کے فرائض سے بحسن وخوبی　　عہدہ برآ ہونے کی کوشش کی ہے۔موضوع کے تناظر میں مختلف اہل قلم واہل فکر کی متضاد آراء اور اشعار کو ایک تسلسل کے ساتھ سمیٹ کر اپنے موضوع کو ایک نکتے پر لاکر بڑی عالمانہ انداز میں مرکوز کیا ہے۔

تجزیاتی مطالعہ ایسا پیش کیا جائے جس سے زیر مطالعہ تخلیق کو بڑھنے کی بے تحاشا للک اور چاہت پیدا ہو جائے۔اس لحاظ سے محترمہ نسیم سید اور یونس خان نے اپنے اپنے حاصل مطالعہ میں اس بات کی کوشش کی ہے کہ ناول کا مجموعی انتقادی جائزہ اس طرح پیش کیا جائے کہ لوگ اس ناول کو پڑھنے کے لئے بے چین ہو جائیں، ساتھ ہی قارئین کو اس تجزیاتی مطالعہ کے مطالعہ سے تجزیہ نگار کے اسلوب تنقید، اصابت رائے اور وسعت مطالعہ کے بارے میں بھی معلومات حاصل ہو جائے۔پیغام آفاقی کے ''مکان'' پر تجزیہ کرتے ہوئے ان کا یہ کہنا،

''بلراج ورما صاحب نے گو ایک گہری بات کی ایک جملے میں مکان کے حوالے سے کہ نیرا ایک لڑکی

نہیں بلکہ ہندوستان کی وہ اقلیت ہے جو اکثریت سے برسرپیکار ہے۔ میں اس بات کو آگے بڑھانا چاہوں گی۔ میں سمجھتی ہوں کہ 'مکان' صرف ہندوستان کی اقلیت کے اکثریت سے برسرپیکار ہونے کی داستان نہیں ہے بلکہ دنیا کے ہر اس بظاہر کمزور لیکن کسی چٹان سے زیادہ مضبوط انسان کی داستان ہے جو طاقت سے برسرپیکار ہے۔ اگر اس کو دنیا کے نقشے پر کھنچی ہوئی لکیروں کو مٹا کے دیکھا جائے تو یہ ایک بہت بڑے کینوس پر بنائی ہوئی تصویر ہے۔'' محترمہ کی اس بات سے یہ ثابت ہے کہ انھوں نے نہ صرف ناول میں بسی ہوئی پوری دنیا کا مطالعہ ایک فکشن کے فن پارے کی حیثیت سے کیا ہے بلکہ نہایت دل جمعی کے ساتھ ہر واردات کو محسوس کیا اور ہر کردار کے جذبات اور اس کی داخلی دنیا تک رسائی بھی حاصل کی ہے۔ اس تبصرے میں اور بھی خوبیاں ہیں جن کا حوالہ دیا جاسکتا ہے مگر تجزیے پر تجزیہ کرنا آپ کے رسالے کے کاغذ کو ضائع کرنے کے مترادف ہوگا۔

مشرف عالم ذوقی جانے پہچانے اور مانے ہوئے قلمکار ہیں۔ ان کے ناول 'آتش رفتہ کا سراغ' پر یونس خان کا حاصل مطالعہ بہت خوب ہے۔ انھوں نے جس طرح جم کر ناول کے متن کا پرت پرت مطالعہ کیا ہے اور اس کا جو حاصل قارئین ثالث کو پیش کیا ہے وہ لائق ستائش ہے۔ ناول کے تجزیے کو پڑھ کر جب اس قدر دل میں جذبات و احساسات کے جوار بھاٹے پیدا ہوئے ہیں اگر ناول پڑھ لیا ہوتا تو نہ جانے کائنات دل اور بحر احساسات و جذبات کا کیا عالم ہوتا۔ ناول کا موضوع بلا شبہ اہم ہے۔ ناول کا تجزیہ جو یونس خان نے پیش کیا ہے اس کے مطالعہ سے غالبؔ کا ایک شعر دل سے ہوتا ہو دماغ تک اور دماغ سے زبان پر آ گیا ہے مگر کچھ ترمیم کے بعد پیش کرتا ہوں۔

دیکھنا تحریر کی لذت جو اس نے لکھا میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

ناول نگار نے ایشیا اور پورے عالمی تناظر میں صرف ایک مذہب کے ماننے والوں کے ساتھ جو متعصّبانہ، معاندانہ اور فریب کارانہ رویہ جاری ہے اس کی بے حد فنکارانہ انداز میں عکاسی کی کوشش کی ہے۔ اس کتاب پر یونس خان کا تجزیہ جس پائے کا ہے اس سے 'آتش رفتہ کا سراغ' کا سراغ بڑے موثر انداز میں ملتا ہے۔ تجزیہ نگار کا یہ کہنا کہ،

''عالمی طاقتیں اپنے تمام انفرا اسٹرکچر، اپنے وسائل اور اپنے لاجسٹک سپورٹ سے اس دہشت گردی کو بڑھاوا دے رہی ہیں۔ افغانستان سے عراق اور پاکستان سے کشمیر تک صرف ایک تہذیب رہ گئی ہے اور وہ ہے دہشت گردی کی تہذیب۔ نئی دنیا اسی تہذیب کے سائے میں پل رہی ہے۔ جارج بش نے مسلمانوں کی طرف بندوق تان کر دہشت گردی کی اس تہذیب کو بڑھاوا

دینے کے لئے ایک غیر محفوظ امریکہ کو جنم دیا اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب عالمی سیاست صرف ایک خوف کا بوجھ اٹھا رہی ہے اور وہ ہے دہشت گردی۔''

آگے چل کر مسلمانوں پر الزام تراشی کے باب میں وہ مزید لکھتے ہیں۔

''ہندوستان کا ہر مسلمان آتنک وادی ہے۔ لیکن ملک میں سب سے بڑا آتنک وادی حملہ بابری مسجد پر ہوا تھا۔ اس مسجد کو ڈھانے میں کون لوگ شامل تھے، یہ ساری دنیا جانتی ہے۔ یہ عقدہ بھی کھل چکا کہ یہ طاقتیں مسلمانوں کو کمزور کرنا چاہتی ہیں۔ اور یہ طاقتیں ان جگہوں پر ہی ہاتھ ڈالنا پسند کرتی ہیں جہاں مسلمان معاشی اور اقتصادی طور پر مضبوط ہیں۔''

یہ خیالات، جذبات اور احساسات صرف ذوقی اور یونس خان ہی کے نہیں ہیں بلکہ ایشیا یورپ اور ان تمام علاقوں میں جہاں جہاں مسلمان آباد ہیں اور غیر مسلموں کے مجرمانہ اور متشددانہ رویوں کا شکار ہیں۔ غیر مسلم متحد ہو کر صلیبی جنگ میں اپنی شرمناک شکست کا بدلہ لے رہے ہیں۔ مگر تاریخ گواہ ہے کہ مسلمانوں نے جنگ کے دوران بھی اور جنگ میں فتح حاصل کرنے کے بعد بھی شکست خوردہ دشمنوں سے اعلیٰ انسانی اقدار کا مظاہرہ کیا رحم و کرم سے کام لیا۔ آج کے مٹھی بھر صاحب اقتدار عیسائیوں، ہندوؤں اور اسرائیلوں کی طرح مسلمان فاتحین نے سازشیں نہیں کیں، معاندانہ رویہ اختیار نہیں کیا۔ جس طرح آج کل یہ غیر مسلم طاقتیں کرائے کے لوگوں کو مسلمان کے روپ میں پیش کر کے ان سے دہشت گردی کروا کے مسلمانوں سے انتقام لے رہے ہیں۔

ابوفہد صاحب کا مضمون بھی ہمیں دعوت فکر دیتا ہے۔ انھوں بہت عمیق انداز میں کتاب کا تجزیہ کیا ہے۔ اور اپنے زیر نقد کتاب کے حوالے سے کافی معلومات فراہم کی ہیں۔ ڈاکٹر ریاض توحیدی نے بھی پروفیسر حامدی کاشمیری کے مضامین کے مجموعے 'متن اور تجربہ' کے بارے میں اپنے خیالات اقتباسات دے دے کر پیش کیا ہے۔ افسانوں میں شروع کے تین افسانے پڑھ پایا ہوں۔ افسانے موضوع اور اسلوب کے لحاظ سے دل کے تاروں کو چھیڑتے ہیں۔

اتنا اچھا رسالہ جس میں مطالعہ کے لئے اس قدر قیمتی مواد موجود ہو وقت پر شائع کرنا ایک انتہائی مشکل کام ہے۔ اس کے لئے آپ لوگ (جناب اقبال حسن آزاد اور ثالث آفاق صالح صاحب) لائق ستائش ہیں۔ اللہ آپ لوگوں کے حوصلے کو بلند رکھے اور کامرانی آپ کے قدموں کو چومے۔ آمین۔ سدا نغمہ بار رہیں۔

شفیق احمد شفیق (پاکستان)

● مجھے آپ کا موقر جریدہ 'ثالث' (جنوری ۲۰۱۴ تا مارچ ۲۰۱۴ء) پڑھنے کا موقع ملا۔ مجھے اس کی

پروڈکشن اور مندرجات کے معیار نے بے حد متاثر کیا۔ بڑے بڑے ادبی مراکز سے علمی و ادبی جرائد کا اجرا تو ایک معمول کی بات ہے لیکن مونگیر جیسے دور دراز علاقے میں رہتے ہوئے آپ اور آپ کے رفقائے کار اردو زبان و ادب کی جو گراں قدر خدمت کر رہے ہیں وہ ایک انتہائی مستحسن اقدام ہے۔ آپ سب لوگوں کو میں 'محسنینِ اردو' قرار دیتا ہوں اور آپ کی بے لوث کاوشوں کو ہدیہ تبریک پیش کرتا ہوں۔

زیرِ نظر شمارے میں 'مہمان اداریہ' (شفیق احمد شفیق)، 'اردو شعرا کے انتقادی زاویے' (منظر اعجاز)، 'اسلامی افسانوی ادب' (ابو فہد) اور 'مکان، طاقت سے نجات.....' (نسیم سید) بہت پسند آئے۔ افسانے چند ہی پڑھ سکا۔ 'بوڑھا اور سمندر' (طلعت زہرا) 'گڑ کی ڈلی' (امین بھایانی) اور 'افواہ' (ابرار مجیب) بہت عمدہ تحریریں ہیں۔ تاہم ناولٹ 'شریف زادی' (م۔ص۔ایمن) اس پرچے کی جان ہے۔ مصنف نے جس تجسّس آمیز اسلوب میں یہ کہانی رقم کی ہے اس کی جتنی بھی داد دی جائے کم ہے۔ انھوں نے ایک منفرد موضوع کا انتخاب کیا اور اسے تمام ضمنی مضمرات کے ساتھ 'شرعی حدود کی پاس داری کرتے ہوئے' پوری طرح نبھایا۔ احمد عمر شریف کا خاکہ 'رسیلے کٹیلے' (ممتاز رفیق) دلچسپ ہے جبکہ راشد اشرف کا انٹرویو (فرزانہ اعجاز) ادب کے بہت سے اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے۔ راشد اشرف ایک محنتی اور مخلص نوجوان ہیں۔ وہ اردو کی ترویج و ترقی کے لیے کوشاں ہیں اور اس طرح کہ ع نہ ستائش کی تمنا، نہ صلے کی پروا۔ شعری تخلیقات کا انتخاب بھی خوب ہے۔ الغرض 'ثالث' ایک جامع، دلچسپ اور معلومات افزا جریدہ ہے۔ میں اس کی اور اس سے وابستہ تمام افراد کی کامیابی کے لئے دعا گو ہوں۔ اظہارِ تشکر کے طور پر اپنی ایک ہلکی پھلکی تحریر بعنوان 'ہوئے مر کے ہم جو زندہ' *ای میل کے ذریعے آپ کو بھیج رہا ہوں۔ مجھے پرچہ بذریعہ ڈاک بھیجنے کا مالی بار نہ برداشت کریں۔ تازہ اشاعت پر مجھے ای میل کر دیں اور میں نیٹ پر اس کا مطالعہ کر لوں گا۔ اپنے تمام احباب تک میرا پر خلوص سلام پہنچا دیں۔

ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی (پاکستان)

● قدیم چینی شاعری سے انتخاب میں کچھ نظمیں اور ایک شمالی امریکی ادب سے انتخاب میں ایک افسانہ ارسال کر رہا ہوں۔ افسانہ طویل ہے۔ ہوا کچھ یوں ہے کہ میں اپنے خیال میں اسے دو ماہ پہلے آپ کی نذر کر چکا ہوں لیکن یہ میری بھول تھی۔ ابھی میں نے چیک کیا تو پتا چلا کہ ایسا نہیں ہے۔ آج کل پہلی جنگ عظیم کے حوالے سے بھی صدی منائی جا رہی ہے اور بین الاقوامی طور پر اس

پر بھی کافی کچھ لکھا جا رہا ہے۔ میرے پہلے والے مضمون میں بھی جنگ عظیم اول کے متعلق مواد موجود ہے اسے پر بھی غور کیا جا سکتا ہے۔ امید ہے یہ شذرہ آپ کو پسند آئے گا۔

یونس خان (پاکستان)

● آپ کی توجہ پر بے حد ممنون ہوں۔ افسانہ 'ابو پاری' ان پیج میں حاضر ہے۔ چونکہ یہ سوفٹ ویئر میرے پاس نہیں ہے۔ اس لئے املا نہیں دیکھ پائی ہوں۔ آپ سے نظر ثانی کے لئے مودبانہ گزارش ہے۔ اسی لئے یونی کوڈ اور پی ڈی ایف فائل بھی بھیج رہی ہوں تا کہ درستگی میں آسانی رہے۔ پھر بھی کوئی دقت ہو تو مجھے ضرور بتائیے گا۔ میں ہر ممکن کوشش کرونگی کہ آپ کو تکلیف اور زحمت سے بچا سکوں۔

ڈاکٹر نگہت نسیم (سڈنی)

● ثالث ۔۲ ملا۔ نظم کی اشاعت کا شکریہ! اس شمارے کے مشمولات، شعری اور نثری، دونوں کو سامنے رکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ معیار کے اعتبار سے یہ ایک قدم اور آگے بڑھا ہے۔ افسانے کا سیکشن اور بار بھی کافی وقیع ہے۔ آپ نے تو ساری دنیا سے افسانہ نگار اکٹھا کر لئے ہیں جن میں انڈیا اور پاکستان کے علاوہ امریکہ، کینیڈا اور یورپ کے لکھنے والے شامل ہیں۔ اس کا رن یہ ہوا ہے کہ موضوعات اور اسلوب کا تنوع سامنے آیا ہے۔ 'ڈھکن' کے افسانہ نگار کا نام (اقبال حسن خان) دیکھ کر لگا کہ یہ آپ کا افسانہ ہے، مگر تصویر پر نظر پڑی تو پتہ چلا کہ یہ تو اپنے یہاں کے اقبال حسن خان ہی۔ افسانہ اچھا لگا۔ افسانے کے مرکزی کردار رفیق کے والد کے اردو اور پنجابی کے لہجے ذریعے اٹک (جو پنجاب اور خیبر پختون خواہ کی سرحد پر واقع ہے) کے دیہی علاقے کے ثقافتی رنگ کو بڑی خوبصورتی سے اجاگر کیا گیا ہے۔ قاضی طاہر حیدر کے افسانے میں بھی پنجاب کا کلچر منعکس ہوا ہے۔ ابرار مجیب کے 'افواہ' میں ستر اور اسی کے دہائی کے جدید افسانہ نگاروں کا اپروچ اور تکنیک نمایاں ہے۔ اس کے تمثیلی اور اشاراتی اسلوب، اور فضا سازی سے افسانے میں دلچسپی پیدا ہوتی ہے اور تاثر میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ طلعت زہرا بھی اردو افسانے کا جانا پہچانا نام ہیں۔ انہوں اپنے افسانہ 'بوڑھا اور سمندر' میں مرکزی کردار کی زندگی کے سچ کو بڑے فنکارانہ انداز میں Unsaid کے ذریعہ بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ حبیب حق ایک پختہ کار افسانہ نگار ہیں۔ 'جسے میر کہتے ہیں صاحبو!' میں ان کے بیانیہ کا جادو کسی بھی لمحے قاری پر سے افسانے کی گرفت ڈھیلی نہیں ہونے دیتا۔ مضامین میں اب تک صرف نسیم سید کی تحریر پڑھ سکا ہوں۔ کینیڈا میں مقیم پاکستان کی وہ ایک ممتاز شاعرہ ہیں۔ بین الثقافتی پس منظر میں کہی گئی، ان کی نظمیں تازہ کاری کے

رنگ بکھیرتی ہیں۔اپنے مضمون میں انھوں نے پیغام آفاقی کے ناول 'مکان' کا تجزیہ کرتے ہوئے ناول کی کئی تہیں کھولی ہیں۔نظموں میں ثروت زہرہ کی 'بے پروں کی تتلی' اور پرویز شہریار کی نظم 'بی بھی حوا کے نام' بطور خاص پسند آئیں۔

اب ذرا اپنی نظم 'آنگن' کے بارے میں۔میری نظم میں آٹھویں لائن کے بعد ایک ٹکڑا کمپوز ہونے سے رہ گیا ہے۔نظم کے حصے کو اس طرح ہونا چاہئے تھا۔

اب کہاں کا وہ ملنا جلنا ہے
اور کہاں شام کی ملاقاتیں
ہے غنیمت
کہ اب بھی آنگن ہیں
آسماں اپنے ساتھ ہوتا ہے

صبا اکرام (کراچی)

● عظیم شاعر اور جدیدیت کے پیش رو شاد عارفی کی پچاسویں برسی ۸/فروری کو ہے۔اُن کو یاد کرنے کی غرض سے ایک مضمون بھیج رہا ہوں۔مہربانی کر کے اسے شایع کرنے کی زحمت فرمائیں۔ مظفر حنفی (نئی دہلی)

● 'ثالث' کے لئے زبانی مبارک باد تو دے ہی چکا ہوں۔اب دونوں شمارے دیکھ کر محسوس ہوا کہ آپ کو جتنی مبارکباد دی جائے کم ہے۔خالص ادبی رسالہ نکالنا ہمیشہ سے گھاٹے کا سودا رہا ہے۔آج تو یہ گھاٹا کئی گنا بڑھ گیا ہے۔ایسے میں رسالہ نکالنے کی ہمت کرنا، بس آپ جیسے جیالوں کا کام ہے۔

'ثالث' پر جو محنت آپ کر رہے ہیں وہ اس کے ہر ورق سے ظاہر ہے۔مجھے لگتا ہے کہ آپ کو کچھ مخلص ساتھی بھی مل گئے ہیں، ورنہ تنہا یوں کام کرنا آسان نہیں ہے۔* آپ نے رسالے کے فروغ کے لئے جدید ٹیکنالوجی کا بھی خوب استعمال کیا ہے۔گھر بیٹھے آپ کو اشاعت کے لئے مواد مل جاتا ہے۔** مگر اس طرح حاصل شدہ چیزوں کے انتخاب میں کچھ اور محتاط ہونے کی ضرورت ہے۔رسالے کو نئی نسل کا ترجمان بنا دیجئے۔***میں آپ کو ایسا ایڈیٹر دیکھنا چاہتا ہوں جس کی نگارشات پر گہری اور کڑی نگاہیں رہتی ہیں۔جو ضرورت پڑنے پر نثر و نظم میں تفہیم کرنے کا مجاز بھی ہوتا ہے اور جس کی آرا کے سامنے لکھنے والے کا سر خم ہو جاتا ہے۔دوسروں کو نیچا دکھانے اور ذاتی جذبات کے لئے اپنے صفحات کو آلودہ مت ہونے دیجئے۔کچھ لوگ نئے رسالوں کو اپنے ہی فروغ

کے لئے استعمال کرنے کی کوشش کرنے لگتے ہیں۔ایسے لوگوں سے ہوشیار رہئے۔

خوش رہئے اور خوب سے خوب تر کی طرف بڑھتے رہئے۔ عبدالصمد (پٹنہ)

*رسالے کے مدیر ثالث آفاق صالح اور مدیر اعلی اقبال حسن آزاد ہیں۔اس ٹیم میں کوئی تیسرا شامل نہیں ہے۔

** گھر بیٹھے تو ہر مدیر کو اشاعت کے لئے مواد مل جاتا ہے۔

***رسالے میں زیادہ تر نئی نسل کی ہی نگارشات شامل ہوتی ہیں۔ویسے یہ رسالہ 'زندہ اور متحرک ادب کا ترجمان' ہے (ادارہ)

● ثالث کا دوسرا شمارہ میرے سامنے ہے۔دیدہ زیب سرورق، تفصیلی اداریہ اور بہت کچھ۔آپ کی شکر گزار ہوں کہ آپ نے ثالث کی رسائی میرے لئے ممکن بنایا۔جیسا کہا گیا بالکل ویسا ہی زندہ اور محترک ادب کا ترجمان ہے ثالث۔اور کیوں نہ ہو کہ ایک ادیب کی ترتیب اور کاوشوں کی تخلیق ہے۔دور حاضر میں جب اردو ادب بالخصوص نثر نگاری زوال کا شکار ہے اور افسانہ شاید آخری سانسوں کے ساتھ کسی مسیحا کا منتظر ہے آزاد سر آپ نے اپنے کتابی سلسلے میں افسانے کی پذیرائی اس طرح کی کہ دنیا کے ہر گوشے سے تخلیق کاروں کی تخالیق کو دامن ثالث میں جگہ دی جس سے نہ صرف نو وارد افسانہ نگاروں کی حوصلہ افزائی ہوئی بلکہ اپنی نوعیت کا پہلا کتابی سلسلہ بن گیا ثالث۔ایک ایسا گلدستہ جس میں ہر ملک کا پھول سجا ہے مشمولات میں مہمان اداریہ، متن اور تجربہ، افسانوی ادب، متاثر کن رہے۔افسانوں میں 'ڈھکنے'، 'آٹھواں سمندر'، 'برزخ' اور 'کھیل' مجھے پسند آئے۔خاکہ رسیلے کٹیلے خوبصورت ہے۔تبصرے اور شاعری ماشاءاللہ.....سب کچھ بہت خوب۔خدا ثالث کو افق کی اونچائیوں تک لے کر جائے اور جس طرح اس کی کرنوں کی روشنی ادبی دنیا میں پھیل رہی ہے اسے قائم و دائم رکھے، (آمین)۔آپ کو اس خوبصورت کاوش پر بہت بہت مبارک باد۔اور میری نظم کو ثالث میں شایع کرنے کے لئے شکریہ۔ نوشی قیصر (لندن)

● 'ثالث' کا دوسرا شمارہ پہلے شمارہ کی طرح نئی آب و تاب کے ساتھ باصرہ نواز ہوا۔دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔سچ مانئے پہلی ساعت میں ہی اردو ادب کا عالمی جریدہ لگا۔جس میں گلشن اردو ادب کے نایاب اور کمیاب پھول کھلے نظر آئے۔تمام مشمولات ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔افسانوی حصے کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ ہمارا اردو نثر بھی عالمی نثری ادب سے آنکھیں چار کر سکتا ہے۔۲۲۴ صفحات کے اردو سہ ماہی رسالہ کے ذریعہ آپ نے اردو ادب کے سارے اصناف سے قاری کو

روشناس کرادیا۔افسانوں میں 'ڈھکنے' سے لے کر 'انجام کار' تک بہت خوب ہیں ۔اقبال حسن خاں کا افسانہ 'ڈھکنے' اورابرار مجیب صاحب کا 'افواہ' بہت پسند آیا۔م۔ص۔ایمن کا ناولٹ ''شریف زادی'' کے کیا کہنے۔بظاہر تو معمولی سی بات پر کہانی کی شروعات ہوتی ہےمگر اسکا بیانیہ اورTreatment اتنا اچھاہے کہ قاری کو باندھ کررکھتا ہے۔ناولٹ کا اختتام اتنا اچھا ہے کہ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا۔ پاکستان کے موجودہ معاشرہ کی بہترین عکاسی دیکھنے کوملی۔آپ جیسا ادب نواز ہی ادبی سمندر سے ایسا گوہر کھوج کرنکال سکتا ہے۔دعا کرتا ہوں کہ یہ رسالہ اسی طرح زندہ اورمتحرک ادب کا ترجمان بنارہے۔آمین ثم آمین۔

نیازاختر (جمشید پور)

- حسبِ حکم دوغزلیں حاضر ہیں پسند خاطر ہوں تو ثالث کے آئندہ شمارے میں شامل کرکے ممنون فرمائیں۔غزلیں بالکل تازہ ہیں۔

سلیم انصاری (جبلپور)

- 'ثالث' کا دوسرا شمارہ دستیاب ہوا۔تم نے اس گلدستے کو رنگ برنگے پھولوں سے خوب سجایا ہے۔اس کی خوشبو سے ہم لوگ لطف اندوز ہورہے ہیں۔خدا کرے اس رسالے کی عمر دراز ہو ۔مجھےاس بات کی بہت خوشی ہے کہ ادب کی جس صنف صنف سے میری وابستگی ہےاس پرتم نے کافی توجہ دی ہے اور رسالے میں چنندہ افسانے شایع کئے ہیں۔افسانوں کے ساتھ مضامین کا حصہ بھی کافی وقیع ہے۔رسالے کے سلسلے میں قارئین کی رائے جان کربھی بہت اچھا لگا۔اتنا خوبصورت رسالہ نکالنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔تم نے بڑی محنت کی اور کامیاب رہے۔میری جانب سے دلی مبارکباد۔

نوشابہ خاتون (پٹنہ)

- سب سے پہلے اس خوبصورت اورخوبیوں سے بھرپور مجلّہ کے اجرا پر دلی مبارکباد۔دوسو چوبیس صفحات پر مشتمل 'سہ ماہی اردو' ثالث' کا پہلا شمارہ باصرہ نواز ہوا۔الحمدللہ ولہ الشکر!

نہایت دل کش تشکیل کے ساتھ، عمدہ ادب پاروں سے آراستہ یہ سہ ماہی رسالہ بین الاقوامی حیثیت اورعالمی اہل قلم کی بامعنی نگارشات کی زینت لے کراردو دنیا میں بڑے اہتمام اورروشن امکانات کے ساتھ شامل ہوا ہے۔یہ مہمان اداریہ،حمد،نعت،افسانے،غیرملکی ادب،ناول کا ایک باب،تنقید،غزلیں،نظمیں اور ایک جامع شخصیت کا گوشہ......کی شاہ سرخیوں سے مزین وقیع گل دستہ ہے۔اس کی اشاعتسے کاروان اردوکومزید زادراہ کی فراہمی کا راستہ استوار ہوگا۔

یہ رسالہ ایک خوش آیند پیغام ہے کہ اردو اپنے بل بوتے پرمہر ومروت کی خوشبو پھیلاتی رہی اور یہ سلسلہ قائم رہے گا۔

محمد شفیع الرحمٰن شفیع (پٹنہ)

وفیات

گیبریل گارسیامارکیز

لاطینی امریکہ کے ہسپانوی زبان کے سب سے زیادہ معروف ناول نگار گیبریل گارسیا مارکیز (Gabriel García Marquez) کا جمعرات ۱۷/اپریل ۲۰۱۴ءکو ۸۷/سال کی عمر میں انتقال ہو گیا۔اُن کی پیدائش ۱۹۲۷ء میں کولمبیا میں ہوئی تھی اور وہ گذشتہ تین دہائیوں سے میکسیکو میں قیام پذیر تھے۔اُن کی عرفیت "Gabo," تھی۔وہ "Love in the Time of Cholera"، "One Hundred Years of Solitude"، "Chronicle of a Death Foretold,"، "Autumn of the Patriarch'' کے تخلیق کار ہیں۔1967 میں لکھے جانے والے ناول "One Hundred Years of Solitude" کی پوری دنیا میں پچیس زبانوں میں پچاس ملین کاپیاں فروخت ہوئیں۔ان کی ناولوں میں طلسماتی اور واہماتی حقیقت پسندی بھری ہوئی ہے۔ان کو ۱۹۸۲ء میں ادب کا نوبل انعام ملاتھا۔

☆☆☆

خوشونت سنگھ:

ہندوستانی صحافت کی سب سے بزرگ ہستی، جانے مانے ادیب اور عاشق اردو خوشونت سنگھ ۹۹ سال کی عمر میں اس جہان فانی سے کوچ کر گئے ۔ملک کے مشہور لکھنے والوں میں سے ایک خوشونت سنگھ کی پیدائش پاکستان کے پنجاب میں ہوئی تھی۔ وہ 'السٹریٹیڈ ویکلی آف انڈیا'، 'نیشنل ہیرالڈ' اور 'ہندوستان ٹائمز، کے ایڈیٹر کی ذمہ داریاں نبھا چکے تھے۔ان کی کتاب 'ٹرین ٹو پاکستان' بہت مشہور ہوئی۔وہ ۱۹۸۰ء سے ۱۹۸۶ء تک پارلیمنٹ کے رکن بھی رہے ہیں. ۱۹۷۴ء میں ہی انہیں پدم بھوشن سے بھی نوازا گیا

تھا۔لیکن ۱۹۸۴ء میں امرتسر کے 'گولڈن ٹیمپل' میں مرکزی حکومت کی کارروائی کی مخالفت میں انھوں نے یہ ایوارڈ لوٹا دیا تھا۔ ۲۰۰۷ء میں انھیں پدم وبھوشن ایوارڈ سے نوازا گیا۔

☆☆☆

علی امام نقوی:

اُردو کے معروف افسانہ نگار علی امام نقوی کا ۳۱/ مارچ دوپہر تقریباً ساڑھے بارہ بجے ممبئی میں انتقال ہوگیا۔مرحوم گزشتہ کچھ عرصے سے علیل تھے۔مرحوم کے پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ دو بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں۔علی امام نقوی کا آبائی وطن اُتر پریش کے ضلع میرٹھ کا قصبہ عبداللہ پور تھا۔اُن کے والد نوجوانی میں ہی ممبئی چلے گئے تھے، لہٰذا علی امام نقوی کی تعلیم ممبئی میں ہی ہوئی۔علی امام نقوی نے ستّر کی دہائی میں افسانہ نگاری شروع کی اور اُن کا پہلا افسانوی مجموعہ 'نئے مکان کی دیمک' ۱۹۸۰ء میں قلم پبلی کیشن، ممبئی سے شائع ہوا تھا۔اُن کا دوسرا افسانوی مجموعہ 'مباہلہ' ۱۹۸۸ء میں دہلی کے سیمانت پرکاشن سے شائع ہوا۔علی امام نے ترقی پسند تحریک کے عروج کے زمانے میں کئی بہترین کہانیاں اُردو ادب کو دیں، جن میں اُن کی ایک کہانی 'بتیس دانتوں میں گھری زبان' اور ایک دوسری کہانی 'گدھ' کافی مقبول ہوئیں۔ ۱۹۹۱ء میں علی امام نقوی کا پہلا ناول 'تین بتی کے راما' منظر عام پر آیا۔اُن کا تیسرا افسانوی مجموعہ 'گھٹتے بڑھتے سائے' ۱۹۹۳ء میں تخلیق کار پبلشرز، دہلی سے شائع ہوا، اور اس کے بعد اُن کا چوتھا افسانوی مجموعہ 'موسم عذابوں کا' ۱۹۹۸ء میں اِسی ادارے سے شائع ہوا۔علی امام نقوی کا دوسرا ایک اہم ناول 'بساط' ۲۰۰۰ء میں اور پانچواں افسانوی مجموعہ 'کہی اَن کہی' بھی تخلیق کار پبلشرز، دہلی سے شائع ہوئے۔

صغریٰ مہدی:

اردو کی مشہور ادیبہ پروفیسر صغریٰ مہدی نے بھی اس عالم رنگ و بو کو خیر آباد کہہ دیا۔مرحومہ کی عمر ۷۳ برس تھی۔انھوں نے مجرد زندگی گذاری۔وہ ۸/ اگست ۱۹۳۷ء کو بھوپال میں پیدا ہوئیں۔ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے بعد جامعہ سے بی ایڈ، علی گڈھ سے ایم فل اور جامعہ ملیہ اسلامیہ سے پی ایچ ڈی مکمل کی۔اس کے بعد وہ جامعہ میں ہی درس و تدریس سے وابستہ ہوگئیں۔ان کے کئی افسانوی مجموعے اور ناول شایع ہوکر مقبول ہوئے جن میں پتھر کا شہزادہ، جو میرے وہ راجہ کے نہیں، پہچان، درد آشنا ہی نہیں، پا بہ جولاں، دھند، پُروائی، اکیلا، راگ بھوپالی، جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو، شامل ہیں۔ان کے علاوہ کئی تنقیدی نگارشات اور سفرنامے بھی منظر عام پر آچکے ہیں اور ہندی زبان میں بھی ایک کتاب شایع ہوئی ہے۔

☆☆☆

سید شکیل دسنوی:

اردو کے مشہور شاعر سید شکیل دسنوی کا ۳/ اپریل ۲۰۱۴ء کو کٹک (اُڑیسہ) میں طویل علالت کے بعد ۷۳/ سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ان کی ولادت بہار شریف میں ۲۱/ فروری ۱۹۴۱ء کو ہوئی۔ان کے والد مرحوم سید منظر حسن دسنوی بھی ایک معتبر شاعر، صاحب طرز ادیب اور افسانہ نگار تھے۔سید شکیل دسنوی کے چھشعری مجموعے شایع ہو چکے ہیں جن کے نام یوں ہیں.....'زندگی اے زندگی' (۱۹۸۱ء)، 'تنہا تنہا' (۱۹۸۹ء)، 'کتنی حقیقت کتنا خواب (۲۰۰۵ء)، 'دل آشنا (۲۰۰۶ء) 'طفلی ترانے (بچوں کے لئے نظمیں ۲۰۱۰ء) اور 'سانجھ بھئی چودیس' (خسرو رنگ شاعری)۔علاوہ ازیں تحقیق و تنقید پر بھی ان کی دو کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں مثلاً 'بازدید' (۲۰۱۱ء) اور 'انداز بیاں اپنا' (۲۰۱۱ء)۔

☆☆☆

عبید قمر:

معروف افسانہ نگار عبید قمر کا پٹنہ میں انتقال ہوگیا۔عبید قمر کا اصل نام عبدالکریم تھا۔ان کی پیدائش ۴/ ستمبر ۱۹۴۸ء کو ہوئی تھی۔بی ایس سی اور ادیب کامل کے بعد میڈیکل ریپرزنٹیٹو کی حیثیت سے اپنی خدمات انجام دینے والے عبید قمر صاحب ۱۹۶۸ء سے افسانے لکھ رہے تھے۔اب تک ان کے متعدد افسانے ملک کے مختلف رسائل میں شائع ہوکر ادبی حلقہ میں اپنی پہچان تسلیم کروا چکے تھے۔ان کے دو افسانوی مجموعے 'آخری کش' ۱۹۸۲ء اور 'ننگی آوازیں' ۱۹۸۸ء میں شائع ہو چکے ہیں۔عبید قمر نے افسانوں کے علاوہ بچوں کے لئے کہانیاں اور چند انشائیے بھی لکھے ہیں۔

ادارہ گذر جانے والوں کے غم میں سوگوار ہے اور پسماندگان کو تعزیت پیش کرتا ہے۔

◀◀ ● ▶▶

اردو پڑھئے، اردو لکھئے، اردو بولئے